بسم الله الرحمن الرحيم

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ
لِلْإِسْلَٰمِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا
كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجْسَ
عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهَٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ
مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

ترجمہ:

پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار کر دیتا ہے جیسے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو، وہ اسی طرح بے ایمانوں پر ان کی کثافت کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور یہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے آیات کو مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔

(سورہ انعام: آیات ۱۲۵، ۱۲۶)

اسلامی علوم ومعارف اور علمی وثقافتی افکار وعقائد کا ترجمان

شمارہ:- ۲۱۱،۲۱۰- اکتوبر تا مارچ۲۰۰۹ء

خصوصی شمارہ

عرفان وتصوف اسلامی در ہند

جلد دوّم

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱
فون : ۳۴، ۳۳، ۲۳۳۸۳۲۳۲، فیکس : ۲۳۳۸۷۵۴۷
newdelhi@icro.ir
http://newdelhi.icro.ir

راہِ اسلام

شمارہ:- ۲۱۱،۲۱۰- اکتوبر تا مارچ ۲۰۰۹ء

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر سیّد عبدالحمید ضیائی

ایڈیٹر: پروفیسر سیّد اختر مہدی رضوی

مشاورین علمی

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی، ڈاکٹر اوصاف علی، پروفیسر شاہ محمد وسیم
ڈاکٹر عبدالودود اظہر دہلوی، پروفیسر سید عزیز الدین حسین ہمدانی
پروفیسر سید عراق رضا زیدی، پروفیسر سیّد علی محمد نقوی

مدیر اجرائی : علی ظہیر نقوی

تزئین جلد : عائشہ فوزیہ

صفحہ آرائی و کمپوزنگ : محمد یاسین

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مضمون کیلئے مقالہ نگار خود ذمہ دار ہے۔
مقالہ نویس کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔
راہ اسلام مقالات و مضامین کے انتخاب و اصلاح و ایڈیٹنگ اشاعت کے سلسلے میں پوری طرح آزاد ہے۔
اور اس سلسلے میں ایڈیٹوریل بورڈ کا فیصلہ آخری ہوگا۔
اشاعت کی غرض سے ارسال شدہ مقالہ کا خوشخط ہونا لازمی ہے۔عبارت کاغذ کے ایک طرف ہی لکھی جائے
اور کاغذ A-4 سائز کا ہو تو بہتر ہے۔
صرف غیر مطبوعہ مقالات ہی ارسال کئے جائیں۔
تحقیقی مقالات کی آمادگی میں جن مآخذ و مدارک کا استعمال کیا گیا ہو۔ ان کا ذکر لازمی ہے۔
مقالہ کے ساتھ اس کا خلاصہ بھی ضرور ارسال کیا جائے۔
راہ اسلام میں شائع شدہ مقالات کی نقل یا ان کے ترجمہ و اقتباس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے
بشرطیکہ مآخذ کا ذکر کر دیا جائے۔

پریس : الفا آرٹ، نوئیڈا، یو۔پی

شمارہ:- ۲۱۱،۲۱۰- اکتوبر تا مارچ۲۰۰۹ء

فہرست

اداریہ	**ڈاکٹر سید عبدالحمید ضیائی**	۷
صوفیۂ ہند کا ایکنا در تذکرہ....	**پروفیسر خلیق احمد نظامی**	۱۲
تصوف : تاریخ وتہذیب اور رسم وحقیقت	**خواجہ حسن ثانی نظامی**	۱۷
عارفان استاد شہید مطہری کی نظر میں	ڈاکٹر سید عبدالحمید ضیائی	۵۳
امام الاولیاء پیران پیر حضرت علیؑ	ڈاکٹر سید لیاقت حسین معینی	۶۲
ملفوظات ومنقولات حضرت علیؑ	پروفیسر عراق رضا زیدی	۶۸
تصوف کی تفہیم میں چند اہم کتابیں	پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی	۷۸
شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی...	پروفیسر زبیر احمد فاروقی	۱۰۰
ہندوستان میں ''ہمدان'' کے چند صوفیائے کرام...	ڈاکٹر شاہد اقبال	۱۰۵
مکتوبات اشرفی کی اہمیت	ڈاکٹر محمد موصوف احمد اشرفی	۱۱۲
توحید، نظریہ صحو اور معرفت الٰہی....	ضیاء الحسن فاروقی	۱۲۲
حضرت بابا فرید الدین گنج شکر....	حافظ شبیب انور علوی	۱۴۰
عرفان علامہ طباطبائی کی نظر میں	ڈاکٹر سید عبدالحمید ضیائی	۱۴۷
عرفان وتصوف قرآن اور حدیث...	نسرین توکلی	۱۵۶
منبع ولایت سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ	ڈاکٹر عمر کمال الدین	۱۷۳۱۱
صوفیائے کرام کے سماجی کردار کی نشاندہی	سید جمال الدین	۱۸۰
تاریخ فرشتہ میں مذکورہ مشائخ کے احوال	ڈاکٹر نکہت فاطمہ	۱۹۱
مثنوی مولانا روم میں حضرت سلیمان کا ذکر...	ڈاکٹر سید کلیم اصغر	۲۰۶

عرفان وتصوف -انحراف یا اعتدال	مہدی باقر معراج	۲۱۸
امت اسلامیہ کے نام آیت اللہ خامنہ ای کا پیغام		۲۲۵
دنیا اسلام محمدی کی پیاسی ہے	پروفیسر سید اختر مہدی	۲۳۴
کتابوں کا تعارف : نقد وتبصرہ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۲۴۲
اخبار وجہان اسلام		۲۵۴

اداریــــــــہ:

عصری تناظر میں:

عرفان وتصوف اسلامی

موجودہ صدی کوعلم ودانش کی فراوانی اور انسانی شعور کی بیداری وآگہی کی صدی کا نام دیا گیا ہے اور اطلاعاتی وسائل وابلاغ عامہ کی عدیم المثال ترقی کی وجہ سے دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے جس کا فطری نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ عالمی انسانی برادری کے درمیان باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے علمی تجربات سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے گرانقدر انسانی اقدار کی ترویج وترقی کی راہ میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہوئے اس دنیا کو امن وسلامتی کے گہوارہ میں تبدیل کردیا جاتا، عالمی انسانی برادری کوحقیقی آزادی اور خوشحالی کے ماحول میں زندگی بسرکرنے کا موقع فراہم ہوجاتا اورتہذیبی، لسانی اورقومی رنگارنگی کے باوجود عالمی ماحول میں سانس لینے والا ہرایک انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہوجاتا کہ وہ عالمی انسانی معاشرہ کا اٹوٹ حصہ،کرشمۂ الٰہی کا بہترین نمونہ اور مالک وخالق کائنات کی شناخت کا بہترین وسیلہ ہے۔

جی ہاں! یہ انسان ہی تو ہے جس کے لئے خداوند عالم نے زمین کا فرش اور آسمان کا شامیانہ بنایا اور دنیا کی تمام چیزیں اور انواع واقسام کی نعمتیں اسی کے لئے خلق کیں اور اس کو راہ مستقیم پر باقی رکھنے کے لئے آدم سے خاتم تک ہزاروں انبیاء اورختم المرسلین کے بعد آئمہ واولیاء کالامتناہی سلسلہ قائم کیا اور بنی نوع انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لئے مقدس الٰہی کتب اور صحیفے بھی نازل فرمائے۔ درحقیقت آسمانی کتابوں کے نازل ہونے کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کوگمراہی کے گڑھے سے نکال کر راہ ہدایت کی طرف لے جانا تھا اور اس مقصد میں کامیابی کے لئے انسان کی مکمل شناخت لازمی ہے۔ انسان شناسی کے بنیادی مرحلے سے گزرنے کے بعدخود شناسی کی منزل آتی ہے اورخود شناسی کے بعد خداشناسی کی منزل آتی ہے جس کوعرفان ومعرفت کے نام سے تعبیر کیاجاتا ہے اور جو وحدانیت کا درجہ کمال ہے۔

یہ ایک ناقابل تردیدحقیقت ہے کہ انسان خداوند عالم کی باعظمت وصاحب فضیلت مخلوق ہے اور

اس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ حامل روح الٰہی ہے اور خداوند عالم نے قرآنی ارشاد'' نفخت فيه من روحی'' کے ذریعہ اس بات کی تصدیق بھی کردی ہے کہ آدم کے پتلے نے روح خداوندی کی بدولت ہی آدمیت کا رنگ وروپ اختیار کیا تھا اور دنیا کا ہر انسان صرف اس وجہ سے لائق احترام ہے کہ وہ آدم کی اولاد اور روح خداوندی کا حامل ہے اور آیۂ مبارکہ'' لقد کرّمنا بنی اٰدم'' کی بنیاد پر مکمل وثوق واعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انسان صاحب عظمت وفضیلت ہے اور مولانا روم درج ذیل بیت کے ذریعہ ایسے ہی انسان کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

جی ہاں ! آج سے تقریباً ۸۰۰ برس قبل مولانا جلال الدین رومی نے جس انسان کی تلاش شروع کی تھی اور جس کی آفاقیت ویگانگت کا اعلانیہ اعتراف کیا تھا اس کی مکمل شناخت پیش کرتے ہوئے دوسری جگہ خود فرماتے ہیں۔

چہ تدبیر ای مسلمانان کہ من خود را نہ می دانم
نہ ترسا، نہ یہودم من، نہ گبرم، نہ مسلمانم
نہ شرقیم، نہ غربیم، نہ برّیم، نہ بحریم
نہ از ارکان طبیعیم، نہ از افلاک گردانم
نہ از خاکم، نہ از آبم، نہ از بادم، نہ از آتش
نہ از عرشم، نہ از فرشم، از نہ کونم، نہ از کانم
نہ از ھندم، نہ از چینم، نہ از بلغار وسقسینم
نہ از ملک عراقینم ، نہ از خاک خراسانم
نہ از دنیی، نہ از عقبی ، نہ از جنت نہ از دوزخ
نہ از آدم، نہ از حوا،نہ از فردوس و رضوانم
مکانم لا مکان باشد، نشانم بی نشان باشد
نہ تن باشد ، نہ جان باشد، کہ من از جان جانانم

دوئی راچون برون کردم ، دو عالم را یکی دیدم
یکی بینم، یکی جویم، یکی دانم ، یکی خوانم

واضح رہے کہ انسان حقیقی کی تلاش میں سرگرداں یہ مرد عارف کوئی عام آدمی نہیں بلکہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کے منظوم کلام مثنوی معنوی کو فارسی زبان وادب میں قرآن کا درجہ حاصل رہا ہے اور جس کا عقیدہ وایمان یہ رہا ہے کہ جس دل میں غیر اللہ کا وجود ہو اس میں عشق خداوندی کا گزر ممکن نہیں ہے اور جو قلب عشق الٰہی سے معمور ہو اس کی طرف قرآنی آیات یوں اشارہ کرتی ہیں۔ "لقد کرّمنا بنی آدم"۔

اولاد آدم کو عظمت وفضیلت سے سرفراز کرنے والے خدا نے اپنے پسندیدہ دین ''اسلام'' کے ذریعہ بنی نوع انسان کو چودہ سو برس پہلے ہی ان حقائق کی طرف متوجہ کردیا تھا اور بیانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ اسلام عوام الناس کا مذہب ہے۔اس کی مقدس کتاب اور اس کے پیغمبر کا فقط مسلمانوں سے نہیں بلکہ دونوں کا تعلق پوری عالمی انسانی برادری سے ہے۔ یہ جغرافیائی حدود کا قائل نہیں ہے۔ رنگ ونسل ، زبان وبیان ریاست وغربت کو اس دین میں سبب امتیاز وفضیلت قرار نہیں دیا گیا بلکہ تقویٰ وپرہیزگاری کو فضیلت کی کسوٹی کہا گیا ہے ۔اس دین میں مرد وعورت کو ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور سماجی اعتبار سے مرد کے بغیر عورت اور عورت کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری رہا کرتی ہے ۔ دیگر مذاہب اور مکاتب فکر کے برعکس اسلام نے انسان کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیت سے ذمہ دار قرار دیا ہے اور مال ودولت کو زندگی بسر کرنے کا ذریعہ تو تسلیم کیا ہے لیکن اسے مقصد حیات کبھی نہیں سمجھا اور ''اکمل النّاس عقلاً احسنهم خلقاً'' جیسے منتخب اصولوں کے ذریعہ حسن اخلاق کی قدر وقیمت کی طرف متوجہ کیا اور ''لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اُسوۃ حسنه'' کے ذریعہ پیغمبر اکرم کی ذات والا صفات کو نمونۂ عمل قرار دیتے ہوئے ان کی سنت وسیرت کی پیروی کو ماحصل حیات قرار دیا۔

تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ پیغمبر کی حیات طیبہ کے دوران اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مہلک سازشوں کا جال پھیلا نے والی اسلام دشمن طاقتیں ان کی رحلت کے بعد اپنی سازشانہ حرکتوں سے باز نہیں آئیں بلکہ فرقہ بندی اور تفرقہ سازی کے

ذریعہ اسلام محمدیؐ کو مختلف جماعتوں کے درمیان تقسیم کردیا تاکہ اصل اسلام کی شناخت مشکل ہوجائے۔ اس سازش کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خلافت الٰہی ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور نام نہاد مسلم حکمرانوں نے اپنے اقتدار کی حفاظت اور اپنی ذاتی خواہش کی تکمیل کی خاطر جو اعمال انجام دئے وہ عوام الناس کی نظر میں اسلامی اعمال بن گئے اور حکمراں جماعت کی بداعمالیوں کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حقیقی اسلام محمدیؐ کی تبلیغ واشاعت کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کردی گئیں اور ننگی تلواروں کے سایہ میں حقیقی اسلامی تعلیمات سے انحراف اور بے راہ روی کا بازار گرم ہوگیا۔

ایسے ظالمانہ اسلام دشمن ماحول میں عشق الٰہی سے سرشار اور خداشناس افراد نے اپنے مخصوص انداز میں محمدؐ وآل محمدؑ علیہم السلام کے ارشادات پر مبنی اسلامی تعلیمات اور مکتب اہلبیت کی تبلیغ واشاعت کا کام شروع کردیا اور دھیرے دھیرے عرفاء وصوفیاء کی اس جماعت نے ایک عظیم الشان تحریک کی شکل اختیار کرلی جس کو صوفی تحریک کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اس تحریک سے وابستہ صوفی بزرگوں نے اپنے الٰہی اور انسانی مشن کی کامیابی کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کیا۔ بات صرف اندلس اورایران وعربستان کی جغرافیائی حدود تک محدود نہ رہی بلکہ چست وکاک وشوش وہمدان سے عظیم المرتبت عرفاء وصوفیاء سرزمین ہندوستان میں داخل ہوئے اور اسلام نے انسان دوستی اور بشر نوازی کا جو پیغام دنیا والوں کے سامنے پیش کیا تھا اور جس کو نام نہاد مسلمان بادشاہوں کی ظالمانہ راہ وروش کے ذریعہ دبادیا گیا تھا، اسے دوبارہ اور پہلے سے زیادہ موثر انداز میں لوگوں تک پہنچانا شروع کردیا اور لوگ حق وصداقت پر مبنی اسلامی تعلیمات، الٰہی احکامات اور مکتب اہلبیت کے گرویدہ ہونے لگے۔ عرفاء صوفیاء کے ذریعہ اسلام محمدی کی غیر معمولی مقبولیت کا یہ منظر اسلام دشمن طاقتوں کو اچھا نہ لگا چنانچہ اس تحریک کی نابودی کے لئے صوفی نما افراد کی ٹولیاں حرکت میں آگئیں اور شریعت وطریقت اور اسلامی وشرعی اعمال کی پیروی وعدم پیروی جیسے خود ساختہ معیاروں کے ذریعہ عرفان وتصوف اسلامی کا تجزیہ کیا جانے لگا۔

واضح رہے کہ علم وآگہی اور روشنی وبیداری کی موجودہ صدی کے دوران مفروضہ عقائد میں ظاہری تڑک بھڑک تو ہوسکتی ہے لیکن دستاویزی شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے گا تو صاف ظاہر ہوجائے گا کہ

اسلام نے انسان شناسی، خود شناسی اور خداشناسی کا جو درس دیا تھا عرفاء وصوفیاء گذشتہ صدیوں کے دوران ان تعلیمات کومختلف انداز سے دنیائے بشریت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سر دست انسانی دنیا نابودی کے کگار پر کھڑی ہوئی ہے اور مادیت زدہ ماحول میں جبکہ اخلاقی قدریں نابود ہوتی چلی جارہی ہیں، عرفاوصوفیا کی تعلیمات کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ نابودی کے بھنور سے نجات کا واحد راستہ انسان دوستی اور عالمی انسانی برادری کا احترام ہے اور احترام آدمیت ہی اسلام اور راہ اسلام ہے۔

☆☆☆

صوفیۂ ہند کا ایک نادر تذکرہ

''معارج الولایت''

پروفیسر خلیق احمد نظامی

ہندوستان کے صوفیہ اور مشائخ کے تذکروں کی جو روایت سید محمد کرمانی المعروف بہ میر خورد نے قائم کی تھی ، اس کو شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کی محدّثانہ بصیرت اور رجال اور اسناد کے تحقیقی پیمانوں نے ایک واضح اور متعیّن شکل دیدی۔ ان کے بعد لعل بیگ ، محمد غوثی ، الہدیا چشتی ، بدر الدین سرہندی، علی اکبر اردستانی ، عبد الرحمٰن چشتی وغیرہ نے صوفیہ کے تذکرے مرتب کیے، گو کہ عقیدت مندی کہیں کہیں تحقیقی طلب کو شکست دیتی رہی، لیکن پھر بھی تلاش اور جستجو نے ان تذکروں کو تاریخ کا ایک اہم مآخذ بنادیا اور تاریخ کے بدلتے ہوئے نظریات کے پیش نظر ، جس میں توجہ دربار سے زیادہ عوامی زندگی کی طرف ہے، ان کی افادیت اور مقبولیت میں اضافہ ہوگیا۔ شیخ معین الدین عبد اللہ الخویشگی کی ''معارج الولایت'' اس لٹریچر میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اور اس مقالہ میں اسی کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ یہ تذکرہ ہندوستان کے کم وبیش ۵۰۰ مشائخ کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ اس کی تکمیل چہار شنبہ رجب ۱۰۹۴ھ (مطابق ۱۶۸۴ء) کو اورنگ آباد دکن میں ہوئی۔

ہندوستان کی تاریخ میں گیارھویں صدی ہجری اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ بیشتر صوفی تذکرے اسی زمانہ میں ترتیب دیئے گئے تھے۔ ۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۰ء میں ''ثمرات القدس'' (لعل بیگ)، ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں ''گلزار ابرار'' (محمد غوثی)، ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳ء میں ''جواہر فریدی'' (علی اصغر چشتی)، ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۶ء میں ''سیر الاقطاب'' (الہدیا چشتی)، ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء میں ''زبدۃ المقامات'' (محمد ہاشم بدخشی) ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۲ء میں مجمع الاولیاء (علی اکبراردستانی)، ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء میں ''حضرت القدس'' (بدر الدین سمرقندی)، ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء میں داراشکوہ کی ''سفینۃ الاولیاء'' اور ''سکینۃ الاولیاء'' اور جہاں آرا کی ''مونس الارواح'' اور ۱۰۶۵ھ/ ۱۶۵۴ء میں مراۃ الاسرار'' (عبد الرحمٰن چشتی) مرتب کی گئیں ۔ بہ اعتبار تاریخ تدوین ''معارج الولایت'' سب سے موخر ہے لیکن افادیت اور استناد میں اس کا درجہ صرف ''اخبار الاخیار'' کے بعد ہے ۔کوئی دوسرا

تذکرہ ترتیب وافادیت میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

گیارھویں صدی ہجری کو ہندوستان کی ثقافتی اور فکری تاریخ میں بعض اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس دور میں مکتب فکر، نئی مذہبی تحریکیں اور نئے سماجی نظریات وجود میں آئے۔ روحانی سلاسل کی تنظیم اور فکر میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور یہ فکری ہیجان اس قدر نمایاں ہوگیا کہ ایک فرانسیسی سیاح برنیر بھی اس کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ان حالات میں مختلف خانوادے اپنی تاریخ اور روایات کے تحفظ کی طرف رجوع ہوئے اور نتیجہ میں تذکروں کی تدوین میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہوا۔

معین الدین عبد اللہ نے ''معارج الولایت'' کی تدوین کا کام مخدوم زادہ شیخ محمد بن شیخ اجمیری بدایونیؒ کی فرمائش پر شروع کیا تھا اور تقریباً تیس سال اس کی ترتیب وتالیف میں صرف کیے تھے۔ یہ مدت بہت طویل ضرور ہے لیکن اگر مآخذ کی تلاش میں مصنف کی جستجو پیش نظر ہو تو اندازہ ہوگا کہ قرون وسطیٰ کا کوئی دوسرا مصنف اس طرح اور اس وسیع پیمانے پر یہ کام انجام نہ دے سکا تھا۔

''معارج الولایت'' دس اجزا پر (جن کو مصنف نے رکن کا نام دیا ہے) مشتمل ہے۔ رکن اوّل میں چشتیہ سلسلہ کے پانچ خواجگان خواجہ اجمیریؒ، قطب صاحب، بابا فریدؒ، شیخ نظام الدین اولیاء، اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا تفصیلی حال درج ہے۔ رکن دوم میں خواجہ اجمیریؒ کے خلفاء اور اولاد کا ذکر ہے، پھر تیسرے، چوتھے، پانچویں رکن میں علی الترتیب ان مشائخ کے خلفاء کا تذکرہ ہے۔ ساتویں رکن میں متفرق چشتی بزرگوں کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔ آٹھویں رکن میں سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ کا ذکر ہے۔ نویں رکن میں متفرق مشائخ کے حالات درج ہیں۔ آخری رکن میں مجاذیب اور صوفی خواتین کا تذکرہ ہے۔ عورتوں کے تذکرے شامل کرنے کی ابتدا شیخ ابوعبد الرحمٰن السلمی کے زیر اثر ہوئی تھی۔ مولانا جامی نے ''نفحات الانس'' میں اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں خواتین کا حال درج کرکے اس روایت کو تقویت پہنچائی اور غلام معین الدین عبد اللہ نے اسی کا اتباع کیا۔

غلام معین الدین عبد اللہ خویشگی المعروف بہ خلیفہ جی کا، قصور کے ایک معروف خانوادۂ علم وارشاد سے تعلق تھا۔ ان کا علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علم معرفت اور اصلاح باطن کی طرف بھی رجحان تھا۔ فارسی شعر اور ادب سے بھی دلچسپی تھی اور ''عبدیؔ'' تخلص کرتے تھے۔ ایک دیوان بھی اپنی

یادگار چھوڑا تھا۔ ولادت ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۲ء کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ قصور میں درس وتدریس کا کام انجام دینے کے بعد دہلی ، اورنگ آباد، گجرات وغیرہ کا رخ کیا اور ہر جگہ مشائخ کی صحبت میں پہنچے۔ احمد آباد میں شاہ سراج الدینؒ اور شیخ عبد الرحمٰن رفیعؒ سے خاص طور پر استفادہ کیا۔ شیخ عبدالرحمٰن رفیعؒ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔تیس سال تک شب و روز'' فتوحات مکیہ'' اور فصوص الحکم ان کے غوروفکر کا مرکز رہی تھیں۔ دوسرے اور مشائخ جن سے غلام معین الدین عبد اللہ کو فیض صحبت کا موقع ملا، شیخ پیر محمد لکھنویؒ ،مولانا خواجہ علیؒ ، شیخ محمد رشید جونپوریؒ ، اور شیخ عبد اللطیف برہانپوریؒ تھے۔ شیخ محمد رشید جونپوریؒ آخر عمر میں درس وتدریس کا سلسلہ ختم کر کے شیخ اکبرؒ کی تصانیف لے کر گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ شیخ عبد اللطیفؒ نقشبندی سلسلہ کے شدید ناقدین میں تھے۔ ان سب صحبتوں نے عبدی کے افکار ورجحانات کا رخ متعین کیا۔

غلام معین الدین کو تصنیف وتالیف سے بڑی دلچسپی تھی ۔ انہوں نے بعض کتابیں درسی ضروریات کے پیش نظر لکھی تھیں، مثلاً گلستان کی شرح '' بہارستان'' بوستان کی شرح '' تحفہ دوستان'' اور شرح دیوان حافظ'' نزہۃ الارواح '' حسینی کی شرح '' راحۃ الاشباح'' اور لوائح جامی کی شرح '' روائح''۔ بعض کتابیں تصوف کے مسائل سے متعلق تھیں مثلاً '' تلقین المریدین'' فوائد العاشقین'' '' مقصود السالکین''،اور'' حصول الوصول'' وغیرہ ۔ ملک محمد جائسی کی اکھروٹ کی فارسی شرح بھی '' حروف عالیات'' کے نام سے انہوں نے لکھی تھی ۔ بہت سی تصانیف اب دستیاب نہیں ہیں۔ '' معارج الولایت'' وغیرہ میں ان کے نام ملتے ہیں۔ جو تصانیف موجود ہیں، ان سے انداز ہوتا ہے کہ عبدیؔ نے اس دور کے مذہبی رجحانات ، بالخصوص اختلافات عقائد ونظریات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اخوند درویزہ (م ۱۰۴۸ھ) کے افکار ، مہدوی فرقہ کے نظریات ، بھگتوں کے حالات سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔

'' معارج الولایت'' غلام معین الدین عبد اللہ کا تصنیفی شاہکار ہے۔ مصنف نے اس کی ترتیب اور تالیف میں قرون وسطیٰ کے مذہبی لٹریچر بالخصوص تصوّف سے متعلق تصانیف کو کھنگال ڈالا تھا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے بعد غالباً کسی صوفی تذکرہ نگار نے اتنے متنوع مواد سے اس پیمانے پر استفادہ نہیں کیا۔ بعض کتابیں جو ان کو اس وقت دستیاب تھیں اب بالکل ناپید ہیں مثلاً انوار المجالس' (ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاءؒ) مرتبہ خواجہ محمد بن مولانا بدر الدین اسحاقؒ ' یا'' تحفۃ الابرار

''وکرامۃ الاخیار'' (ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاء) مرتبہ عزیز الدین صوفی یا ''خلاصۃ اللطائف'' مصنفہ مولانا علی جاندار، یا ضیاء الدین برنی کی ''صلوٰۃ کبیر'' اور'' عنایت نامہ الٰہی'' وغیرہ۔

غلام معین الدین عبد اللہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کتابوں کے طویل اقتباسات اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح بعض نایاب کتابوں اور دستاویزات کو انہوں نے محفوظ کردیا ہے۔ حضرت مجدد صاحب کے نظریات کے خلاف بعض علماء نے جو فتویٰ دیا تھا، اس کو غلام معین الدین عبد اللہ نے مکمل طور پر علماء کے نام کے ساتھ نقل کردیا ہے۔

غلام معین الدین عبد اللہ مسلک کے اعتبار سے چشتی تھے اور وحدت الوجود پر ایمان رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا تعصب مجدد صاحبؒ کے مخالفین کی ہمنوائی سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ شاہ محبّ اللہ الہ آبادیؒ کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اورنگ زیب نے نقشبندی اثرات کے تحت شیخ کے رسالہ تسویہ کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ عبدیؔ نے نہ صرف اپنے سلسلہ کے افکار کی مدافعت کو ضروری سمجھا، بلکہ نقشبندی سلسلہ کے مخالفین، بالخصوص سید محمد برزنجی کے خاندان سے، نقشبندیوں کی مخالفت میں لٹریچر جمع کیا۔ اورنگ آباد اس زمانہ میں نقشبندی مشائخ کے زیر اثر تھا اور شاہ کلیم اللہ دہلویؒ نے اپنے مرید اور خلیفہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کو چشتیہ سلسلہ کی بعض روایات کو ملتوی کردینے کی ہدایت کی تھی۔ غالباً اورنگ آباد کے اس ماحول نے عبدیؔ میں ایک ردعمل کی کیفیت پیدا کردی، جو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے تذکرہ میں کافی نمایاں ہے۔

قطع نظر اس فکری عصبیت کے، غلام معین الدین عبد اللہ نے جن بزرگوں کا بھی حال لکھا ہے، تحقیق و دیانت کا دامن نہیں چھوڑا۔ سید محمد مہدی جونپوریؒ کے متعلق مہدی موعود ہونے کے دعوے کو بہتان بتاتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے افکار کی سمت وہی ہے جو تذکرہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کی ہے۔ ملک محمد جائسی کی کتابوں سے طویل اقتباسات دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ وہ ''سید محمد مہدی کو مہدیٔ ہادی مانتے تھے، نہ کہ مہدی موعود۔'' اکبر نے ان کو دربار میں بلایا تھا۔ انہوں نے طویل عمر پائی تھی۔ لکھا ہے کہ پستہ قد اور حقیر حبشہ تھے۔ کبیر کے حال میں لکھتے ہیں کہ وہ شیخ تقی کے مرید تھے۔ ان کے کلام کا مطالعہ غلام معین الدین نے کیا تھا اور یہ رائے قائم کی تھی۔

''اگر بہ انصاف درکلام او بینی جواہر ولآئی حقائق واسرار بیابی کی مثل آں درکلام دیگرے کمتر تواں یافت۔''

جہاں تک مشائخ متقدمین کا تعلق ہے ان کا دست طلب وتحقیق ہر اہم ملفوظ، مکتوب اور دیوان تک پہنچا ہے۔''معارج الولایت'' کے مندرجہ ذیل نسخوں کی نشاندہی محمد اقبال مجددی نے اپنی فاضلانہ تالیف ''احوال وآثار عبداللہ خویشگی قصوری'' میں کی ہے:

(۱) نسخہ مکتوبہ ۱۱۱۱ھ مملوکہ مولوی غلام رسول

(۲) نسخہ مکتوبہ ۱۱۱۱ھ ذخیرہ پروفیسر سراج الدین آذر

(۳) نسخہ ذخیرہ حافظ محمود شیرانی (ناقص)

(۴) چند اجزا ملکیت کرنل خواجہ عبدالرشید

اسٹوری نے PERSAN LITERATURE (P.1011) میں اس کتاب کے مخطوطات سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔

راقم الحروف کے ذخیرہ کتب میں ''معارج الولایت'' کا ایک نہایت خوشخط نسخہ ہے، جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور غالباً مکمل ترین نسخہ ہے۔ پہلی جلد ۸۳۵ صفحات پر، دوسری جلد ۸۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔کل ۱۶۷۳ صفحات ہیں۔ سائز بڑا ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۷ سطریں ہیں۔ کتابت ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء میں نذر محمد نے کی تھی۔

یہ نسخہ دیوان اللہ جوایا صاحب، سجادہ نشین درگاہ بابا فریدؒ، کی نگرانی میں راقم الحروف کے جدامجد منشی ارشاد علی صاحب نے تیار کرایا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں میرے دادا مولوی فرید احمد صاحب نظامی نے اپنے برادر نسبتی سید رشید احمد صاحب رضوی مصنف ''اعلان سیادت فریدی'' کے ذریعہ اس کی طباعت کا انتظام کرانا چاہا تھا اور ایک اعلان ''اشتہار خزانہ معرفت'' کے عنوان سے جاری کیا تھا۔ ان کا ارادہ اس کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا تھا۔ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر ۱۰ جلدوں میں دس رکن شائع کرنا تجویز ہوا تھا، لیکن یہ پروگرام شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور ''معارج الولایت'' آج تک اشاعت کا منتظر ہے۔

☆☆☆

تصوف : تاریخ وتہذیب اور رسم وحقیقت

خواجہ حسن ثانی نظامی

''اسلام''وہ کراماتی لفظ ہے جو''کتاب اور سنت''۔قرآن اور حدیث'' کے بغیر نہ خیال میں آتا ہے، نہ قلم اور روشنائی کی مدد سے کاغذ اورتحریر میں ابھرسکتاہے، نہ زبان اورتقریر اسے بیان کرسکتی ہے۔''کتاب اور سنت'' کی حیثیت''کسوٹی'' کی بھی ہے اور روشنی کی بھی ! یہ دونوں جہاں جہاں موجود ہوں، وہاں نہ کسی کھوٹ کی گنجائش نکلتی ہے، نہ ملاوٹ کی اور نہ ادھر اُدھر بھٹکنے کی ! نیز کم وقت میں بھی زیادہ بات کہی جا سکتی ہے ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زیادہ بات کیا ؟ جو بات بھی کہنے کی ہے اور کہی جا سکتی ہے، وہ سب کی سب تمام وکمال کے ساتھ پوری کی پوری کہی جا چکی ہے ۔

قرآن مجید اور حدیث شریف کے بارے میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا۔ پچھلے چودہ سو سال کی مدت میں خالص منطقی اورعلمی بنیادوں پر کون سی بحث ہے جونہیں ہوئی ۔کیا ایسا لٹریچرکسی اور آسمانی کتاب کے بارے میں موجود ہے ؟ کیا ایسی بحث کسی اور پیغمبر کی حیات اور تعلیمات کے بارے میں ہو چکی ہے، جیسی بحث پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مفید اور صدق آثار زندگی کے بارے میں کی گئی ہے؟ میں بے تکلف کہوں گا کہ یقیناً نہیں !

یہ عقیدہ صوفیائے کرام کے وابستگان کا ہی نہیں، سب مسمانوں کا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے کے لئے ہادی اور نبی بنا کرنہیں بھیجے گئے تھے، بلکہ ان کا پیغام قیامت تک کے لئے ہے اور سب کے لئے ہے ۔ مزید یہ ہے کہ انسانی تاریخ کی ابتدا سے انتہا تک دین کی جومکمل ترین شکل ہوسکتی تھی، وہی مکمل دین پیغمبر آخر الزماںؐ کے ذریعے ہمارے اور آپ کے سامنے آیا ہے ۔ اس لحاظ سے قرآن و حدیث اور اسلام کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ میں وہ دن خاص اہمیت کا حامل ہے، جس دن قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی :

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً "[۱]

(آج کے روز میں نے تمہارے لئے دین کومکمل کر دیا اورتم پر اپنی رحمت کو تمام کردیا اور

تمہارے لئے مذہب اسلام کو پسند کر لیا)

گویا اس روز کے بعد جو زمانہ آیا یا آئے گا، اس میں کتاب وسنت اور اسلام کی شرح اور تفسیر نو کی جا سکتی ہے ۔اس کے باریک سے باریک اور لطیف سے لطیف نکات تو بیان کئے جا سکتے ہیں، لیکن اس ساری تعلیم میں نہ کسی اضافے کی گنجائش اور اجازت ہے نہ کمی کرنے کا موقع اور فرصت ۔

فضائے بسیط اور ناپیدا کنار خلاء کے جو دروازے ہمارے زمانے میں کھل رہے ہیں اور جس کے حال سے عام آگاہی چودہ سو سال پہلے یقیناً نہیں تھی، وہ بھی در اصل نبی کریم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعہ معراج اور اقوال کے ذریعے آخری دین کے لئے کھولے گئے ہیں، ورنہ کون سا دن تھا اور کون سی رات تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے معراج کا دن اور معراج کی رات نہیں تھی ۔ نیز یہ ارشاد سرسری طور پر نہیں ہوا تھا کہ کائنات کی تخلیق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات گرامی کے لئے کی گئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اس وقت بھی موجود تھا جب آدمؑ ابھی آب وگل میں نہیں آئے تھے ۔ یہ ارشاد ماضی کی تاریخ ہی سے پردہ نہیں اٹھا رہا تھا، مستقبل کے امکانات کو بھی روشن کر رہا تھا ۔ دوسرے الفاظ میں مذکورہ بالا آیت نے شریعت محمدی کا نفاذ ان علاقوں اور زمانوں تک وسیع کر دیا ہے جو چودہ سو برس پہلے تو کیا، خود ہمارے لئے بھی نا معلوم ہی ہیں ۔لیکن کل انشاء اللہ معلوم اور دریافت ہو جائیں گے ، یعنی آخری پیغام مکمل پیغام ، آخری آیت اور آخری شریعت کے مخاطب انسان جہاں جہاں جائیں گے ، جب جب جائیں گے ، جیسے جیسے جائیں گے، یہی شریعت ان کے ساتھ جائے گی ۔ یعنی اس کا اثر ونفوذ نہ عرب وچین تک محدود تھا ، نہ ایران، توران ، افریقہ ، آسڑیلیا ، یورپ اور امریکہ تک محدود ہے ،نہ آنے والے وقتوں میں کبھی محدود اور مسدود ہوسکتا ہے ، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اور نو دریافت علاقوں میں اور دنیاؤں میں بھی اس کو نافذ کیا جائے گا اور ان مقامات پر کوئی مخلوق اگر پائی گئی تو اس کو بھی شریعت محمدی ہی کی پیروی کرنی ہوگی ۔ گویا پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی ان کی لائی ہوئی شریعت نہ منسوخ ہوئی، نہ منسوخ ہوگی۔ یہ زمان و مکان کی پابند ہرگز نہیں بنے گی ۔زمان و مکان (time and Place) البتہ اس کے پابند رہیں گے ۔

ان حالات میں تصوف اگر کوئی ایسی چیز ہے جو مذکورہ بالا دن اور آیت شریفہ کے نازل ہونے کے بعد نمودار ہوئی یا پہلے سے تھی؟ (اور اس تسلسل ہی میں تھی جس تسلسل سے دین اسلام ہر زمانہ

میں آتا رہا اور آخری پیغمبر پر مکمل ہوا)اگر آخری شریعت نے سابق کی بعض چیزوں کے ساتھ اسے بھی منسوخ اور کالعدم کردیا تو پھر اس کا تعلق نہ تو معروف اور جانے پہچانے صوفیاء اور بزرگوں سے دیکھا ناممکن ہوگا، نہ ہم جیسے بزرگوں کے عقیدت مند اور وابستگان اس سے کوئی ایسا تعلق رکھنے کے لئے آزاد ہوں گے جیسا کہ تعلق مذھبی عقیدے کی بناء پر رکھا جاتا ہے ۔ ہم تو صرف اس عقیدے کو مانتے ہیں اور مان سکتے ہیں جو اسلام سے قرآن سے اور پیغمبر آخر الزماںؐ اوران کے طریقے سے جڑا ہوا ہو۔ یہاں یہ بات لمحہ بھر کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ جس چیز کا تعلق اور جوڑا اسلام سے قرآن سے ہو اس کے دائرہ کار سے نہ ماضی باہر ہے ،نہ حال نہ مستقبل ۔ اس کی جو لان گاہ سے تو کچھ بھی باہر نہیں ، ہر اچھی چیز کو حدیثِ نبوی کے الفاظ میں مومن کا گم شدہ مال سمجھنا چاہیے ۔ہاں ! روک ٹوک ہے تو یہ ہے کہ ترک و اختیار روز مرہ کا اصول رہا ہے اور رہے گا ،معروف اور منکر کا فرق ضروری ہے ۔مصلحت ،ضرورت ،حکمت کا زمانے ہی کا تقاضہ نہیں اسلام کا تقاضا بھی ہے، کہ اسلام مملکت زمان ومکان کا اصل حکمراں ہے ۔

ایسا عقیدہ اپنی اصل کو قائم کرنے کے لئے اس تک عام رسائی کے لئے کھری تاریخ بھی مانگتا ہے اور اس تاریخ میں رسم وحقیقت دونوں کو اپنے اپنے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس بات کا متقاضی بھی ہوتا ہے کہ جو خط و خال نظر آرہے ہیں، وہ پیوند کاری تو نہیں ہے ؟ اورجس چیز کو تہذیب کے نام سے یاد کیا جارہا ہے، وہ کوئی پلاسٹک سرجری تو نہیں تھی ؟ اس کا اصل روپ کیا تھا ؟ اہل تصوف اس لفظ کو اسلام کے ساتھ جڑا ہوا اس لئے سمجھتے ہیں کہ تصوف کا وجود مذکورہ آیت کے نزول سے پہلے بھی تھا ۔ ہمارے تصوف کی تاریخ اسلام کے مکمل ہونے کے بعد نہیں، بلکہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہوتی ہے ۔ بلکہ اس کی موجودگی اس اسلام کے زمانے میں بھی نظر آتی ہے جو پیغمبر آخر الزماںؐ سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے انسانوں کے لئے اپنے وقت پر آتا رہا ۔ اور اسے کسی نے بھی اور کبھی بھی قابل ضبطی اور منسوخی نہیں سمجھا ۔کسی سے میری مراد انبیاء علیہم السلام اور شریعت لانے والوں سے ہے ۔

تصوف کے بارے میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ابتدا میں یہ ایک حقیقت تھی بے لفظ، لیکن میری گذارش یہ ہے کہ تصوف کی حقیقت پہلے ہی دن سے لفظی پیرا ہن کے ساتھ موجود تھی ۔ لفظ ''صوفی'' کی تحقیق میں بہت سی تھیوریاں سامنے آچکی ہیں ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنی

مشہور کتاب تاریخ مشائخ چشت میں اس پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ اور تقریباً سب ہی تھیوریاں نقل فرمائی ہیں اور لکھا ہے کہ جمہور صوفیاء کا خیال ہے کہ لفظ صوفی صوف سے مشتق ہے۔انہوں نے صوفیہ کے ظاہری لباس یعنی صوف سے بنے ہوئے اونی کپڑوں کا ذکر بھی فرمایا ہے، لیکن جو بات سب سے اہم انہوں نے دریافت فرمائی ہے اور لکھی ہے عام لوگ طویل بحث کے دوران اس سے غافل ہو جاتے ہیں ۔ پروفیسر نظامی صاحب جیسے معتبر ماہر تاریخ کا کتاب اخبار مکہ کی اس روایت کو تسلیم کرنا معمولی بات نہیں ہے کہ لفظ ''صوفی'' اسلام سے پیشتر بھی رائج تھا ۔ ۲ؔ

نظامی صاحب نے شیخ ابو النصر سراج کی اس رائے کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ اس اصطلاح کو بغدادیوں کی ایجاد نہیں مانتے، بلکہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ حضرت حسن بصریؒ کے زمانے میں رائج تھا اور ان کا زمانہ صحابیوں کی معاصرت کا تھا۔ کتاب اللمع کا اقتباس ہے :

کان یعرف ھذا لاسم فی وقت حسن بصری روی عنه انّه قال رایت صوفیا فی الطواف وروی سفیان الثورء انّه قال لو لا ابو ھاشم الصوفی ما عرّفت رقیق الریاء وقد ذکر فی الکتاب الّذی جمع فیه اخبار مکه عنه محمد بن اسحاق وغیرہ یذکرہ فیه حدیثاً ان قبل الاسلام قد خلت مکة فی وقت من الاوقات حتی کان لا یطوف بالبیت أحد وکان یجیء من بلاد بعیدةً رجل صوفی فیطوف بالبیت و ینصرف ، فان صح ذٰلک یدل علی ان قبل الاسلام کان تعرف ھذ الاسم وکان ینسب الیه اھل الفضل والصلاح ۔ ۳ؔ

(ترجمہ) یہ لفظ (یعنی صوفی)حسن بصریؒ کے زمانے میں معروف تھا چنانچہ ان سے مروی ہے کہ میں نے ایک صوفی کو طواف کرتے ہوئے دیکھا ۔ سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاء خفی کو نہ سمجھ سکتا ۔ کتاب تاریخ مکہ میں محمد بن اسحٰق وغیرہ سے مروی ہے کہ اسلام سے قبل ایک بار مکہ خالی ہوگیا ۔ اس وقت بیت اللہ کا طواف کرنے کے لئے کوئی متنفس باقی نہ رہا ۔ البتہ کسی دور دراز علاقے سے ایک صوفی مرد آتا تھا اور طواف کرکے واپس چلا جاتا تھا ۔ اگر یہ روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو ثابت ہوگا کہ اسلام سے پیشتر بھی یہ لفظ مستعمل تھا اور ارباب فضل و صلاح کے لئے بولا جاتا تھا ۔

پروفیسر نظامی نے ابومحمد جعفر بن احمد بن حسین السراجی القادری کے حوالے سے امیر معاویہ کے

ایک خط کا ذکر بھی کیا ہے کہ جو انہوں نے ابن امرالحکم، گورنر مدینہ کو لکھا تھا۔ اس میں ایک شعر یہ تھا:

قد کنت تشبه صوفیاً له کتب من الفرائض و آیات فرقان ۔[۴]

(ترجمہ) تو مشابہ تھا ایسے صوفی سے جس کے پاس کتابیں ہوں ۔جن میں فرائض اور آیات فرقان موجود ہوں ۔

اپنی طویل بحث کے بعد نظامی صاحب اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس روایت کو اگر صحیح مان لیا جائے تو صوفی کا لفظ پہلی صدی ہجری میں استعمال ہونا ثابت ہو جاتا ہے ۔

پروفیسر نظامی صاحب نے حد درجہ محتاط تاریخ نویس ہونے کی بنا پر لفظ اگر کے ساتھ یہ بات مانی ہے کہ لفظ صوفی اسلام کے قرن اول میں موجود تھا، لیکن علامہ آلوسی نے تاریخ عرب بیان کرتے وقت کسی قسم کا شک ظاہر کئے بغیر یہ دلچسپ روایت نقل فرمائی ہے کہ پہلا آدمی جسے صوفی کہا گیا ہے، صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے صوفی نہیں کہلایا بلکہ عبادتوں اور ریاضتوں اور انسانوں کی خدمت کی وجہ سے خود صوف کی طرح سوکھ جانے کی بنا پر صوفی مشہور ہوا ۔

علامہ محمود سکری آلوسی (متوفی ۱۹۲۴ء) اگر چہ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور اپنے اس عقیدہ کی وجہ سے شاید انہیں سلطان عبدالعزیز ابن سعود کا قرب حاصل رہا تھا، انہیں کیا غرض پڑی تھی کہ تصوف کی تاریخ کو پیغمبر آخر الزماں ؐ کی بعثت سے پہلے کے زمانے تک پہنچائیں ۔وہ اپنی مشہور کتاب بلوغ الادب میں لکھتے ہیں:

''صوفہ لقب ہے غوث بن مربن اد بن طانجہ بن الیاس بن مضر کا ۔ اسے اوراس کی اولاد کو صوفہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی والدہ کے یہاں اولاد نہ ہوتی تھی ۔اس نے منت مانی کہ لڑکا پیدا ہو تو اسے کعبے کی نذر کر دوں گی، تاکہ وہ کعبہ کی خدمت کرے ۔ چنانچہ غوث پیدا ہوا اور شروع شروع میں وہ اپنے ماموؤں کے ساتھ کعبے کی خدمت کرتا رہا۔ پھر کعبے کی وجہ سے جو احترام اسے حاصل ہوا تو یہ لوگوں کو عرفہ سے گذارنے کا تحویل دار بن گیا۔'' صوفہ نام کی وجہ یہ ہے کہ ابھی یہ بچہ ہی تھا اور کعبے کی خدمت کیا کرتا تھا کہ ایک روز گرمی کی شدت کی وجہ سے گر پڑا۔ اس کی والدہ نے اسے گرا ہوا اور دبلا دیکھا تو کہا کہ میرا بیٹا تو سوکھ کر صوفہ (اون) بن گیا ہے ۔ لہٰذا صوفہ نام پڑا۔ اس کی اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے''[۵]

علامہ آلوسی کی نقل کردہ یہ روایت اگر کوئی تنہا روایت ہوتی تو شاید طویل بحث کا دروازہ کھول دیا

جاتا ۔لیکن اس روایت کے ساتھ جب ہم ان تمام روایات کا جائزہ لیتے ہیں جن کو پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے نقل فرمایا ہے، تو ایک روایت دوسری روایت کی گویا تصدیق کرتی نظر آتی ہے ۔

علامہ سکری نے اپنی تاریخ عرب میں یہ بھی لکھا ہے کہ صوفہ جریم کا ایک قبیلہ ہے جو مکے میں رہا کرتا تھا ۔عرفہ سے لوگوں کو گذارنے کا اختیار اسی کے پاس تھا ۔ انہوں نے قبل اسلام کے کسی شاعر کا ایک شعر بھی اسی قبیلے کے بارے میں لکھا ہے :

ولا یر تجون فی التعریف موفقهم حتی یقال اجیزوا آل صوفاناً

(ترجمہ)عرفات میں قیام کے وقت یہ اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے، جب تک نہ کہا جائے کہ اے آل صوفان لوگوں کو گذار دو۔

اگر امیر معاویہ سے منسوب شعر بھی درست مان لیا جائے، تو پھر اس بات میں بھی شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ اسلامی فقہ کو سب سے پہلے کتابی شکل ان لوگوں نے دی جو صوفی کہلاتے تھے، یعنی کتابی لٹریچر کی حد تک صوفیاء ہی قرآن و حدیث سے اخذ کئے جانے والے قوانین کے حامل تھے ۔ یہ بات یوں بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت علیؑ تک اکثر و بیشتر اکابر صوفیاء کے سلسلے پہنچتے ہیں اور حضرت کی ذات گرامی ایک طرف ان صحابہ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، جو فقیہ تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور دوسری طرف عوام وخواص ہی کو نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے اخص الخواص کو ان کی فقہی مہارت پر بھروسہ اور اعتماد تھا ۔ نیز ان کو اصحابِ صفہ کا سرگردہ بھی سمجھا جاتا ہے اور اصحابِ صفہ وہ جلیل القدر صحابہ تھے جنہوں نے خود کو زندگی کی دوسری ضروریات اور تقاضوں سے بے نیاز کر کے دین سیکھنے اور سکھانے کے لئے وقف کر رکھا تھا ۔

یہ بات ہمیں یقین سے معلوم نہیں ہے کہ اصحاب صفہ اور حضرت علیؑ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کو بھی صوفی کہہ کر پکارا گیا یا نہیں ۔ اموی اور عباسی خلافتوں کے طویل ادوار میں حضرت علیؑ سے تعلق رکھنے والے آثار مٹانے کی کوششیں کوئی ڈھکی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ خدا معلوم کیا کیا تھا جس کا وجود اس زمانہ میں نہیں رہا ۔لیکن خانقاہ کی اصل سلسلے میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کا اپنی مشہور کتاب عوارف المعارف میں یہ لکھنا اہمیت رکھتا ہے کہ دین سیکھنے کے لئے اور اسلامی مسائل کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے لوگ مدینہ منورہ آتے تھے ، ان کا قیام کا بعض صحابہ نے اپنے مکانوں پر انتظام کیا تھا۔ یہ انتظام غالباًاس لئے ہوا ہوگا کہ مسجد نبوی اورا صحابِ صفہ کی مختصر

نشست گاہ اور قیام گاہ باہر سے آنے والوں کے لئے کافی نہیں رہی ہوگی۔ مدینہ منورہ کے مذکورہ بالا مقدس مکانات ہی دراصل وہ مقامات تھے جہاں خانقاہ کہلانے والے ادارے کی بنیاد پڑی ۔ ان مکانوں کے مکینوں کو اس روایت کی بنا پر صوفی کہا گیا ہو تو کیا عجب ہے! جو روایت دینی سمجھ اور خدمت خلق کے سلسلے میں کعبۃ اللہ اور حضرت غوث عرف صوفہ یا صوفی اور آل صوفان سے قائم اور قدیم سے چلی آتی تھی ۔

تاہم اب ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ صفہ اور خانقاہ او ر اصحاب صفہ اور صوفیہ کا سنجوگ اور سنگم تاریخ کے کس لمحے میں اور ٹھیک کون سے مقام پر ہوا ۔لیکن اتنی بات ماننی پڑے گی کہ وہ بزرگان دین جن کو اسلام کی ظاہری جانکاری ہی نہیں، بلکہ باطنی کیفیات اور اثرات کا واقف کار بھی کہنا چاہیے، وقت کے ساتھ تعداد میں بڑھ رہے تھے او ر پھیل رہے تھے ۔ کچھ حضرت علیؑ کے ساتھ کوفے پہنچے ہوں گے تو کچھ ربذہ جیسے مقامات پر حضرت ابو ذر غفاریؓ کی طرح پہنچا دئے گئے ہوں گے اور قدرت اپنے حیرت انگیز انتظام کے ذریعے دریا سے نکلی ہوئی کتنی نہروں کو کہاں کہاں لے گئی ہوگی ۔ اسلام پیاسوں کو صرف یہ سوکھا درس دینے اور پڑھانے نہیں آیا تھا کہ ٹھنڈا اور میٹھا پانی کیسا ہوتا ہے ۔ اسکی ماہیت کیا ہے ؟ بلکہ وہ تو پانی پلا کر بتاتا تھا کہ لو دیکھو پاک و صاف صحت بخش روح پرور پانی ایسا ہوتا ہے ۔حضرت سفیان ثوریؒ کے اوپر مذکور ہوئے اس قول کے یہی معنی نہیں تو اور کیا معنی ہیں کہ

''اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاء خفی کو نہ سمجھ سکتا۔''

تصوف کی اصل کے بارے میں جو حوالے اوپر آ ئے ہیں ، وہ بہت قدیم حوالے ہیں۔جو حوالے اس زمانہ کے کچھ بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ بھی اتنے قدیم ہیں اور اتنے زیادہ ہیں اور ایسے تسلسل کے ساتھ موجود ہیں کہ ان سے بھی صرف نظر کرنا درست نہیں ۔ یہاں ان حوالوں کا ذکر ضروری ہے اور نہ شاید ممکن ۔ تاہم آج سے چھ سات صدی قبل کے ایک نہایت ہی معتبر بزرگ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے ایک مکتوب کا اقتباس بطور نمونہ از خروارے پیش کیا جاتا ہے ۔ حضرت اپنے اس مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں :

سمجھو کہ تصوف کا ضابطہ اور قانون دیرینہ ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اس پر پیغمبر وں اور صدیقوں کا عمل رہا ہے ۔ بری عادتیں اور زمانے میں جو خرابیاں پیدا ہو گئیں ہیں ، ان کی وجہ سے

زمانے والوں کی آنکھوں میں صوفیوں کا حال برا دکھائی دیتا ہے ۔ ان کی پاک دامنی پر دھبّہ لگانے کا خاص سبب یہی ہے کہ خود صوفیوں نے اپنی روش بدل دی ہے ۔ اور خلاف اصول عادتوں میں مبتلا ہوکر تصوف کو بدنام کر دیا ہے ۔ ورنہ تصوف تو دین و ایمان کی جان ہے ......بہرحال اگر تصوف کی ابتدا پر غور کروگے تو اسکو آدم علیہ السلام کے وقت ہی سے پاؤگے ۔ اس عالم میں سب سے پہلے صوفی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا ۔ پھر اجتبا ء اور اصطفاء کے مقام پر پہنچایا ۔ خلافت عطا فرمائی ۔ پھر صوفی بنایا ......تصوف کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی کو منتقل ہوتی رہی ۔صوفیوں کا یہ بھی معمول ہے کہ کسی خاص جگہ بیٹھ کر آپس میں مل جل کر راز ونیاز کی باتیں کیا کرتے ہیں ۔ چنانچہ صوفی اول آدم علیہ السلام کی اس خلوت در انجمن کے لئے خانہ کعبہ کی بنیاد پڑی ۔ یعنی دنیا میں پہلی خانقاہ کعبہ مکرم ہے ......پھر جب دور مبارک حضرت سید نا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آ پہنچا ،حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح کعبہ کا قصد کیا ......علاوہ اس کے خود مسجد نبوی میں ایک گوشہ معین کردیا ۔ اصحاب گردہ جو سالکان راہ طریقت بعنوان خاص تھا ......ان میں بعض بوڑھے تھے،بعض جوان جیسے حضرت ابوبکر ، حضرت عمر ، حضرت عثمان ، حضرت علی ، حضرت معاذ و بلال و ابو ذر وعمار رضی اللہ عنہم ۔ ان حضرات کو خاص اوقات میں آپ وہاں بٹھاتے ......اس خاص جماعت صوفیہ کے لوگ قریب قریب ستر اشخاص تھے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی صحابی کی عزت وتکریم فرماتے توان کو ردائے مبارک یا اپنا پیرا ہن شریف عنایت فرماتے۔صحابہ میں وہ شخص صوفی سمجھا جاتا ۔اب تم جان سکتے ہو کہ تصوف اور طریقت کی اول اول ابتدا حضرت آدم علیہ اسلام سے ہوئی،۔ ۷

حضرت یحیٰی علیہ السلام منیری کا شمار ان عظیم المرتبت بزرگوں میں کیا جاتا ہے جن میں حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ ، حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ ۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ،حضرت بہار الدین نقشبندیؒ جیسی خدا معلوم کتنی بے مثال ہستیاں ہیں، جو ایک طرف اعلیٰ ترین روحانی مقام کی مالک ہیں اور دوسری طرف علمی دنیا میں جو اونچی سے اونچی جگہ ہوسکتی ہے۔ وہاں متمکن نظر آتی ہیں ۔ اگر ان حضرات نے بالکل ابتدائی زمانے کے راویان حدیث کا زمانہ پایا ہوتا تو ان کی ہر روایت کو بھی ایسا ہی معتبر سمجھا جاتا ، جیسا کہ دوسرے راویان حدیث کے اعتبار نے مسلمانوں کے نزدیک ہی نہیں پوری علمی دنیا کے نزدیک مکمل ترین اور بالکل صحیح سند کی حیثیت اختیار

کرلی ہے۔ کتابی حوالے بھی ان کے زمانے تک ایسے موجود تھے، جو امتداد زمانہ اور انقلابات کے سبب اب ہم کو میسر نہیں ہیں ۔ ان حضرات کا اپنے پیران سلسلہ کے شجروں اور اسناد کو پیغمبر آخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچانا بھی ایک بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ تصوف کی اصل کا خود پیغمبر اسلامؐ تک ہونا بالکل یقینی نہیں ۔

یہ سارا مستند تاریخی مواد لفظ ''صوفی'' کی قدامت کو ثابت کرنے والا مواد ہے، لیکن اس اصرار کی حاجت غالباً کسی کو بھی نہیں کہ جو لوگ بالکل سامنے کی چیز کو ماننے سے انکار کریں ۔ ان سے اس چیز کا وجود منوا ہی لیا جائے ۔ کیونکہ محض کاغذی بحث اور بحث برائے بحث کچھ خاص مفید مشغلہ نہیں ہے۔ کارآمد اور فیض پہنچانے والی چیز یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ صوفی کہلانے والے کس چیز کے علمبردار رہے ہیں ؟ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں ؟ کیا ان میں سے ایک بھی معتبر آدمی شریعت کا سخت پابند نہیں ! کیا وہ سند قرآن و حدیث کے سوا کسی اور چیز سے لیتے ہیں ؟ کیا انہوں نے حضرت ابو ہاشم کوفیؒ کی طرح دین کی باریکیوں اور نزاکتوں اور معنی و مفہوم کو جسم و روح کے ساتھ نہیں سمجھا ؟

غالباً کوئی بھی اہل علم اور حق پسند صوفیہ کی دینی خدمات کا منکر نہیں ہے ۔ انکار کرنا کیسا جو لوگ واقعی سچ کا ساتھ دینیوالے ہیں، وہ اقرار کرتے ہیں کہ اہل تصوف نے اسلام کے پورے فیوض و برکات کو صرف مسلمانوں تک ہی نہیں پہنچایا بلکہ ان غیر مسلموں کو بھی اس سے بہرہ مند کیا، جو اسلام سے بے حد وحشت کرتے تھے اور دور بھاگتے تھے اور یہ بات نہیں مانتے تھے کہ اسلامی تعلیمات میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں، جن سے غیر مسلم بھائی مسلمان نہ ہوکر بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کہ یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ کل بنی نوع انسان ، اپنے پرائے سب ہی کے لئے ہیں۔ یہی حضرات ہیں، جنہوں نے حضرت ابو ہاشم کوفیؒ کی طرح اسلام کی آدھی ادھوری تعلیم کو نہیں بلکہ اسکی پوری فرمانروائی کو جانا اور اسلام کے فیض بخش دربار ے میں انسان کو لے کر آئے ۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے اس ارشاد کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے :

''ایک طاعت لازمی ہے اور ایک طاعت ہے متعدی ۔ طاعت لازمی وہ ہے، جس کا فائدہ اسی ایک طاعت کرنے والے کی ذات کو پہنچتا ہے۔ اور وہ نماز اورروزہ ہے، اور حج ہے اور اوراد وتسبیحات اور اسی طرح کی اور چیزیں ہیں ۔ لیکن طاعت متعدی وہ ہے کہ جس سے فائدہ اور راحت دوسرے کو پہنچے ، خرچ کرنے اور ز شفقت برتنے سے اور جہاں تک ہو سکے دوسروں کے حق میں مہربانی کرنے

سے ۔ اس کو طاعت متعدیہ کہتے ہیں ۔ اور اس کا ثواب بے حد وبے اندازہ ہے اور طاعت لازمہ ہے تو اخلاص ہونا چاہیے، تاکہ قبول ہو جائے۔لیکن طاعت متعدیہ تو جس طرح کی بھی ہو اور جیسے بھی کی جائے، اس کا ثواب ہے''۔۸؎

حضرت نے اپنے ارشاد کے آخر میں جو فقرہ استعمال فرمایا ہے وہ ایک ایسے نکتے کی طرف لے جاتا ہے، جو اسلامی انقلاب کی اصل روح ہے یعنی خدمتِ خلق جس طرح بھی ہو مفید ہے ۔ مثلاً اگر کوئی دکھاوے کے لئے کھانا کھلائے یا کسی ننگے کو کپڑے پہنائے ،تب بھی اتنا ثواب تو نیکی کرنے والے کو مل ہی جائے گا کہ بھوکے کا پیٹ بھرا ، ننگے کا تن ڈھکا ۔ یہ اسلام کی تعلیمات کا وہی رخ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس سے اپنے پرائے سب مستفید ہو سکتے ہیں ۔ اور مستفید ہوتے آئے ہیں ۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ اعتراض کریں کہ عہد رسالت میں سب مسلمان صوفی کیوں نہ کہلائے۔کم از کم مسلمان علماء اور مبلغوں کو تو صوفی نام ہی سے پکارا جانا چاہیے تھا! تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت بلکہ آج تک سب سے بڑا شرف صحابیت ہی کو سمجھا جاتا رہا ہے ۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑے اللہ والے بزرگ سے ایک عام صحابی کو افضل جانا گیا ۔ اہل بیت اطہارؓ کی فضیلت کا بھی ایک پہلو یہ ہے کہ وہ نہ صرف شارع علیہ السلام کا گوشت پوست ہیں اور ان کی رگوں میں نبوت کا پاک خون گردش کررہا ہے، بلکہ انہوں نے ہر وقت خلوت میں ساتھ رہ کر صحبت کا سب سے زیادہ فیض پایا۔ اگر صحابیت کی بھی درجہ بندی ممکن ہو تو ان کو اعلیٰ ترین صحابی یا صحابیہ ماننا چاہیے ۔ دین کا جیتا جاگتا نمونہ ۔ بلکہ خود چلتا پھرتا دین ، اس کا مکمل ترین روپ ، اسکی ساری کی ساری تابانی مخصوص اوقات میں نہیں بلکہ ہر وقت ان کی ایسی آنکھوں کے سامنے رہی جو مازاغ البصر و ما طغی (نگاہ نہ تو ہٹی نہ بڑھی) کی جانشین آنکھیں تھیں اور تجلی دیدار کی سمائی اور سہارا رکھتی تھیں ۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ظاہر بین حضرات نے نام نہاد صوفیوں کو دیکھ کر بقول حضرت یحیٰی منیریؒ سب صوفیوں سے بدظن ہو جانا ضروری سمجھ لیا ۔ حالانکہ سچے صوفی تو وہ ہیں، جنہوں نے سند اور سنت کو صرف کتابی حوالے تک محدود نہیں رکھا ۔ اس کی عملی سند تسلسل اور تواتر کی سند ، ظاہر و باطن کی سند ، ہر طرح کی سند کو لازم جانا ،یعنی ان کے یہاں یہ پابندی رہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پیر کا مرید ہوتا ہے تو پہلے یہ دیکھے کہ اس پیر کے پاس اس کے اپنے پیر کی صحیح اور درست سند ہے یا نہیں ؟ یہاں

تک کہ یہ سند ہاتھ در ہاتھ نیچے سے اوپر کی طرف جاتے ہوئے تبع تابعینؒ ،ان سے اوپر تابعینؒ ان سے اوپر صحابہ کرام اور پھر خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متصل ہوتی ہے یا نہیں؟ کو صوفیاء ان ساری کڑیوں ایک دوسرے سے جڑا ہونا ضروری سمجھتے ہیں ۔ اگر ایک کڑی بھی ٹوٹی ہوئی ہے یا مشتبہ تو پھر پورے سلسلے کے بارے میں تحقیق شروع ہو جاتی ہے ۔ اہل تصوف پیر کے لقاء اور صحبت کو چاہے وہ خط کے ذریعے اور غائبانہ اس بیعت کی طرح ہو جیسی غائبانہ بیعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے وقت حضرت عثمانؓ سے خود اپنے دست مبارک پر اپنا دوسرا دست مبارک رکھ کر قبول فرمائی یا عام بیعت کے طریقے کی بیعت ہو ۔ بے حد ضروری خیال کرتے ہیں ۔ پیر کی صحبت کو سب سے زیادہ مفید مانا جاتا ہے۔ یہ صحبت سنت کی تکمیل، اور تابع داری کے لیے بھی ہوتی ہے اور اس معنویت تک پہنچنے کے لیے بھی کہ صحابہ کرام اور اہل بیت اطہارؓ نے بھی قرآن پڑھنے کے ساتھ قرآں لانے والے کے مصحف رخ کو سدا سامنے رکھا تھا۔ اور مبارک قدموں سے لے کر چشم وابرد کے ارشادات تک روز کی زندگی میں رہنما بنایا تھا۔ ایسے لوگ بدعت کو اختیار کرنا کیسا اس کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی اپنے پاس نہیں رکھتے ۔ ان کے خیال میں تو کتاب وسنت کا دائرہ اتنا بڑا اور اتنا وسیع ہے کہ اگر کسی کو ایک طویل زندگی بھی مل جائے تو شاید ان ۶۳ر مبارک سالوں کی پوری پیروی کا حق ادا نہ کر سکے جو سب ہی کے لیے جنم مرن کے ساتھی اور رہنما سال ہیں! معجزاتِ نبویؐ میں سے یقیناً ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ ۶۳ر سال نے ازل سے ابد تک کا احاطہ کرلیا۔

''مٹام'' مٹی کے اس چھوٹے سے مینار کو کہتے ہیں، جو کسی علاقے سے مٹی کھودتے اور ہٹاتے وقت مزدور اور کنٹریکٹر بغیر کھودے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے ذریعہ بعد میں پیمائش کر کے معلوم کیا جا سکے کہ پرانی مٹی کا ڈھیر کتنی اونچائی تک تھا اور کتنی مٹی کھود کر نکالی جا چکی ہے۔ اسلام کے مٹام صوفی حضرات کے طریقے کو اگر لوگوں نے تصوف کے نام سے یاد کیا تو کچھ غلط نہیں کیا ۔ اگر ان حضرات کی شہرت صوفی کی جگہ کسی اور نام سے ہوتی ،تب بھی پرانے اور اصلی اور پورے اسلام کی تلاش میں لوگ انہیں کے پاس آتے ۔

اصلی تعلیمات کے مطابق علاّم کو ایک ٹھوس حقیقت جانتے ہیں۔ اگر صوفیوں کی کچھ باتیں سنت، مہاتماؤں اور بعض دوسری تعلیمات سے میل کھاتی ہیں، تو اس پر حیرت کیوں ہو کہ ہم سب انسانوں کا کھانا، پینا، سونا، جاگنا،زندگی کی ساری ضروریات بھی تو مشترک ہی ہیں۔ اور اسلام نے تو

یہ دعویٰ کبھی کیا ہی نہیں کہ وہ کوئی الگ تھلگ یا نیا مذہب ہے۔ اس نے تو جب کہا یہی کہا کہ پیغمبر آخرزماںؐ سے پہلے اللہ کے جتنے نبی اور پیغمبر آئے، وہ سب برحق تھے۔ ان کی تعلیمات بھی حق تھیں، امتداد زمانہ سے کم ہوگئیں یا بڑھ گئیں، یا بدل گئیں اس لیے اصلی اور پوری تعلیم آخری نبی لائے۔ تاہم یہ بات مان کر چلا جائے تو مضائقہ ہی کیا ہے کہ گھٹ جانے، بڑھ جانے یا بدل جانے کے بعد بھی سابق کے سچے پیغامات میں کچھ نہ کچھ تو اصل بچا ہوگا؟ بس وہی ہم میں اور ان میں مشترک ہے۔ اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

تصوفِ اسلامی کی جتنی بھی تعریفیں اب تک کی گئی ہیں، وہ کم وبیش محدود تعریفیں ہیں۔ یہاں ان کو دہرانا تحصیل حاصل جیسا ہوگا، کیوں کہ یہ تعریفیں عام طور پر دستیاب کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ان میں سے شاید کسی تعریف میں بھی تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے کا پورا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ اس طرح کی کسی تعریف میں تصوف کی پوری سمائی ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیوں کہ اسلامی تصوف کا تعلق بھی ہندوستان کے قدیم فلسفوں اور تصورات کی طرح ''حد'' --- ''بے حد'' اور--- ''ان حد'' سب سے ہے۔ لفظی تعریف کوئی بھی ہو وہ ''حد'' تک تو جا سکتی ہے، لیکن ''بے حد'' اور ''ان حد'' تک اس کی پوری رسائی ممکن نہیں ہے، کیونکہ لفظوں کی تراش خراش میں وقت نے صدیاں ہی کیوں نہ بتائی ہوں۔ لفظ بہر حال محدود ہوتے ہیں۔ اصطلاحیں ،لفظوں کے معنی وسیع اور مخصوص کرنے کے لیے ایجاد اور وضع کی جاتی ہیں لیکن ان کی پہنچ بھی تیر کے روایتی فاصلے کی طرح ناپی جاسکتی ہے اور بس: جبکہ وہ ذات پاک جس کا ذکر منظور ہے، لامحدود ہے اور ایسی ہے کہ اس جیسا اور کوئی ہے ہی نہیں!

لیس کمثله شیٌ

اگر ہم صوفیوں سے منسوب عقیدۂ وحدت الوجود کے قائل نہ بھی ہوں، تب بھی اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ مذہب اب سے ہزاروں ہزار سال پہلے یہ حقیقت دریافت کر چکا تھا کہ جو کچھ موجود ہے وہ لامحدود ہے ، ناپیدا کنار ہے۔ اس کی کوئی نہایت، اورکوئی چھور نہیں۔ نہ اس کی ابتدا کو ناپا جاسکتا ہے، نہ انتہا کو۔

مذہب کی یہ دریافت کوئی معمولی دریافت نہیں ہے۔ اس دریافت نے ہماری زندگی اور اس کی تگ دو اس کے سفر کو ختم نہیں ہونے دیا بلکہ، جاری رکھا ہے۔ جن لوگوں نے مذہب کو ایک نشہ کہا،

ایک افیون قرار دیا، وہ اپنے عارضی اقتدار کے نشے میں اس بات کو فراموش کر بیٹھے۔ اور اپنی ''حدوں'' کے حصار میں ایسے جکڑ بند ہوئے کہ اتنی بات بھی ان کے سامنے نہ آئی کہ آدمی کا سائنسی رویہ اور سدا کھوج میں لگے رہنا دراصل مذہب کی اسی دریافت کا نتیجہ تھا، جس نے پہلے دن شے بتا رکھا ہے کہ جو کچھ موجود ہے، وہ لا محدود اور اس کے امکانات نا قابل شمار ہیں۔ چنانچہ ہماری جدو جہد کتنی ہی بڑھ جائے، اس جدو جہد کا نتیجہ ہمیں کتنا ہی کامیاب نہ کردے، عشق کے امتحانوں اور نئے آسمانوں کی دریافت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، یعنی تلاش کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ حسرت ناکام آرزو کو کہتے ہیں۔ ایک صوفی بزرگ نے حسرت کو زندگی کا جوہر اسی لیے کہا تھا کہ اگر سب کچھ مل جائے تو آدمی مطمئن ہوکر بیٹھ جائے۔ حضرت خواجہ میر درد نے شاید اسی کیفیت کو اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے:

مجھ سے مایوس ہزاروں ہیں تصدّق تجھ پر
تو سلامت رہے، تجھ سے ہے تمنا باقی

بعض ستم ظریف کرم فرما صوفیوں کو قنوطی یاس پسند اپاہج بنا دینے والا کہتے ہیں۔ کاش انہوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی زبان مبارک پر آنے والا یہ مصرع بھی سنا ہوتا:

مرداں ہزار دریا خوردند وتشنہ رفتند

یعنی لوگ ہزار سمندر پی جانے کے باوجود پیاسے چلے گئے) یہ ارشاد گرامی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اشرف المخلوقات آدمی کی زندگی میں Saturation Point کبھی نہیں آتا۔ متلاشی کو تلاش کا پھل اور پیاسوں کو کوزہ بھر پانی نہیں، دریا اور سمندر ملے چلے جاتے ہیں۔

سالک کا سلوک بھی ایک کھوجی کی کھوج ہوتا ہے۔ اور اگر آپ مجھے ایک نیا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دیں، تو عرض کروں کہ سالک بھی ایک سائنٹسٹ ہی ہے۔ مگر وہ سائنٹسٹ جو اپنی تحقیق اور دریافت کو مادّی عالم سے آگے بڑھا کر عالم غیب، روحانی دنیا تک بھی پہنچاتا ہے۔

عالم ناسوت، یعنی ہمارا یہ آنے والا عالم، مادّی دنیا، ایک حد کی دنیا بظاہر دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے روحانی مسافروں یعنی صوفیاء اور سالکوں نے بتایا ہے کہ ''حد'' سے آگے ایک چیز ''بے حد'' بھی ہے۔ اور اس سے بھی آگے ایک اور ہی چیز ''ان حد یعنی لامحدود'' بھی!

جس طرح ہم ”حد“ سے ”بے حد“ اور ”ان حد“ کی طرف جاتے ہیں، یعنی محدود سے لا محدود کی طرف، معلوم سے نامعلوم کی جانب اور سمجھتے ہیں کہ راستہ بس سامنے کا، آگے کا کھلا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ”حد“ اور ”بے حد“ اور ”ان حد“ کی کیفیت ان منزلوں کی بھی ہے جن کو ہم نے بظاہر سر کیا ہوا سمجھ لیا تھا اور جنہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے، یعنی راستہ جس طرح آگے کی راہ میں لا محدود تھا، اسی طرح پیچھے کے رخ جدھر سے ہم آرہے ہیں، اس جانب بھی لا محدود ہے۔ بلکہ دائیں طرف اور بائیں طرف اور اوپر اور نیچے، ہر جہت میں ۔ ہر سمت میں جو کچھ ہے، بس لا محدود ہی ہے، یعنی جن منزلوں کو ہم پایا ہوا اور سر کیا ہوا سمجھتے رہے ہیں، وہ بھی حقیقت میں پوری طرح اور واقعی پائی ہوئی منزلیں نہیں ہیں۔ ان سے واقفیت، ان کی جانکاری محدود ہی ہے۔ ان کے سارے امکانات سے کما حقہ، با خبر نہیں ہوئے، اس لیے آگے بڑھنے کے ساتھ واپس آتے رہنا بھی ضروری ہے، یعنی راستے کی ابتدائی درمیانی یا آگے کی جس منزل پر بھی ہم کھڑے ہوتے ہیں خود اسی مقامی اور بظاہر چھوٹی سی جگہ کے امکانات بھی لا محدود اور قطعی ان گنت اور بے شمار ہوتے ہیں۔ گویا بڑائی، بزرگی، عظمت، کمال اور کامیابی چھوٹی چیز سے بڑی چیز کی طرف جانے ہی میں نہیں ہے، بلکہ بڑی چیز سے چھوٹی چیز کی طرف آنے میں بھی ہے۔ قطرہ، سمندر، ذرّہ، پہاڑ اور کرن بھی آفتاب ہیں۔ اگلے وقتوں میں یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ اس ایٹمی دور نے اس بات کو سمجھنا آسان کردیا ہے۔ لوگ اس مشہور بات سے بھی خوب واقف ہوگئے ہیں کہ دور بین ہی نہیں، خورد بین بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ دریا کے فوائد کی عمومیت نہروں، نالیوں پانی کے چھوٹے چھوٹے قطروں سے، پہاڑوں کی افادیت ان کی ٹوٹنے چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بننے سے اور آفتاب اور سورج کا فیض اس کی شعاعوں اور کرنوں سے عام ہوتا ہے۔

ان لا محدود عالموں اور کیفیات کو پیدا کرنے والا خالق خود کیسا بے مثال اور ہمارے خیال اور گمان سے ماوراء ہے۔ اس کا بھی اندازہ لگانا ممکن بات نہیں ہے۔ لیکن یہ دریافت بھی مذہب ہی کی دریافت ہے۔ اور بڑی اہم دریافت ہے کہ اس بے مثل ذات یعنی حق کو اس کی مخلوق ہی میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ وہ زمان ومکان (Time and Space) سے بے نیاز ہے، لیکن ہر جگہ موجود بھی ہے۔ اگر ہم اس کی مخلوق، پیدا کی ہوئی کائنات یا کائناتوں میں اس کا ادراک نہ کرسکیں اور صرف خلق کو دیکھتے رہیں، خالق کو نہ دیکھیں اور حق کو اس خلق کا غیر سمجھیں، تو اس کو صوفیوں کی اصطلاح میں

فرق کہا جاسکتا ہے اور اس کے مقابلے میں جمع آتا ہے، یعنی سالک،حق کا متلاشی، خدا کی راہ چلنے والا حق کو دیکھے،حق کا مشاہدہ کرے اور خلق اس کی نظر سے غائب ہوجائے۔ اس طرح خود حق خلق کا حجاب ہوجاتا ہے۔ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور پورے تیاگ کے ساتھ یعنی راہب سا بن کر اس ایک ذات پاک میں محو رہے تو وہ فنا کا مرتبہ تو حاصل کرلیتا ہے، کہنے والے اسکو فنافی اللہ بھی کہتے ہیں، لیکن ایک بات اس کے سوا اور بھی ہے اور وہ یہ کہ خلق کو حق کے ساتھ اسی طرح دیکھا جائے کہ حق کا مشاہدہ تمام موجودات میں ہو اور یہ دیکھا جائے کہ حق ہر جگہ ایک علیحدہ صفت اور ایک الگ شان کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ یہ جمع الجمع ہے اور یہ مقام بقا باللہ کا ہے۔ اس سے اونچا اور کوئی مقام نہیں۔ کیوں کہ اس میں جو شئے جیسی ہے، ویسی ہی نظر آتی ہے۔ سائنٹفک اصول بھی شاید یہی چاہتے ہیں کہ جو چیز جیسی ہے اس کو ہم اسکی اپنی اصلی کیفیت اور حالت میں جان لیں۔ روحانی اصطلاح میں یہ بات اس طرح کہی جائے گی کہ سالک وحدت کو کثرت میں اور کثرت کو وحدت میں دیکھتا ہے، اس طرح کہ نہ خلق،حق کا حجاب ہوتی ہے اور نہ حق خلق کا حجاب ہوتا ہے۔

چشتی نظامی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ نے فرمایا ہے کہ کمال یہ ہے کہ آدمی سرحدفنافی اللہ پر پہنچ کر خدا کی بقا سے باقی ہوجائے۔ پہلی سیر (فنا فی اللہ) کو سیر الی اللہ اور دوسری سیر (بقابا اللہ کوسیر فی اللہ) کہتے ہیں پہلی سیر کی انتہا ہے۔ دوسری سیر کی کوئی انتہا نہیں!

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کہتے ہیں کہ انبیاء کو علیحدہ کرکے واصلوں یعنی خدا تک پہنچے ہوئے لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک مشائخ صوفیاء جنھوں نے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری اتباع اورتقلید سے وصول کا مرتبہ حاصل کیا اور اسکے بعد انہیں مخلوق کی ہدایت پر مامور کیا گیا۔ یہ لوگ کامل اور مکمل (مکمل کرنے والے) کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ فضل وعنایت ازلی سے عین جمع وتوحید کے دریا میں ڈوب جانے کے بعد تفرقے کے ساحل پر نکلتے ہیں اور فنا کے بعد انہوں نے بقا حاصل کی ہے، تا کہ خلق کو نجات کا راستہ بتائیں اور بلند درجات تک پہنچائیں۔ دوسرا گروہ ان واصلین کا ہے جو واصل ہونے کے بعد اس عالم کی طرف لوٹ کرنہیں آئے اور فنا فی اللہ اور بقا باللہ تک نہ پہنچے۔

شاید اسی نظریئے کو اچھی طرح نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کو غلط فہمی ہوئی اور وہ تصوف کو اپنے تصوف خودی کے خلاف سمجھ بیٹھے۔ غالباً حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے

یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج ہوئی اور وہ دوبارہ انسانوں کے درمیان زمین پر واپس آ گئے۔ اگر مجھے معراج ہوتی تو میں واپس نہ آتا۔''

اگر یہ بات حضرت گنگوہی سے منسوب نہ ہو، کسی اور صوفی سے منسوب کی جائے اور اس کو بحث کی خاطر درست بھی تسلیم کرلیا جائے، تو اس کی تاویل بھی کی جاسکے گی کہ یہ ایک صوفی کا ذاتی تجربہ اور ذاتی پسند اور ترجیح کی بات ہوسکتی ہے کہ وہ راہ سلوک کے ایک درمیانی مقام اور منزل کے لطف اور آنند کو پسند کرے اور وہیں پڑا رہنے کی سوچے۔ لیکن سلوک سے واقفیت تو یہی ظاہر کرتی ہے کہ اس طرح کی کیفیت ایک درمیانی اور بیچ کی منزل کی کیفیت ہے۔ منزلیں اس سے آگے اور بھی ہوتی ہیں۔ اور کامل لوگ ان سب کو سر کرنے اور ہر منزل پر پہنچ جانے کے باوجود پھر واپس ہوتے ہیں اور پلٹتے ہیں کہ اپنے کام کو پورا کریں۔ انبیاء کا درجہ اولیاء سے بلند اس لیے مانا جاتا ہے کہ وہ خدا رسیدہ ہونے کے باوجود خدا کی مخلوق کی ہدایت اور رہنمائی میں کوشاں رہتے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بہت لوگوں کو خلافت عطا فرمائی۔ ان کا ایک خلافت نامہ جو انہوں نے حضرت خواجہ شمس الدین یحیٰؒ کو دیا تھا اور صاحبِ سیر الاولیاء امیر خورد کرمانی علیہ الرحمہ کی مہربانی سے ہم تک پہنچا ہے، اس میں حضرت خواجہ نے تلقین کی بنیاد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث شریف کو بنایا ہے:

والّذی نفس محمد بیدہ لئن شئتم لا قسمن لکم ان احبّ عباد اللّٰہ الی اللّٰہ الّذین یحبّون اللّٰہ الی عباد اللّٰہ ویحبّون اللّٰہ الی اللّٰہ۔

ترجمہ: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ اگر تم چاہو تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ بندگان خدا میں سب سے زیادہ خدا کے دوست وہ لوگ ہیں جو خدا کو دوست رکھتے ہیں، اس کے بندوں کے ذریعے اور جو بندگانِ خدا کو دوست رکھتے ہیں خدا کے واسطے!

ہندوستان کی قدیم روحانی تعلیم میں جس چیز کو کرم مارگ کہا جاتا ہے، وہ بھی شاید اسی طرح کی ایک بات ہے۔

مسلمان صوفیاء کے نزدیک عالم ایک ٹھوس حقیقت ہے، عالم اور انسان عین حق یا مظہر حق ہیں۔ قرآن کا فرمان بھی یہی ہے کہ موجوداتِ خارج اور ظاہر میں ہوں یا باطن میں، زمانی ہوں یا مکانی،

سب کی حقیقت اللہ ہی ہے!

هو الاوّل والآخر والظّاهر والباطن

لا الٰہ کا مطلب صوفیاء کے اس گروہ کے نزدیک جس سے میں وابستہ ہوں، یہ ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے، نہ مقصود ہے اور نہ موجود!

اللّٰه نورالسّمٰوٰت والارض ہے، یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور نور کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ النور هوا لظّهور، والظّهورهو الموجود! نور کے معنی ظہور ہیں اور ظہور اور وجود ایک ہے۔ وہی ایک ذات ہر شئے کو محیط ہے۔ ہر روپ اس کا روپ ہے۔ ہر شان اس کی شان ہے۔ جو کچھ دیکھو اس سے دیکھو، اس میں دیکھو اور اسکی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں کرو!

خدا کی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں کرنا، نہ قرآن کے خلاف ہے، نہ حدیث کے درس سے ہٹی ہوئی کوئی چیز! قرآن نے بار بار کائنات میں غور کرنے اور دنیا کی سیر کی دعوت دی ہے۔ یہ سیر سیر الیٰ الارض یا الی السّماء زمین اورآسمان کی سیر نہیں حقیقت میں سیر الیٰ اللہ ہے۔ یہ اسلام ہے، یہ تصوف ہے۔

مگر کون سا اسلام؟ تصوف کے وابستگان سے زیادہ کس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ تصوف اسلام کی ظاہری تعلیم سے علیحدہ کسی اورخفیہ یا کسی حسن بن صباح کی باطنی تعلیم کا نام ہرگز نہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے خود اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا ہے:

'' حضرت خضرؑ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت نے جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ بغیر شرعی عذر کے ختم ہوجائیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں احکام شریعت کے ساقط ہونے کا قائل کیسے ہوسکتا ہوں؟ ہمارے شیخ روز بہان سے مصر میں کئی بار کہا گیا کہ آپ نماز چھوڑ دیں کہ اس کی آپ کو ضرورت نہیں، فرمایا کہ مجھ میں نماز چھوڑنے کی طاقت نہیں ...... میں نے بعض طریقت کے جاہلوں کو دیکھا ہے کہ انہوں نے نماز ترک کردی ہے، وہ کہتے ہیں کہ سالک کے لیے واجب ہے کہ ہر وقت نماز میں رہے۔ لیکن ان بے چاروں کو معلوم نہیں کہ نماز کے بھی جسم اور روح دونوں ہوتے ہیں۔ اس کا جسم ارکانِ نماز میں اور اس کی روح حضور قلب ہے جس طرح ہم روح کو انسان نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ مجموعی انسان کا حصہ ہے، اس طرح نماز کی بھی روح ہے، لیکن جب تک روح کا تعلق قالب (جسم) سے باقی ہے، واجب ہے کہ قالب کی زینت ارکان نماز سے اور روح کی زینت حضور

قلب سے رہے!

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ہی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خواجہ ابو المویدؒ نے اپنے والد سے پوچھا کہ العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں) سے کون سے علماء مراد ہیں؟ فرمایا یہی علماء جنہیں تم دیکھ رہے ہو!

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء نے حضرت ابوسلیمان رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی نقل فرمایا ہے کہ جو کہتے تھے جو بات بھی میرے دل پر گزرتی ہے میں اسے قبول نہیں کرتا، جب تک کہ دو گواہ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ اس پر گواہی نہ دیں۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے جانشین اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے پیر و مرشد حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی نور اللہ مرقدہ نے اسی تلقین کو بنیاد بنا کر اعلان فرمایا تھا کہ اصل حجت کتاب وسنت ہیں۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی، حضرت کے اس ارشاد نے جاہل پیروں کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روک دیا!

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے ایک اور بڑے بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے بارے میں اس احتیاط کے ساتھ روایت بیان کی کہ:

''میں نے سنا ہے اور ذمہ داری روایت کرنے والے پر ہے کہ ایک روز حضرت شیخ زکریا ملتانی قاضی قطب الدین کا شانیؒ کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے۔ قاضی صاحب صبح کی نماز کی امامت کررہے تھے۔ ایک رکعت پڑھ چکے تھے۔ شیخ دوسری رکعت میں پہنچے اور شریک ہوگئے۔ جب قاضی قطب الدین التحیات میں بیٹھے تو اس سے پہلے کہ سلام پھیریں، شیخ بہاء الدین کھڑے ہوگئے اور اپنی نماز پوری کی۔ جب نماز سے فارغ ہوگئے، تو قاضی قطب الدین نے شیخ سے کہا کہ نماز کے سلام سے پہلے کیوں کھڑے ہوگئے۔ ممکن تھا کہ امام سے سہو ہوا ہوتا اور وہ سجدہ سہو کرتا۔ جب آپ سلام سے پہلے ہی کھڑے ہوگئے، تو سجدہ سہو نہیں کرسکتے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر کسی کو نور باطن سے معلوم ہوجائے کہ امام سے کوئی سہو نہیں ہوا ہے، تو اس کا کھڑا ہوجانا جائز ہے۔ قاضی قطب الدین بولے کہ ہر وہ نور جو شرع کے موافق نہ ہو وہ ظلمت (اندھیرا) ہے!

حضرت سلطان المشائخ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ سالک ترقی کرکے طریقت تک پہنچتا ہے اور طریقت سے ترقی کرکے حقیقت تک رسائی پاتا ہے۔ اگر حقیقت کا اعلیٰ مقام ملنے کے بعد اس سے کوئی بھول چوک ہوجائے، تو اسے revert کیا جاتا ہے اور حقیقت سے نچلے مقام طریقت میں

ڈال دیتے ہیں اور وہاں بھی کوئی گناہ اور غلطی ہوجائے تو اس سے نچلے درجے شریعت میں پہنچا دیتے ہیں، لیکن شریعت کے گناہ اور غلطی کا خمیازہ دوزخ کے گڑھے کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے، کیوں کہ شریعت کے نیچے اس گڑھے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ احتیاط شریعت کی حفاظت میں ضروری ہے۔

شریعت کو چھوڑنا دوزخ کو دعوت دیناہی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ رسولؐ کی نعوذ باللہ دشمنی مول لینا ہے اور ہر شخص کو کیا صوفی اور کیا غیر صوفی اس سے پناہ مانگنی چاہیے اور جب صورتِ حال یہ ہوتو تصوف کی تاریخ بھی اس تاریخ سے مختلف کوئی تاریخ نہیں ہوسکتی جس کو اسلام کی تاریخ کہا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کا بیان اگر تصوف اور اہل تصوف کے ذکر کے بغیر ہوتو کوئی بھی ذی ہوش اور معمولی سا علم رکھنے والا بھی اسے اسلام کی اور مسلمانوں کی پوری تاریخ ماننے کو تیار نہ ہوگا۔ اس لیے جس طرح خدا کی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں کی جاتی ہے، تاریخ تصوف کی تلاش بھی اسلامی تاریخ کے بڑے دائرے کے اندر رہ کرکرنی چاہیے، لیکن اسے کوئی علیحدہ فرقہ مان کر نہیں کہ اسلام اور اس کا حقیقی روپ ''تصوف'' کسی بھی فرقہ بندی کا قائل نہیں، بلکہ اہل تصوف ہی وہ مسلمان ہیں جو نہ اپنے آپ کو کسی خانے اور ڈبے میں بند رکھنے میں یقین رکھتے، نہ کسی اور کو کال کوٹھری میں ڈال کر رکھنا چاہتے ہیں۔ جو آنکھیں آنکھ والوں کو دیکھنے کی عادی رہی ہیں، ان کی بصیرت اور بصارت بشری حد بندیوں کے باوجود دور بینوں سے زیادہ دیکھتی ہیں اور جہاں تک دیکھتی ہیں، وہیں تک اپنے اور دوسروں کے دائرہ عمل کو وسیع رکھنا چاہتی ہیں۔ جس کو یقین نہ آئے وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ کا واقعہ پڑھے کہ جب حضرتؒ کو ایک حجرے سے زنجیر کھڑکنے کی آواز آئی تو انہوں نے چونک کر پوچھا کہ یہ زنجیر کی آواز کیسی ہے؟ خادموں نے عرض کیا کہ کسی نے لنگر کے خزانے سے قرض لیا تھا۔ وعدے کے مطابق واپس نہیں کیا۔ اسلئے منتظمین نے اس زمانے کے دستور کے موافق اس کو حجرے میں قید کردیا ہے۔ حضرت سخت ناراض ہوئے اور اسی وقت اس قرضدار کو یہ کہتے ہوئے آزاد کرایا کہ قرض کہتے کسے ہیں؟ مال سب اللہ کا ہے۔ کچھ میں کھاتا ہوں، کچھ تم لوگ کھاتے ہو۔ کچھ اس بے چارے نے کھالیا۔ کون سا غضب ہوگیا؟ خبردار! آئندہ خانقاہ میں ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے۔

فیاء نے روز مرہ کی زندگی کے معاملات ہی میں وسیع النظری سے کام نہیں لیا، ذیلی اور ضمنی فقہی

اختلافات کو بنیادی باتیں بنا کر فساد پھیلانے والوں سے بھی بچتے رہے اور جہاں تک ہوسکا رعایت اور رخصت کے مسنون طریقے سے کام لیا۔ اسی لیے اسلامی تاریخ کے بڑے کینوس پر صوفیاء کو ان کے حریفوں اور مخالفوں کے سامنے رکھ کر دیکھنے میں بھی مضائقہ نہیں ہے کہ چیزیں Contrast اور ضد سے بھی پہچانی جاتی ہیں: نیز تصوف کی تاریخ کا مطالعہ اسلامی تاریخ کے تحت بہت سے ذیلی عنوانوں کے تحت کیا جاسکتا ہے۔ مثلا یہ کہ صوفیا نے اسلام کو کس طرح سمجھا، کس طرح سمجھایا، اسلام کو پھیلانے میں کتنا حصہ لیا، تبلیغ کے لیے کون کون سے طریقے اختیار کیے؟ انہوں نے مسجد کے ہوتے ہوئے خانقاہ کیوں بنائی، مسجد ہی کو خانقاہ کی حیثیت سے کیوں نہ استعمال کرتے رہے۔ اس سے کیا فائدہ یا کیا نقصان ہوا؟ مختلف سلسلوں کی داغ بیل کس طرح پڑی؟ ان سلسلوں کی ضرورت اور معنویت کیا رہی؟ غرض کہ بے شمار عنوانات کے تحت اس تاریخ کا مطالعہ ہوسکتا ہے۔

اس تاریخ کے مطالعے کے دوران حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ خانقاہ پر معترض ہونے والے بہت آسانی سے یہ بھول جاتے ہیں اور انجان ہوجاتے ہیں کہ جس مذہب نے خاص شرطوں کے ساتھ ہی سہی لیکن حج کے بنیادی اسلامی رکن سے عورتوں کو سفر سخت دشواری اور خطرناکی کے باوجود محروم نہیں کیا اور کعبۃ اللہ کے حرم کے پٹ عورتوں پر نہیں بھیڑے، جس پیغمبرؐ کی مسجد کا ایک دروازہ باب النساء عورتوں کا دروازہ کہلاتا رہا اور کہلاتا ہے، اس کے پیروکار ایک ایسے سماج کی تخلیق کا سبب بن گئے جس میں عورت اور مسجد دونوں ایک دوسرے کے لیے شجر ممنوعہ ہو کر رہ گئے۔ جس مسجد میں جلیل القدر خلیفہ اور صحابی کے قتل اور شہادت کے باوجود کسی کے لیے جگہ مخصوص نہیں ہوئی تھی، اسی میں امراء کے لیے خاص جگہیں رکھی گئیں۔ جو منبر عبادت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے قائم ہوا تھا، وہ بادشاہوں کا خطبہ پڑھنے اور حریفوں کو کوسنے کی جگہ بنادیا گیا۔ جو بیت المال حلال آمدنی کا خزانہ تھا اور امت کے ضرورتمندوں اور زندگی کو عبادت بنانے کے کاموں میں خرچ ہوتا تھا، ناجائز کمائی کا دفینہ بے رحم بادشاہوں کی ذاتی طاقت واقتدار کا ذریعہ اور خبر نہیں کیا کیا قرار پا گیا اور کسی کو آنکھوں کے یہ شہتیر نظر نہ آئے۔ دکھائی دیا تو یہ دکھائی دیا کہ مسلمان عوام اور غیر مسلمان حضرات خانقاہوں، میں یکساں بھیڑ کیوں لگانے لگے۔ کہیں خانقاہ کا وجود انہیں اس لیے تو نہیں کھٹکتا رہا کہ وہاں کے حاضر باش سرکاروں درباروں کے خود ساختہ اسلام، منبر سے کی جانے والی دماغی دھلائی اور اسی طرح کی بہت سی باتوں سے اپنے آپ کو بچاتے رہے تھے!

خانقاہ کی ضرورت کے سلسلے میں مجھے اس وقت صرف اتنا یاد آرہا ہے کہ مسجد کے مخصوص آداب اورشرائط بھی ہیں۔ ابتدا میں جب وسائل محدود تھے۔ مجبوری کے تحت رُخصتیں بھی تھیں۔ بعد میں ان کی ضرورت نہیں رہی۔ یا یہ ضرورت پیدا ہوگئی کہ آداب وشرائط کا لحاظ نہ رکھ سکنے والے اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ ان کے لیے الگ اور بڑی جگہ چاہیے۔ چشتیوں کے نظامیہ نصیر یہ سلسلے کے ایک مشہور بزرگ حضرت مولانا فخر الدین محبّ النبیؒ ،حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اورحضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے ہمعصر ہیں۔ ان کا زمانہ آتے آتے سرکار دربار نے سماج کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ لوگ شرابیں پی پی کر درانہ مذہبی علماء کے پاس آجاتے تھے۔ ایسا ہی ایک شخص حضرت مولانا فخر کی خدمت میں بھی آتا تھا۔ اس عادی نشے باز سے نشہ چھڑانا آسان کام نہ تھا۔حضرت مولانا موقع کی تلاش میں تھے اور وہ موقع اس وقت آیا جب ایک روز یہ شخص اتنی زیادہ شراب پی کر آیا کہ آتے ہی قے کرنے لگا۔ حضرت نے صوفیوں کی اور اہلِ اسلام کی قدیم اورمسنون روایت کے مطابق اس سے نفرت کا برتاؤ نہیں فرمایا۔ اس کو آگے بڑھ کر خود سنبھالا اور اس کوشش میں حضرت کا سارا لباس غلاظت سے آلودہ ہوگیا۔ عام لوگوں کوغصہ آیا،مگر حضرت کی آنکھوں میں آنسو آئے اور ارشاد کیا کہ میں ابھی جاکر کپڑے بدل لوں گا ،لیکن یہ تو سوچو کہ اگر میں اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دینے کا عادی ہوتا تو یہ میری باتیں اتنے دن تک کیسے سنتا؟ اس کا تو دل ٹوٹ جاتا۔ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا مشکل کام ہے! حضرت تو یہ ارشاد کرکے قیام گاہ پرتشریف لے گئے۔حضرت کے پیچھے شرابی کو ہوش آیا اورحواس درست ہونے کے بعد اسے پتہ چلا کہ نشے نے آج کیا غضب ڈھایا ہے،تو اسے بے حد شرم آئی۔ اسی وقت ہمیشہ کے لیے شراب سے توبہ کرلی۔ یہ کام نہ مسجد میں ممکن تھا، نہ ہزاروں وعظ ایسا اثر دکھا سکتے تھے، جو خانقاہ کے ایک طرزِعمل نے کردکھایا۔

زیرِ بحث موضوع کے تحت اس مسئلے پر گفتگو ابھی باقی ہے، کہ تصوف کی تہذیب کس نے ،کس کس طرح کی۔ اس تہذیب کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ...پیش نظر مضمون کا عنوان کا یہ مقصد تھا کہ معلوم کیا جائے کہ تصوف بنایا سنوارا کس نے ہے؟ تو میں... یہ عرض کرسکتاہوں کہ جب اسلام کو بنانے سنوارنے والی بس ایک مبارک ذات تھی، یعنی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود باجود ! تو تصوف کے لیے کوئی اور بنانے سنوارنے والا کہاں سے آجاتا؟ تعمیر اور تزکیے اورتجلّی کا سارا کام تو ہو ہی چکا تھا، اسلام کی نوک پلک درست کرنے میں کوئی

بات چھوڑی گئی ہوتی تو کسی مشاطگی کی ضرورت اور کسی beautician کی حاجت بھی رہتی۔ حضرت قبلہ جہان وجہانیان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ساری آرائش اور ساری تہذیب بہ نفس نفیس خود ہی فرمادی تھی۔ مشاطگی ادھورے حسن کو پورا حسن بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں حسن پہلے ہی سے مکمل ہو وہاں غازہ وسرخی کچھ بناتے نہیں، کچھ بگاڑ ہی دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اسلام میں ہر بدعت نامشروع اور ناپسندیدہ قرار پائی اور اہل تصوف نے ذکرِ الٰہی تک کے ان طریقوں کو قابلِ تقلید نہیں مانا جنکی سند پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتی نہ ہو اور متصل نہ ہوتی ہو! دین سیکھنے اور سکھانے کے لیے تواتر اور تسلسل اور نمونے کی شرط بھی اسی لیے رکھی گئی ہے کہ قرآن کو محفوظ رکھنے کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ نے فرمالیا تھا، حدیث شریف کو صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے محدثین نے دنیا کی تاریخ میں ایک بے مثال طریقے سے پورے صحت کے ساتھ قائم وبرقرار رکھا، لیکن قرآن وحدیث سے زندگی نے جو خوشنما پیکر تراشا تھا، اس کا نمونہ بھی جوں کا توں ہر زمانے میں موجود رہنا ضروری تھا۔ سو صوفیائے کرام کی صورت میں موجود رہا۔ اسلام کے قرن اوّل کے بعد جو زمانہ آیا وہ ذاتی مصلحتوں اورخودغرضیوں سے خالی نہیں رہا تھا۔ یہ زمانہ سچے مسلمانوں کے لیے سخت ترین امتحان کا زمانہ تھا۔ کربلا کی قربانیاں اس امتحان میں کامیاب رہنے ہی کے لیے دی گئی تھیں۔ ملوکیت اور بادشاہ گردی کے طوفان اور آندھیاں اسلام کے نومولود ہرے بھرے پودے کے لیے سخت نقصان دہ تھیں۔ صوفیاء نے جہاں تک ہوسکا سرکار دربار کے مضراثرات سے مسلم سوسائٹی کو بچایا اور ملوکیت کی زبردست یلغار کو روکنے کے لیے سپر بن گئے۔ خانقاہ اس دور میں مسجد کے لیے ایک بیرونی حصار تھی اورر وحانیت کے نازک پودوں کے لیے ایک گرین ہاؤس اور نرسری! سیاسی استبداد کو جھیلنے کے لیے صوفیاء کی سی مضبوط شخصیتیں اور خانقاہ کا سا محفوظ اور مامون چار دیواری رکھنے والا ادارہ نہ ہوتا تو خدا جانے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا۔ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی وہ بزرگ ہیں جن سے بادشاہِ وقت، سلطان محمد تغلق، بظاہر عقیدت رکھتا تھا اور اپنی حکومت کو ان کے پیرو مرشد، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ، کے ایک آشیرواد اور Blessing کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے حضرت پیر نصیرالدینؒ اور ان کے پیر بھائیون کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ اس کی پوری تفصیل حضرت امیر خورد کرمانی کی کتاب سیرالاولیاء میں موجود ہے۔ حضرت پیرنصیر الدینؒ کے جانشین حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے بھی دکن کے بادشاہ بظاہر عقیدت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت کو شہر کا قیام

چھوڑ کر باہر تشریف لے جانا پڑا۔ سچ پوچھیئے تو سلطانوں کے عام مذہب کی طرح اسلامی دور کے حکمرانوں کا اصل مذہب بھی ان کے تخت کی مصلحتیں رہیں۔ اسلام کا نام ان کی زبان پر اس وقت آتا، جب اسلام ان کا مخالف نہ بنتا ہو، یا اسلام کا نام لینے سے انہیں کچھ سیاسی فائدہ پہنچتا ہو، یا پھر جب مذہب ان کی ایک پرائیویٹ چیز بن کر رہ سکتا ہو۔ حالانکہ دین کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں تمام وکمال مانا جائے۔ خانقاہیں ایسے ہی مراکز کی حیثیت رکھتی رہی ہیں جہاں مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے یا یادِ الٰہی کے اعتکاف سے فارغ ہو کر عوام دین کی باقی باتیں ارادے یعنی ارادت اور کوشش یعنی جد وجہد سے اور کچھ وقت لگا کر سیکھیں۔ اگر مسجد میں یہ کام عہدِ نبوی کی طرح ہوتا رہتا تو مسجدیں ہی خانقاہ بھی بنی رہتیں۔ مگر افسوس تو اسی بات کا ہے کہ مسجد کی خانقاہیت کو ختم کردیا گیا۔ اور عورتوں کو مسجد سے دور کر کے گویا ہر نئی نسل اور نئی پیڑھی پر ''اسلامی گود'' کا دروازہ بند ہوا۔ مگر ایک در بند ہوتو اللہ تعالیٰ ستر در کھول بھی دیتا ہے۔ مسلمان عورتیں بھاگوان تھیں کہ ان پر یہ ستر خانقاہ بن کر کھل گئے اور نسوانی جبلت اور تقاضے انہیں شرک کے مرکزوں میں نہ پہنچا سکے!

میرے اس مضمون کے عنوان کا آخری رکن ''رسم'' اور حقیقت سے متعلق ہے۔ بے چاری رسوم کو آج کل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بدنام کردیا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ اتنی بری ہیں نہیں جتنا برا ہم نے انہیں سمجھ لیا ہے۔ رسمیں اچھی بھی ہوتی ہیں، بری بھی ہوتی ہیں۔ اچھی رسموں کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے دین سے واقف بزرگوں نے انہیں اختیار کیا ہے۔ بری رسموں کا ترک لازم ہے اور صوفیاء نے انہیں ترک کیا ہے۔ خود تصوف چونکہ رسم نہیں ہے، اس لیے اس کے ترک واختیار کا سوال بھی اس طرح نہیں اٹھتا جس طرح اٹھایا جارہا ہے۔

رسمیں اچھی نہ ہوتیں تو نماز کے لیے ظاہری ارکان کیوں مقرر ہوتے؟ رسوم نے خدا کی عبادت اور یاد کو ایک تجریدی آرٹ اور Abstract سی چیز بننے سے روکا ہے۔ رسم تو وہ چیز ہے جس کے ذریعہ شریعت نے عبادت کو خط وخال اور مخصوص ظاہری صورت عطا کی ہے۔ ہر رسم عبث چیز ہے اور عبث ہونیکی بناء پر نا مناسب ٹھہرتی تو قرآن یہ نہ فرماتا کہ:

انّ الصّفاء والمروة من شعائر اللّٰه فمن حجّ البيت اواعتمر فلا جناح عليه ان يّطوّف بهما۔

(صفااور مروہ من جملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں۔ سو جو شخص حج کرے بیت (اللہ) کا یا

(اس کا) عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں۔ ان دونوں کے درمیان آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے۔) (ترجمہ: مولانا اشرف علی تھانوی)

اس مبارک آیت میں ''فلا جناح علیه'' (اس پر ذرا بھی گناہ نہیں) کے الفاظ خاص طور پر غور کے قابل ہیں یہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن کے نزول سے قبل کچھ عجب نہیں کہ بعض لوگوں کے ذہن میں الجھن پڑتی ہو کہ نعوذباللہ سعی کرنے سے فائدہ ہی کیا؟ اور خدانخواستہ جب فائدہ نہیں تو یہ گناہ کی چیز تو نہیں ہوگئی۔ قرآن کی اس آیت نے صرف اسی زمانے کی الجھن کو دور نہیں کیا، بعد کے زمانے کی الجھنوں کو بھی سلجھا دیا۔

اہلِ تصوف اپنی تمام رسوم کی سند علمائے ظاہر اور علمائے معروف کی طرح قرآن وحدیث سے لاتے ہیں اور جس رسم کی کوئی سند نہ ملے اس کو کوئی بھی معتبر اہل تصوف معتبر نہیں جانتا! جس چیز کی للّٰہیت روز مرہ کی زندگی اور اس کے تعینات اور تنزلات سے دور ہوتی اور ایک خالص تجریدی حیثیت رکھتی تو غالباً نہ کعبے اور نہ مسجد کی اجازت ملتی، نہ طواف اور سعی کی، نہ رمی جمار اور کعبے کے غسل اور احرام کی اور نہ انسانوں کے جسم پر لپیٹے جانے والے بے سلے سفید احرام کی !

سب جانتے ہیں کہ کعبے کا دائمی لباس تو کالے غلاف کا ہے، لیکن حج کے ایام میں ایک نیا کپڑا احرام کے نام سے بھی اس کے گرد لپیٹا جاتا ہے۔ کعبے کا غسل بھی ہوتا ہے۔

اگر اسلام کے مرکز میں قائم اور جاری ان رسوم کو دھیان میں رکھا جائے تو نہ یہ کہ صرف تصوف کو عبث رسوم کا مجموعہ کہنے سے گریز کیا جائے گا بلکہ اہل تصوف کے یہاں رائج رسوم پر بھی شبہے کی وہ نظریں نہیں ڈالی جائیں گی جو ڈالی جارہی ہیں۔ غلط فہمیاں زیادہ تر ناواقفیت کی بناء پر ہیں اور تھوڑی نہیں بہت ہیں۔ خدا کرے وہ دور ہوسکیں اور موجودہ زمانے میں اور آنے والے زمانے میں سب مسلمان مل کر اسلام کا وہ حق ادا کرسکیں جو گذشتہ زمانے میں انہوں نے ادا کیا ہے۔ مگر یہ اسی وقت ہوسکے گا جب اس واضح بات کو سمجھ لیا جائے کہ تصوف پورے اور اصلی اسلام کی طرف لے جانے کا ایک عمل ہے۔ کوئی علیحدہ فرقہ، کوئی علیحدہ فلسفہ کوئی علیحدہ عقیدہ نہیں ہے۔

نہ تو یہ انار کی ہے، نہ افراط وتفریط ۔ یہ تو ایک خالص سائنسی رویہ ہے جو ہم کو کتابی اور نظریاتی فارمولوں سے آگے بڑھا کر تجربے سے بھی گزارتا ہے۔ کون سا صوفی آج تک ایسا ہوا ہے جس نے محض کتاب پڑھ کر سلوک طے کرلیا ہو۔ یا کون سا عارف ایسا گزرا ہے جس نے تجربات کے سمندر کو

عبور کیے بغیر کسی نتیجے تک رسائی حاصل کی ہو؟ سلوک کو بیان کرنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے بڑے اچھوتے، نادر اور دلکش اسلوب اختیار کیے ہیں۔ اگر آج کے دن مجھے کسی طبی لیبا ریٹری کے تشبیہہ و استعارے کو استعمال کرنے کی اجازت ملے تو عرض کروں گا کہ سلوک کی ساری نسخہ سازی اور سارے تجربات نہ تو برٹش فارما کو پیا کے تحت ہوتے ہیں، نہ نہایت مفید اور قابل احترام انڈین فارما کو پیا کے تحت۔ یہ تو شروع سے آج تک صرف اورصرف شریعت اسلامیہ اور طبّ نبوی کے تحت ہوتے آئے ہیں، ہورہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

جی چاہتا ہے کہ ان گذارشات کا اختتام خود حضرت خواجہ گیسو دراز کے ذکر پاک پر ہو کہ مجھے اپنے مضمون کو سمیٹنے اور اس کا خلاصہ بیان کرنے کے لیے اس سے بہتر اور اتنے کم الفاظ اور کہیں نہیں مل رہے ہیں۔ ۲۹/ ماہ رجب ۸۰۲ھ جمعہ کا دن ہے۔کوئی شخص حضرت سے مرید ہونے آتا ہے۔ حضرت اس کا ہاتھ تھامتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ اس ضعیف کے خواجہ اور سلسلے کے تمام مشائخ سے عہد کرو کہ تم اپنی آنکھ اور زبان کو قابو میں رکھو گے اور شریعت پر عمل پیرا رہوگے۔کیا تمہیں یہ عہد کرنا منظور ہے مرید کہتا ہے جی ہاں قبول ہے: تصوف کی پوری تاریخ وتہذیب، رسم وحقیقت بس انہی دو بولوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو میں دو بول پڑھنے یا پڑھوانے کا محاورہ نکاح اور گھر بسنے سے متعلق ہے۔تصوف بھی شریعت کو شریکِ حیات بنانے کا قصہ ہے! نکاح اور گرہ کی رسم کے ساتھ!

حواشی

۱۔ سورہ مائدہ آیت ۳

۲۔ تاریخ مشائخ چشت، جلد اوّل ، باب دوم، صفحہ ۴۰

۳۔ ایضاً

۴۔ کتاب اللمع ،صفحہ ۲۲

۵۔ مصارع العشاق ، (مطبوعہ الجوائب قسطنطنیہ)صفحہ ۲۲۴، تاریخ مشائخ چشت ،صفحہ ۴۴

۶۔ (بلوغ الادب، اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، جلد اوّل صفحہ ۵۲۹،مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور،

۷۔ یہ روایت سند متصل کے طور پر ابو مخنف سے ہشام بن عروہ تک جاتی ہے۔ تاریخ مشائخ چشت،صفحہ ۴۴

۸۔ یہ رسم قبل اسلام سے آج تک قائم ہے کہ حج کے دوران حاجی اس وقت تک میدان

عرفات سے رخصت نہیں ہوتے جب تک انہیں ایک خاص اشارے کے ذریعے روانہ ہونے کی اجازت نہ دی جائے گویا بیت اللہ اور حج کی خاص خدمات میں سے یہ اہم خدمت عرصے تک صوفی کہلانے والوں کے پاس رہی۔

۹۔ مکتوبات صدی حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اردوترجمہ، شائع کردہ۔ سعید کمپنی کراچی ،صفحات ۱۷۵ تا ۱۷۹

۱۰۔ ۔فوائد الفواد ۔ اُردو ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی ،مطبوعہ اردو اکیڈمی ، دہلی صفحہ ۲۲۷

۱۱۔ سیر الاولیاء ۔ اُردو ترجمہؒ مولانا اعجاز الحق قدوسی ،صفحہ ۶۰۶

۱۲۔ سیر الاولیاءصفحہ ۸۱۲

۱۳۔ فوائد الفواد: اُردو ترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی ،صفحہ ۳۹۹۔۴۰۰

۱۴۔ جوامع الکلم (قلمی) بحوالہ تذکرہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ از پروفیسر نثار احمد فاروقی ،

عارفانہ تجربہ

محمد شفیع بلوچ

انسان کیا ہے؟ خلق اللہ، خلیفۃ اللہ فی الارض، اکملِ موجودات، ایک ایسا عالم اصغر جو عالم اکبر کی روح، اس کی علّت اور سبب ہے، حق تعالیٰ کی اعلیٰ اور اکمل تجلّی کا نمائندہ اور اس کی صفاتِ جمال وجلال کا مظہر، تمام اجزائے عالم سے برتر، حتیٰ کہ فرشتوں اور ملائکہ مقربین سے بھی اعلیٰ وافضل، مابعد الطبیعاتی لحاظ سے بقول شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ''خواب اور بیداری کا مجموعہ!!''

امام نووی کہتے ہیں کہ انسان کا قالب خشک گارے کی کالی مٹی سے تیار کیا گیا ہے، جو ہر طرح کا تطور قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، پھر پختہ ہونے پر اس میں اللہ کی روح سے جان پھونک دی گئی۔ انسان کی یہ ساری اہمیت، فضیلت اور شرف دراصل عقلی، فکری اور معنوی لحاظ سے ہے، کیونکہ وہ امر الٰہیہ کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ امرِ حق کا امین بھی ہے۔ وہ عقل وفکر اور نفس ناطقہ رکھتا ہے، ورنہ جسمانی لحاظ سے وہ دیگر موجودات پر کوئی برتری نہیں رکھتا، بلکہ اکثر سے کمتر ہے۔

حقیقت اولیٰ کی بازدید وبازیافت، اس کی طرف کشش اور اس سے ہم آہنگی و اتصال کی آرزو نے بقدرِ ظرف کئی روپ دھارے اور کئی خواب بنے، کبھی معراج کی صورت میں اور کبھی کشف والہام کی شکل میں۔ کچھ مقربانِ الٰہی کو (جن میں زیادہ تر پیغمبر ومرسلین شامل ہیں) اتصال ومشاہداتِ تجلّی، ذات بحت کے جسمانی اور بعض (جن میں زیادہ تر صوفیہ ہیں) کو مکشوفات ورویائی صورت میں عارفانہ تجربات ہوئے۔ ذات باری کی جانب مراجعت چاہے شعوری ہو یا لاشعوری، جسمانی ہو یا روحانی، مکشوفی ہو یا رؤیائی، اس تجربہ کا اپنا ایک خاص کیف ہوتا ہے، کیف دوام!

کتب عامہ میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اگر تم بہت زیادہ باتیں نہ کیا کرتے اور تمہارے دلوں میں گھبراہٹ نہ ہوتی، تو تم بھی وہی دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہی سنتے جو میں سنتا ہوں۔''

دنیا کی مذہبی تواریخ اور انبیاء کے سوانح کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف زمانوں میں انبیاء ومرسلینؑ کو مشہودات کے مواقع ملتے رہے۔ انہیں ان کے مقام ومرتبہ اور حیثیت وظرف نبوت

کی بعض مخصوص ساعتوں میں قیود زمان ومکان سے ماوراء انفس وآفاق کے مشاہدے کرائے گئے، یہاں تک کہ وہ نور ربانی سے معمور ومستفید ہوئے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ حقیقت کی کلیت کا شعور بصیرت کے ایک لمحے میں صرف وجدان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس لمحے بصیرت میں حقیقت مجز اور پارہ پارہ ہونے کے بجائے من حیث المجموع نظر آتی ہے اور زمان ومکان سے ماوراء ہوجاتی ہے۔ انبیاء کے مشاہدات اور مکاشفات اسی وجدان ادراک کی ارتقاء یافتہ صورت ہیں۔ اسی کیفیت وجدان میں غالبؔ نے دشت وفا کو دیکھ کر کہا ہے:

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا ا؎

یہ شعور کہ کائنات کی ان بے کراں وسعتوں میں انسان تنہا اور بے سہارا نہیں ہے بلکہ انتہائی بنیادی اعتبار سے اس کو ایک ایسی حقیقت کا ساتھ حاصل ہے جو کہ اس کے تمام دکھوں کا مداوا اپنے پاس رکھتی ہے، انسان کے مذہبی تجربہ کی روح اور اس کا مغز معلوم ہوتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ روحانی واردات اور روحانی تجربہ (Spiritual Experience) ہے جو حواس انسانی کے ذریعہ واردۂ ذہن پر کوئی تاثر پیدا کرتا ہے۔ یہ تجربہ خارجی بھی ہوسکتا ہے اور باطنی بھی۔ ایک لحاظ سے ہر خارجی تجربہ بتدریج داخلی ہوجاتا ہے کہ جب بیرونی مہیجات حواس کے تاروں کو چھیڑتے ہیں، تو روح کا ساز ترنم ریز ہوجاتا ہے ۔کبھی بے ہنگم ہلچل ہوتی ہے، کبھی طوفان برپا ہوتا ہے، کبھی سکون و آسودگی۔ ذات کی اندرونی وسیع وبسیط کائنات کا انکشاف اور گیان متصوفانہ اور روحانی تجربہ ہے ۲؎ اور یہ ہر اس انسان کو ہوسکتا ہے جو جذب دروں سے بہرہ مند اور اوصاف خاص سے متصف ہو۔

مذہب کے دو پہلو ہیں: ایک معروضی اور دوسرا موضوعی۔ معروضی پہلو عبادات اور اخلاقیات کے دستور العمل پر مشتمل ہوتا ہے، جب کہ موضوعی پہلو میں انسان کا اپنے معبود سے ایک جذباتی رشتہ استوار ہوتا ہے۔ کارل ژنگ نے شاید اسی بنا پر مذہب کے اس پہلو کو عشق کے مماثل قرار دیتے ہوئے کہا تھا:

عشق اور مذہبی عقیدے میں ایک سے زیادہ عناصر مشترک ہیں۔ دونوں میں کامل سپردگی ضروری ہے۔ صرف وہی اہل مذہب جو اپنے خدا کے سامنے پوری طرح سر تسلیم خم کردیتے ہیں، اس کی بارگاہ میں مقبول ٹھہرتے ہیں۔ اور اس کی رحمت کے مستحق ہوسکتے ہیں۔ اس طرح عشق کے حیرت انگیز

اسرار بھی اسی شخص پر کھلتے ہیں جو اپنی محبوبہ کے سامنے کامل سپردگی سے کام لیتا ہے۔ ۳؎

عشق حقیقی کی معراج یہ ہے کہ انسان عبادات میں تمام منتشر خیالات سے نجات پا کر خود کر ایک نقطے پر مرتکز کردے اور خدا کو اتنے قریب سے جان لے کہ دوئی کا احساس ختم ہوجائے۔ مذہب میں یہ کوئی بعید چیز نہیں ۔ یہی وہ مقام ہے جس کو عرفا اور سالکین ''احسان'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ''والّذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا'' (عنکبوت:۶۹) یعنی جو ہماری راہ میں مشقت برداشت کرتے ہیں (مجاہدہ کرتے ہیں) ہم ان کو اپنے قرب کے راستے ضرور دکھائیں گے۔ اسی پر اکتفا نہ کرکے اس کے فوراً بعد ارشاد ہے وان اللّٰہ لمع المحسنین (اوراللہ بیشک اہل احسان کے ساتھ ہے) اسی بناپر مجاہد فی سبیل اللہ جب تک مرتبۂ احسان تک نہیں پہنچ جاتا ہے، راہ ہدایت اور راہ قرب ورضا نہیں پاسکتا۔ حضرت ابوذر غفاری نے آنحضرت سے پوچھا کہ احسان کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: '' ان تعبدوا اللّٰہ کانک تراہ وان تکن تراہ فانہ یداک ''یعنی انسان کو چاہئے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرے گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے لیکن اس کیفیت کے ساتھ عبادت کرنے پر قادر نہ ہوتو (پھر ایک نچلا درجہ یہ ہے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرے گویا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔''

روئیس (Royce) کہتا ہے کہ سب سے زیادہ تجربیت پسند انسان صرف صوفی ہی ہے ۴؎ اورصوفیہ کے یہاں عشق کا آخری درجہ وہ ہوتا ہے جب وہ لازوال میں فنا ہوجاتا ہے، جیسے موج دریا میں مل کر دریا بن جاتی ہے۔ گویا صوفی تجبہ کل میں گم ہوجانا ہے جب کہ صوفی پر پیغمبرؑ کو یہ سبقت حاصل ہے کہ وہ ''وصل'' کے بعد واپس آتا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے رشدوہدایت کے تحائف لاتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس اعتبار سے نبوت کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کرجاتی ہیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی ، یا از سر نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں، جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ صوفی کے لئے لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے، جبکہ انبیاء کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان واردات کو ایک زندہ اور عالم گیر قوت میں بدل دیں۔ ۵؎ اس سلسلے میں شیخ عبد القدوس گنگوہی کا معروف عالم جملہ اور بقول علامہ اقبال جس کی نظیر تصوف کے سارے ذخیرۂ ادب میں مشکل ہی سے ملے گی کہ ''محمد مصطفیؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے، جہاں ان کا خدا سے کمان کے دوسروں سے بھی کم فاصلہ

تھا اور واپس پلٹ آئے ۔ خدا کی قسم اگر میں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا''۶ سے ایک عارف اور ایک پیغمبر کے تجربے اور اس کی معنویت کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے ۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ شیخ موصوف کے اس ایک جملے سے ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کر لیتے ہیں جو شعور ولایت اور شعور نبوت میں پایا جاتا ہے۔ صوفی نہیں چاہتا واردات اتحاد میں اسے جو لذت وسکون حاصل ہوتا ہے، اسے چھوڑ کر واپس آئے۔ اگر آئے بھی جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے، تو اس سے نوع انسان کے لئے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ ان واردات سے واپس آتا ہے کہ زمانے کی رو میں داخل ہوجائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ وتصرف سے، جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ ۷ بالفاظ دیگر نبی کا تجربہ تاریخ میں دخل انداز ہوتا ہے، جبکہ صوفی کا تجربہ اس کی اپنی دنیا سے باہر مؤثر نہیں ہوتا۔

عارفانہ تجربے کی کئی جہتیں ہوسکتیں ہیں۔ یہ مذہبی بھی ہے اور روحانی بھی ، اور ایک لحاظ سے فنکارانہ بھی۔ اوٹو ۱۹۳۷۔۱۸۶۹ء نے اپنی ایک مختصر کتاب داس ہیلیگ (مقدس کا تصور) میں مذہبی تجربہ کو بنیادی اعتبار سے ایک ایسی غیبی حقیقت کا مکاشفہ (یا کم تر درجہ میں شعور) قرار دیا ہے جو انسان کے لئے ایک بالکل ''غیر'' کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہاں ''غیبی'' سے مراد یہ ہے کہ اس حقیقت کا نہ صرف یہ کہ ہماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایسے ''اسرار'' سے تعلق رکھتی ہے جن کا احساس تو ہم کرسکتے ہیں لیکن جن کی تہہ تک پہنچنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ پر اسرار اور دنیا سے بالکل منزہ حقیقت بیک وقت اپنی عظمت کے اعتبار سے انسان کے لیے رعب وہیبت پیدا کرنے والی بھی ہے اور اپنے اندر انسانی سعادت کا سامان رکھنے کے اعتبار سے باعث کشش بھی ۔ اپنی ان صفات کی وجہ سے اس حقیقت کا شعور یا مکاشفہ انسان کے اندر ردعمل کے طور پر انتہائی عاجزی ، اپنی بے وقتی اور غیبی حقیقت کے لیے عقیدت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اپنے ان بیانات کی تشریح اور سند کے لیے انہوں نے یہودی اور عیسائی مقدس صحیفوں سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ۸ اس مذہبی تجربہ میں انسان کو جس منزہ اور غیبی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے وہ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر انسان کے لئے قطعی اور آخری سند کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ زمان و مکان کی پابندیوں میں گرفتار انسان اسی دائرے میں محصور کسی چیز کو اپنا اعلیٰ ترین معیار بنا کر قانع نہیں ہوسکتا ! ایک ایسی حقیقت کا انکشاف جو کہ لامحدود ، نقائص سے بری اور انسان کی شخصیت کو پورے

طور پر مغلوب کر لینے والی ہے، اس کے لئے وہ آخری معیار بھی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ تمام کائنات کو پرکھ سکتا ہے اور اس کے واسطے سے کائنات اور اپنی زندگی کے معنی ومقصد کو متعین کرسکتا ہے۔۹

فنی تجربہ نہ صرف اردگرد کی اشیا سے ایک قریبی تعلق قائم کرتا ہے، اور یہ تعلق تشبیہات اور استعارات کے علاوہ حسی تلازمات کی صورت میں بھی جنم لیتا ہے، بلکہ جسمانی یا حسی تجربے کے دوران ایک مخفی مفہوم یا معنی کا بھی ادراک کرتا ہے جو اسے عام مشاہدے، یعنی ادراک حضوری (Immediacy Perception) سے اوپر اٹھا کر ادراک معنی (Meaning Perception) کی سطح پر لے آتا ہے۔ گویا فن میں معراج بیک وقت جسمانی بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی۔ چنانچہ جن چیزوں کو جسم کے روحانی ارتقاء کی ایک صورت قرار دیا گیا ہے۔ صوفی یا درویش کے عارفانہ تجربے میں وہ ارتکاب محبوب ازلی کی ذات پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس ذات کے سوا ہر شے پس منظر میں جا کر شعور کی گرفت سے نکل جاتی ہے۔ ایک پہنچے ہوئے صوفی یا درویش کے عارفانہ تجربہ میں تو شعور ہی کی نفی ہوجاتی ہے۔ اس حالت کو تصوف نے فنا کا نام دیا ہے۔ مگر فن کے تخلیقی عمل میں خود فراموشی کی حالت مکمل نہیں ہوتی، کیونکہ اگر یہ مکمل ہوتی تو صوفی کی طرح فنکار بھی گم ہوجاتا اور واپس نہ آسکتا۔ اگر صوفی فنکار بھی ہے تو وہ اپنے عارفانہ تجربے کو ایک حد تک کسی نہ کسی فن لطیف کے ذریعے پیش کرنے پر قادر بھی ہوجاتا ہے۔۱۰

ذات مطلقہ سے اتصال کا تجربہ سراسر باطنی اور روحانی ہے جو ہر کس وناکس کے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا۔ اسی لیے اس کے بارے میں فلاطینوس کہتا ہے کہ باطنی اور صوفیانہ طریقوں میں ایک نابلد شخص کو ان حقائق سے واقف کرنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔ روحانی تجربات غیر حسی ہونے کی وجہ سے عقل کی دسترس سے باہر ہیں، اور اس لئے وہ لوگ جو اس کے سرور سے نا آشنا ہیں، اس کی ماہیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مشاہدے میں دوئی نہیں ہوتی بلکہ شاہد ومشہود ایک ہوتے ہیں۔ (کیونکہ مشہود عام دیکھنا نہیں بلکہ مدغم ہونا ہے۔) اگر انسان اس حالت شہود وادغام میں اپنی حیثیت کی نوعیت وماہیت کو حافظہ میں رکھ سکنے میں کامیاب ہوجائے تو گویا اس کے سامنے اس خدائے قدوس کا عکس موجود رہے گا۔ اس حالت میں وہ مشہود کے ساتھ مدغم ہو چکا تھا اور ہر قسم کی دوئی اور غیریت کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ اس وقت اس کے قلب میں کوئی جذبہ موجزن نہیں تھا اور نہ غصہ، نہ نفسانی خواہش

حتیٰ کہ نہ عقل تھی اور نہ وجدان ۔اپنی خودی کا احساس تک بھی موجود نہ تھا، تواجد کی حالت میں وہ مکمل اطمینان اور سکون کا مجسمہ، خدا کے نور سے منور اور سرور کامل سے بھرپور۔ اس خودفراموشی کی حالت میں اس کی نظر دائیں بائیں نہیں گھومتی حتیٰ کہ خود اس کی اپنی ذات بھی مرکز توجہ نہیں ہوتی۔ وہ مکمل سکون کی حالت میں ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ وہ خود مکمل سکون بن جاتا ہے۔ اس وقت انسان حسن اخلاق کی سرحدوں سے بالاتر ہوجاتا ہے ۱۱ اس تجربے کی وضاحت ڈاکٹر وزیر آغا یوں کرتے ہیں:

صوفیانہ وعارفانہ تجربہ سراسر ایک جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے اور یہ اشیا اور مظاہر سے قربت کا احساس ہے۔ یہ تجربہ ایک کل کی حیثیت رکھتا ہے اور کل کا ادراک کرتا ہے۔ عالم شعور میں ناظر ومنظور کی جو تقسیم معرض وجود میں آتی ہے عارفانہ تجربہ میں باقی نہیں رہتی یعنی من تو شدم تو من شدی کی کیفیت کا تسلط قائم ہوجاتا ہے ۔ عارفانہ تجربہ میں ارتکاب محبوب ازلی کی ذات پر ہوتا ہے ۔ اس لئے اس ذات کے سوا ہر شے پس منظر میں جاکر شعور کی گرفت سے نکل جاتی ہے۔ ایک پہنچے ہوئے صوفی یا درویش کے عارفانہ تجربہ میں تو شعور ہی کی نفی ہوجاتی ہے اس حالت کو تصوف نے فنا کا نام دیا ہے اسی تجربہ کے دوران میں صوفی خود کو ایک دوسری ہستی کے روبرو پاتا ہے اور یہ دوسری ہستی اتنی بے کراں اور توانا ہوتی ہے کہ اس کے سامنے انسان بالکل بے بس ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس تجربہ کو اکثر وبیشتر نور کا نام دیا گیا اور روشنی کا کوندا کہا گیا ہے۔ ۱۲

چینی حکیم لاتسے (Laotse) کہتا ہے : '' جو جانتا ہے، وہ کہتا نہیں'' ۔ گوئٹے نے موت سے ایک ہفتہ قبل لکھا تھا:'' ہمارے ایقانات کا احسن حصہ الفاظ میں مقید نہیں ہوسکتا'' ولیم جیمز کہتا ہے کہ ہر متصوفانہ واردات اور تجربہ ناقابل بیان ہوتا ہے۔ اس تجربے میں جو کچھ واردات اس پر گذرتی ہے وہ خود تو اسے محسوس کرتا ہے اور اسے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، لیکن چونکہ اس کا مواد محسوسات کی دنیا سے متعلق نہیں ہوتا اس لئے اس کو مادی لباس پہنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ۱۳

الفاظ انسانی ضرورتوں کی بنیاد پر وضع کئے گئے ہیں۔ اس لئے ربانی حقائق ، انوار اور حقائق عالیہ کو اس طرح بیان کرنا کہ پوری طرح سمجھ میں آجائیں، ناممکن ہے۔متصوفانہ و عارفانہ تجربات اور انفس وآفاق کے مشاہدات کی ترسیل اگرچہ ناممکنات میں سے ہے، تاہم جو لوگ اپنے اپنے ظرف اور استعدداد کے مطابق ان حقائق کے ادراک سے مشرف ہوئے ان لوگوں نے بھی استعارہ اور

تمثیل کے پردے میں بات کی ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ صرف اشارے اور کنائے تک محدود ہے۔ ان کے ایسے تجربے تاریخ وتذکروں کا حصہ ہیں جن میں مختلف انداز بیان اور اظہار خیال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، مثلا ذات مطلق سے اتصال کے تجربے کو فلاطنوں یوں بیان کرتا ہے۔

روح کو خیر اور شر اور ہر قسم کی دوسری چیزوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا چاہئے تاکہ وہ وحدت مطلقہ کا استقبال کر سکے۔ جب روح ہر مادی چیز سے علیحدہ ہوجاتی ہے اور اپنے آپ کو ہر آلائش سے پاک صاف کرلیتی ہے تو پھر وہ خدائے مطلق کے ساتھ واصل ہوجاتی ہے کہ اس وقت وہ دونوں ہی نہیں مطلقہ کا استقبال کر سکے۔ جب روح ہر مادی اور حسی چیز سے علیحدہ ہوجاتی ہے اور اپنے آب کو ہر آلائش سے پاک صاف کرلیتی ہے تو پھر وہ خدائے مطلق کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ اس وقت وہ دو نہیں رہتے بلکہ ایک ہوجاتے ہیں۔ جب تک مشاہدۂ ذات رہتا ہے دوئی کی گنجائش نہیں۔ اس وصل کے بعد حضوری ہوتی ہے تو اس وقت اس کے سامنے اپنا وجود نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ خود کیا ہے۔ اس وقت وہ نورِ مطلق اس کے قلب وذہن پر اتنا حاوی ہوتا ہے کہ سوائے اس کے اسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہوتا۔ اس وقت کے سرور کے لیے وہ تو جنت کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہ روح کی بلند ترین منزل ہے۔ یہاں پہنچ کر کسی قسم کے دھوکے یا تلبیس کا کوئی امکان نہیں۔ آفتاب دلیل آفتاب ہے۔ حقیقت سے بڑھ کر کون سی سچائی اور صداقت ہوسکتی ہے؟ اس کی راحت ولذت جسمانی اوحسی لذت کے مشابہ نہیں۔ یہ وہ سعادت ہے جو روح کو اس فانی دنیا میں آنے سے پہلے میسر تھی۔ اس وقت ہر دنیاوی خواہش جو کبھی اس کی نگاہ میں عزیز تھی قوت، دولت، حسن، علم وغیرہ ہیچ وبے معنی معلوم ہوتی ہے۔ شر اور بدی کا خوف اس سے دور ہوجاتا ہے۔ اس کی لذت وسرور کی شدت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ اس حضوری کے باعث وہ خارجی دنیا سے بالکل بے نیاز ہوجاتا ہے، خواہ ارد گرد کی ہر چیز فنا ہوجائے، اسے اس کی بالکل پروانہیں ہوتی۔ ۱۴

پچھلی امتوں کے سالکین کے مشاہداتی کمالات محدود نوعیت کے ہوتے تھے۔ فنا کی منزل پر پہنچنے کے بعد وہ اسما وصفات الٰہی کا مشاہدہ تو کر سکتے تھے لیکن اس سے اوپر کسی مقام کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں راز یہ تھا کہ ان کی معرفت کی انتہا کلمۂ لاالہٰ الا اللہ پر تھی، جس کا حاصل خدا کی تمام کمالی وجمالی صفات کا شہود ونما تھا، لیکن امت محمدیہ کے سالکین نے اس سے بہت اوپر کی منزلیں بھی طے کی ہیں اور بعد کے مراحل سے واقفیت پیدا کی ہے اور ان کی رسائی ان مقامات تک

ہوئی ہے، جن کی تشریح نہیں کی جاسکتی ۔ ۱۵؎ ابن سینا اشارات میں لکھتا ہے : جب عارف کا ارادہ اور اس کی ریاضت ایک خاص حد تک ترقی کر جاتے ہیں تو اسے نورحق کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں اور اس کے دل پر ایک نورنمودار ہوتا ہے، جو بہت ہی لذت بخش ہوتا ہے اور یہ نہایت تیزی سے گذر جاتا ہے گویا کہ بجلی چمکی اور غائب ہوگئی۔

اور بقول شاعر:

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے جہاں روشن ہے نور لاالہ سے

اس حالت کو عرفات اوقات کہتے ہیں ۔ عارف جتنی زیادہ ریاضت کرتاہے اتنی ہی کثرت سے یہ حالت پیش آتی ہے۔ جب وہ اور ترقی کرتاہے تو یہ کیفیت بغیر ریاضت کے بھی طاری ہونے لگتی ہے جب وہ ذرا بھی کوئی جھلک دیکھتا ہے تو اس کا خیال عالم قدس کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور اس پر ایسی حالت طاری ہوجاتی ہے کہ اسے ہر چیز میں خدا کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک درجہ اور آگے بڑھ جاتا ہے، تو حالت یہ ہوجاتی ہے کہ جلوہ اس کی خواہش پہ موقوف نہیں رہتا۔ وہ جب جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اسے خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس کی توجہ کلی طور پر ذات حق کی طرف ہوجاتی ہے ۔ اس کی یہ حالت مستقل طور پر قائم رہتی ہے ، گو اس کے گرد وپیش کے لوگ اس کی اس حالت سے بےخبر رہتے ہیں اور انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اب تک تو عارف کی حالت کا تعلق ریاضت اور مجاہدہ سے تھا۔ اس مرحلے سے گذر جانے کے بعدعارف مجاہدہ کے بغیر بھی اپنے ضمیر کو صیقل شدہ آئینے کی مانند پاتا ہے۔ جس میں اسے ہر وقت حق تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس حالت میں اس پر روحانی لذتوں کی بارش ہوتی ہے اور وہ اپنا تعلق حق تعالیٰ سے دیکھ کر جوش ومسرت سے پھولا نہیں سماتا۔ اس کی ایک نظر خدا کی طرف ہوتی ہے اور ایک اپنی طرف (جیسے آئینہ دیکھنے والا کبھی آئینے کو دیکھتا ہے اور کبھی اس میں اپنے عکس کو)۔ اس سے اگلے مرحلے میں خود عارف کا وجود بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ اس کی نظر فقط ذات حق پر ہوتی ہیں۔ وہ اگر اپنے آپ کو دیکھتا بھی ہے تو اس لحاظ سے کہ ہر مشاہدہ میں دیکھنے والا بھی کسی نہ کسی طرح نظر آتا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے آئینہ دیکھنے میں توجہ تو عکس کی طرف ہوتی ہے، آئینے کی طرف نہیں لیکن عکس کی طرف دیکھنے میں آئینہ پر بھی لامحالہ نگاہ پڑتی ہے، ہر چند کہ یہ ضروری نہیں کہ آئینہ کی خوبصورتی کی طرف بھی توجہ ہو۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر عارف واصل بحق ہوجاتا ہے اور اس کا خلقت سے حق تک

سفر اختتام کو پہنچتا ہے۔۱۶؎

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

فرزند عزیز! غور سے سنو: جب سالک ذکر میں پورے اخلاص وانہماک سے مشغول ہوتا ہے تو وہ مجاہدات وریاضات سے تزکیۂ نفس حاصل کرتا ہے۔ جب وہ اپنے ساتوں لطائف یعنی، (قلب، لطیفۂ روح، لطیفۂ سر، لطیفۂ خفی، لطیفۂ نفس، لطیفۂ قالبیہ وغیرہ کا تصفیہ کرلیتا ہے اور عالم مثال میں ان کے انوار کو دیکھ لیتا ہے، جومختلف الوان کے ہیں (زرد، سرخ، سفید وغیرہ) تو اس کی سیر آفاقی اتمام کو پہنچتی ہے۔ سالک اس سوران میں عالم مثال میں اپنے آپ کو ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں تبدیل ہوتے دیکھتا ہے(زرد ہے، پھر سرخ، پھر سفید وغیرہ) چونکہ عالم مثال آفاق میں داخل ہے اس واسطے اس سیر کو سیر آفاقی کہتے ہیں، ورنہ حقیقت میں یہ سیر بھی سیر نفس سالک ہے اور اوصاف واخلاق میں ایک قسم کی کیفی حرکت ہے، چونکہ دور سے دیکھتے وقت اس کا مطمح نظر آفاق ہوتا ہے، نہ انفس، اس واسطے اس سیر کی نسبت آفاق کی طرف کردی گئی ہے۔ مشائخ نے اس سیر کو سیرالی اللہ اقرار دیا ہے۔ اس سیر آفاقی کے بعد جو سیر واقع ہوتی ہے اس کو سیر انفسی کہتے ہیں۔ یہ سیر فی الحقیقت انفس کے آئینوں میں ظلال اسماء کی سیر ہے۔ بنا برین اس سیر کو ''سیر معشوق در عاشق'' بھی کہتے ہیں یعنی معشوق اپنے عاشق کے لطائف کے آئینوں میں جلوہ گر ہورہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے ستر ہزار پردے نور وظلمات کے ہیں (نور، جمال اور ظلمت، جلال) اور سیر آفاقی میں ان تمام پردوں کا چاک کرنا شامل ہے۔ سات لطائف ہیں اور ہر لطیفہ کے دس ہزار پردے ہیں۔ جب سیر آفاقی پوری ہوتی ہے۔ تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور سالک کو سیر فی اللہ نصیب ہوتی ہے اور وصل کا مقام اس کو مل جاتا ہے۔ ارباب ولایت کے سیروسلوک کا خلاصہ یہ ہے جو لکھا گیا ہے۔ ۱۷؎

حوالہ جات

۱۔سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۳

۲۔انور جمال، ادبی اصطلاحات، طبع دوم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۸، ص ۲۲

۳۔علی عباس جلال پوری، کائنات اور انسان، بارسوم، تخلیقات، لاہور، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۲

۴۔فرد اور کائنات، جلد اول، ص، ۸۱، بحوالۂ بشیر احمد ڈار، تاریخ تصوف قبل از اسلام، ادارہ ثقافت

اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۲،ص ۹

۵۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ)، مترجم سید نذیر نیازی، (پانچواں خطبہ ، اسلامی ثقافت کی روح) ،طبع چہارم، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۰،۱۸۹

۶۔اعجاز الحق قدوسی، شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات ، اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۲۷

۷۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (پانچواں خطبہ) ،ص ۱۸۸

۸۔عماد الحسن فاروقی ، دنیا کے بڑے مذہب ، مکتبہ تعمیر انسانیت ، لاہور ،سن اشاعت ندارد ،ص ۹

۹۔ ایضاً ،ص ۱۰

۱۰۔ڈاکٹر وزیر آغا، اقبال اور عارفانہ تجربہ، بشمولہ سہ ماہی پیغام آشنا (اقبال نمبر)، شمارہ ۴، دسمبر ۲۰۰۰ء،ص ۸۹۔۸۸

۱۱۔سٹیسن میکینیا، '' اینی نیڈز'' (انگریزی ترجمہ)،طبع دوم، لندن ، ۱۹۵۶ء، (۶۔۹۔۷،۱۱) ص ۶۲۰ تا ۶۲۵)بحوالہ تاریخ تصوف قبل از اسلام ،ص ۷۳۔۶۹

۱۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ۹۸۔۸۶

۱۳۔بشیر احمد ڈار، تاریخ تصوف قبل از اسلام ،ص ۱۰

۱۴۔سٹیسن میکینیا، '' اینی نیڈز'' (۶۔۷۔۳۴) ص ۵۸۸

۱۵۔علامہ محمد حسین طباطبائی ، سیروسلوک ، ترجمہ : ایم ۔ اے انصاری ،طبع چہارم ، جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان، کراچی ، ۲۰۰۲ء،ص ۱۵۵

۱۶۔اشارات از ابن سینا، بحوالہ استاد مرتضیٰ مطہری ،علم وعرفان مشمولہ سیر وسلوک ،ص ۱۰۴۔۹۴

۱۷۔مکتوبات امام ربانی، دفتر مکتوب ۴۲، بنام خواجہ جمال الدین حسین ، ترجمہ حافظ عبد الکریم ، اللہ والے کی قومی دکان ، لاہور، ۱۹۵۷ء

عرفان استاد شہید مطہری کی نظر میں

ڈاکٹر سید عبدالحمید ضیائی

استاد مطہری کا شمار ایران کے عظیم علماء ومفکرین میں ہوتا ہے۔زیرنظرمقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ عرفان وتصوف کے بارے میں استاد شہید مطہری کے عقاید ونظریات کو وضاحت کے ساتھ پیش کردیا جائے۔ جس کی روشنی میں عرفان کے سلسلے میں ان کے رویے کی ترجمانی ہوجائے۔ استاد مطہری کو معاصر ایرانی معاشرہ میں ایک عظیم مفکر ومعتبر عالم کی حیثیت سے دیکھے جانے کے ساتھ ساتھ ایران میں ان کے عرفانی نظریات کو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس مقالہ کی تیاری میں استاد مطہری کی تصانیف کا سہارا لیا گیا ہے۔

استادشہید مطہری کی شخصیت اور ان کے افکار کا جو خاکہ آج ایرانی عوام وخواص کے ذہن میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فلسفیانہ اورحکیمانہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی بیشتر تصانیف کو اسی زاویہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جب ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے اکثر افکار وعقاید کا انحصار عقل ومنطق پر ہے، حتیٰ کہ ان کے دینی تمایلات ورجحانات پر بھی عقل وخرد کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ استاد شہید مطہری عقل وخرد کی محدودیت ہی میں گرفتار رہے اور دوسرے علوم اور زندگی کے گوناگوں میدانوں میں ان کی نگاہیں عقل وخردکی اس جولانگاہ سے باہر قدم نہ رکھ سکیں۔ ان کی نظر وسیع ، ان کی فکر متنوّع اور گوناگوں ابعاد کی حامل رہی ہے۔ عمر کے آخری حصے میں ان کے عرفانی افکار وخیالات کی گونج بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ جس کی گرانقدر مثالیں ان کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

شہید مطہری کا ذہن ، اور ان کا قلم فلسفہ وعرفان اورعقلی شہودی حکمت کے وسیع میدان کے ہرگوشے سے آشنا تھا۔ ان کی کتابیں ان کے بے پناہ علم وادراک کی شاہد ہیں۔ چونکہ فلسفے اورحکمت کی وادیوں کی سرحدیں بڑی حد تک ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ شہید مطہری کے یہاں دونوں کی گونج ساتھ ساتھ سنائی دیتی ہے۔ استاد نے ان دونوں کو سماج کی ترقی میں مددگار سمجھا ہے۔ انہوں نے ان دونوں راستوں کو معرفت الٰہی کے لئے مفید اورقابل قدر گردانا ہے۔ حتیٰ کہ وہ

تصور کرتے تھے کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، علمی ومعرفتی لحاظ سے بے معنی ہے۔ آپ نے فلسفہ وعرفان کو ایک دوسرے کا تکملہ سمجھا چنانچہ عرفاء بھی اس استدلال کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔

عرفان کے بارے میں شہید مطہری کے نظریات اور ان کی ترجیحات کو ان کی کتابوں سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اورضرورت بھی ہے کہ ان کے اس نوعیت کے افکاروعقائد کو آج کی نئ نسل کے سامنے پیش کیاجائے۔ اس طرح ہم عرفان اور ان کے فکری اصول ومعیار کو بھی واضح کرسکتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے عرفان، عرفانی ادب اور ان شعبوں سے وابستہ اشخاص کے بارے میں گرانقدر معلومات کوفراہم اور یکجا کیا جاسکتا ہے جواستاد کی شخصیت کے اس پہلو کو اجاگر کرنے میں ممدومعاون ہوسکتی ہیں جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔

زندگی کے آخری ایام میں شہید مطہری کا عرفان کی طرف زیادہ مائل ہونا اور اس کی وجہ سے ان کی زندگی اورطرز فکر میں انقلاب کا رونما ہونا، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پہلو کو سمجھے بغیر ہم ان کی زندگی کے مکمل حالات سے واقف نہیں ہوسکتے۔ استاد اصل اسلامی عرفان کے قائل اور اس کی آزادانہ حیثیت، اصلیت، اور اس کی بے پناہ وسعتوں کے معترف تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عرفان اسلامی کی اصلیت، اس کی آزادانہ حیثیت اور جامعیت کی وضاحت کی جائے۔

آپ کا اعتقاد تھا کہ تکامل کے راز کو انسانی ''فطرت'' میں تلاش کیا جانا چاہیئے۔وہ عرفان جس کے بارے میں استاد شہید مطہری نے اپنے عقائد کا اظہار کیا ہے،اس کا اصل سرچشمہ قرآن، حدیث، آئمہ معصومین علیہم السلام کی علمی وعملی سیرت ہے۔ وہ فطرت کو ام المعارف قرار دیتے ہیں۔ فطرت انسانی جس معرفت کی تلاش میں ہمیشہ گرداں رہتی ہے، اس عرفان کی حقیقت ونوعیت ہی دوسری ہے۔ اس قسم کا عرفان ایک انسان کو خدا شناسی اور اس کی مخلوق کا درد عطا کرتا ہے، وہ جس طرح اپنے سے باہر کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اسی طرح خود اپنے اندر بھی جھانکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے پیش نظر استاد شہید مطہری عرفان کے طفیل میں حاصل ہونے والی خود آگاہی کا ذکر کرتے ہیں۔یہی خود آگاہی ہمیں سیروسلوک کی وادی کے رازوں سے آشنا کرتی ہے اورعرفان عملی ہمیں مقام توحید کی طرف توجہ کرنے پر مائل کرتا ہے۔ اس طرح خود اپنی معرفت، اپنا احتساب اور اپنے آپ پرتوجہ رکھنا اسلامی عرفان کا اصل سرمایہ ہے۔

استاد شہید مطہری کی نظر میں تہذیب نفس ، تزکیہ اور طہارت کے ذریعہ حق ، اسماء اور صفات الٰہی کی شناخت کا نام عرفان ہے، جو سیر وسلوک کے راستے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے عالم اور آدم، یا دنیا کی مخصوص تفسیر کی جاتی ہے ۔ ایک عارف اس طریقے سے دنیا کو حق کا جلوہ اور اسمائے حسنائے الٰہی کا مظہر سمجھتا ہے۔ توحید عارف کے سیر وسلوک کی آخری منزل ہے۔ یہ وہ توحید ہے جو اصل ذات حقیقی وجود کو خدا پر منحصر سمجھتی ہے اور ماسوای الٰہی کو اس وجود و کی تجلیات ، یعنی اگر حکمت وفلسفے میں ''بود ونبود'' اور اخلاق میں ''باید ونباید'' کی بحث کی جاتی ہے تو عرفان میں ''بود ونمود'' کی گفتگو ہوتی ہے۔ ہستی کی عرفانی تفسیر میں وجہہ الٰہی اور معنوی کو اصل وجہ حقیقی سمجھا جاتا ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عرفان میں خدا اور انسان کامل یعنی توحید اور موحد کی بات کی جاتی ہے۔ اسی کو شہود توحید یا توحید شہود کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک سالک کو لازمی طور پر سیر وسلوک کی وادی میں اس مقام پر پہنچنا چاہئے ۔ استاد شہید مطہری کی تعبیر یہ ہے کہ ایک عارف کی توحید یہ ہے کہ وہ ایسے طریقے سے اس مقام تک پہنچے جہاں وہ سوائے خدا کے اور کچھ نہ دیکھے۔

استاد شہید مطہری نے عرفان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عرفان عملی اور دوسرا عرفان علمی۔ ان دونوں کے بارے میں عرفان اور تہذیب اور تصوف وسماج کے تناظر میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ علمی عرفان اور اخلاق میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اور بعض اختلافات بھی ہیں، جبکہ عملی عرفان کو تصوف کی زبان میں سیر وسلوک سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی سالک انسانیت کی معراج یعنی قرب توحید تک پہنچے کے لئے مختلف مراحل ومنازل سے گذرے۔فہم وطریقت میں مراحل ومقامات جیسے وہ کیا کرے ، کیا حالات اس کو درپیش آتے ہیں ، اس کے وادرات قلبی کیا ہیں، ان کی کیفیت کیا ہے اور وہ کیا وظائف پڑھے اور کس نوعیت کے مراقبے کرے، اہمیت کے حامل ہیں۔سالک کو راہ ورسم سے مکمل طور پر واقف ہونا چاہئے۔ ان مراحل و منازل سے گزرنے کے لئے ایک انسان کامل، خضر راہ ، پیر طریقت اور طائر قدس کی رہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے ، تاکہ وہ سلوک میں گمراہی کے خطرات سے محفوظ رہ سکے اور منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ درحقیقت عملی اور علمی عرفان میں ایک طرح کا تعامل وتوافق برقرار ہے، جو یہ عرفانی سیر وسلوک میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ استاد شہید مطہری نے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ ہم یہاں لازمی سمجھتے ہیں کہ استاد کی نظر میں عرفان وفلسفہ اور عرفان واخلاق میں جو یکسانیت یا فرق موجود ہے، اس کا بھی ذکر کریں۔

استاد مطہری کا عقیدہ ہے کہ عرفان نظری چونکہ ہستی کی تفسیر بیان کرتا ہے، خدا، دنیا اور انسان سے بحث کرتا ہے، جیسا کہ فلسفہ الٰہی کا کام ہے، اس لیے اس میں مختلف موضوعات اور مسائل سے سابقہ پڑتا ہے ۔ آپ کا یہ بھی ماننا ہے کہ عرفانی نوعیت کے استدلال میں عرفانی، کشفی اور ذوقی سرچشموں سے استفادہ کیا جاتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں فلسفیانہ تعبیر سے کام لیا جاتا ہے، اس لئے فلسفہ اور عرفان میں بعض باتیں مشترک ہیں۔ اس کے باوجود ان دو میدانوں میں امتیازات بھی ہیں:

۱۔بینش کے میدان میں اختلاف اور فرق ہے۔

۲۔طریق کار اور روش میں اختلاف ہے۔

بینش سے مراد یہ ہے کہ عارف کی نظر میں صرف خدا اصل ہے ۔ اس کے علاوہ سب اس کے نمود ومظاہر ہیں۔ عرفان میں شخصی وجود کی وحدت یا مظاہر کی ذات کے وجود پر یقین کیا جاتا ہے۔ اس کے بر خلاف فلسفے میں خدا اور غیر خدا اصل چیز اور خدا واجب الوجود اور قائم بالذات ہے اور غیر خدا ممکن الوجود، قائم بالغیر اور واجب الوجود کا معلول ہے۔

عارف اپنی بینش میں، شہود حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور قرب الٰہی کے سایہ میں خدا کی ذات میں فنا کے مقام تک رسائی حاصل کرلیتا ہے، یہ سب کچھ اسے سیر وسلوک سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بر خلاف ایک فلسفی اپنی بینش میں یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ دنیا کو سمجھے اور اس کے ذھن میں دنیا کی ایک مکمل اور جامع تصویر مرتسم ہوجائے، یعنی عرفانی بینش میں سلوک وشہود یا ''ہوجانے'' کی بات کی جاتی ہے اور فلسفیانہ بینش میں، ''پہچانا اور سمجھنا'' اصل مقصد ہے۔ جہاں تک ذرائع اور طریقوں کی بات ہے وہاں بھی عرفان وفلسفے میں فرق ہے۔ عرفانی طریقہ سلوک کا ہے، جو تزکیہ وتہذیب نفس اور باطنی نورانیت سے وابستہ ہے۔ فلسفیانہ طریقہ عقل واستدلال وبرہان پر منحصر ہے۔ عارف اپنا مقصد قلب و دل کے راستے سے حاصل کرتا ہے اور ایک فلسفی اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے عقل وذہن کا سہارا لیتا ہے ۔ اسی لئے فلسفہ اور اس کے مسائل کی افہام وتفہیم کے ضمن میں استاد مطہری کا فرمانا ہے کہ: جب تک ہم ذہن کونہیں پہچانتے، اس وقت تک فلسفہ کونہیں پہچان سکتے۔

عرفانی مباحث کا دارومدار وہ چاہے عملی عرفان ہویا علمی عرفان، دل، راہ قلب اور فطرت قلبی کی شناخت پر ہے۔ اس وجہ سے حکمت وعرفان کے ذرائع کو واضح کرنے کے لئے استاد مطہری نے لکھا ہے :

فلسفی کے ذرائع عقل منطق اور استدلال ہیں لیکن عارف مجاہدہ، تصفیہ، تہذیب باطن میں حرکت وجدوجہد سے کام لیتا ہے۔

استاد شہید مطہری نے فلسفہ اور حکمت اشراق وحکمت متعالیہ میں نظریات کے فرق کو بھی واضح کیا ہے اور اس سے مفصل بحث کی ہے۔ یہ خود ایک وسیع دنیا ہے، جس کا سمجھنا ضروری ہے۔ استاد نے آخر میں حکمت وعرفان میں فرق پر ایک جامع نوشتہ تحریر فرمایا ہے کہ:

حکمت الٰہی میں معرفت خداوندی خاص مقصد نہیں، بلکہ اصل مقصد نظام ہستی کا سمجھنا ہے، جس حالت میں وہ موجود ہے۔ ایک حکیم کی معرفت جو اس کا اصل مقصد ہے، ایک نظام تشکیل دیتی ہے، البتہ معرفت خداوندی اس نظام کا ایک اہم رکن ہے، لیکن عرفان کی نظر میں ، مقصد صرف معرفت اسلام کی ہے۔ عرفان یہ کہتا ہے کہ اللہ کی معرفت ہی سب چیزوں کی معرفت ہے۔ ہمیں معرفت خداوندی کے سایہ میں تمام چیزوں کو سمجھنا چاہئے۔ اور تمام چیزوں کی معرفت ،اللہ کی معرفت کی فروعات ہیں۔

استاد شہید مطہری اخلاق کو عملی عرفان کا مقدمہ سمجھتے ہیں اور عملی عرفان کے حصے کو اخلاق اور علم اخلاق کی مانند قرار دیتے ہیں ۔ یہ دونوں انسان کے خدا سے اور خود انسان سے روابط اور'' کیا کیا جانا چاہئے اور کیا نہیں کیا جانا چاہئے'' اور یہ کام انجام دینے کے لئے طریقوں سے بحث کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت عرفان و اخلاق کی وجہ مشترک ہے۔

استاد شہید مطہری نے اخلاق وعرفان میں فرق مراتب سے بھی بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ:

عملی عرفان خدا سے انسان کے رابطہ پر بحث کرتا ہے۔ اس میں انسان ، اور خود عرفان کے روابط سے بحث کی جاتی ہے ۔ انسان وخدا کے درمیان رشتے کی بحث اخلاق کے تمام نظاموں میں موجود ہے، لیکن دینی ومذہبی اخلاق کے نظاموں میں ہی اس پہلو پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی ہے۔

عرفانی سیروسلوک متحرک ہے، یعنی ان کا انحصار منازل پر ہے۔ اس میں مراحل ومقامات سے گذرا جاتا ہے۔ یہاں منازل ومقامات کے درمیان علی ومعلولی نوعیت کا رشتہ برقرار ہے، لیکن اخلاق میں اس نوعیت کا رشتہ موجود نہیں۔ اخلاق ساکت وساکن ہے ۔ یہاں آغاز وانجام ، مراحل ومقامات کی گفتگو نہیں کی جاتی۔ اس وجہ سے عرفان میں'' صراط'' اور طریقت میں تربیت منازل کی بحث موجود ہے جبکہ اخلاق میں یہ نظام موجود نہیں۔

اخلاق کے روحانی عناصر ایسے معنی ومفاہیم میں محدود ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر ہمارے لئے اجنبی نہیں، لیکن عرفان کے روحانی عناصر وسیع تر اور ان کا میدان زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ عرفانی سیروسلوک میں واردات احوال، کشف وشہود اور عرفانی تجربات کا ایک سلسلہ موجود ہے، جس کا تعلق سالک راہ سے ہے اور دوسرے لوگ اس سے بے خبر اور بے بہرہ ہے۔

ایک بہت بنیادی سوال قدیم دور سے پوچھا جاتا رہا ہے جو آج بھی موجود ہے اور اس کا جواب دینے میں مفکر، مورّخ، حکماء، عرفا اور فقہا سب ہی مصروف رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ عرفان کو دین سے اور خاص طور پر عرفان کی اسلام سے کیا نسبت ہے؟ اس سوال کا صحیح اور جامع جواب دوسرے بہت سے سوالات اور شبہات کا ازالہ بھی کرسکتا ہے ۔ مثال کے طور پر آیا عرفان دینی کا کوئی وجود ہے یا نہیں؟ آیا عرفان اسلامی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ یا یہ سوال کہ عرفان بنیادی طور پر دین ومذہب سے ماورا کوئی چیز ہے، جو ادیان کے قالب میں سما نہیں سکتا یا یہ سوال کہ آیا دین ومذہب سے علاحدہ بھی عرفان کا وجود ہوسکتا ہے؟ یعنی کیا عرفان غیر دینی یا الحادی ہے؟ مختلف اسلامی فرقوں اور مشرب کے لوگوں میں اس سلسلہ میں سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، لیکن اس ضمن میں استاد شہید مطہری کا ایک خاص عقیدہ ہے، جسے انہوں نے کمال شجاعت وصراحت سے بیان کردیا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

ایک علم جس نے اسلامی تہذیب کی آغوش میں جنم لیا، پلا، بڑھا اور تکمیل کے مراحل طے کئے، وہ علم عرفان ہے، یعنی استاد عرفان کی جائے پیدائش، اس کا مکمل ہونا، اس کا رشد ونمایاں ہونا، امور کو اسلامی تہذیب وتمدن کی دین سمجھتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ عرفان عملی اور نظری میدانوں میں مقدس دین اسلام سے مربوط ووابستہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام دوسرے دین اور مذہب بلکہ دوسرے تمام ادیان ومذاہب کے مقابلے میں اس بات پر زیادہ زور دیتا ہے کہ انسان کے خدا سے، دنیا سے اور خود اپنے آپ سے، کیا روابط ہیں۔ اسلام ان روابط کو بیان کرتا ہے اور اسی طرح ہستی کی تفسیر اور توضیح بھی کرتا ہے۔

استاد شہید مطہری نے عرفان واسلام کے رابطہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:
اسلامی عرفاء یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ کوئی ایسی بات کہہ رہے ہیں جو اسلام سے ماورا ہے۔ وہ اس طرح کی نسبت سے بہت دور ہیں اور اسے برا سمجھتے ہیں ۔ اس کے برعکس وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اسلامی حقائق کو دوسروں سے زیادہ جانا ہے اور واقعی مسلمان وہ ہیں۔ عرفاء نے عملی اور

علمی میدانوں میں، ہمیشہ کتاب وسنت و سیرت نبوی اور ائمہ و اکابر صحابہ سے استناد کیا ہے ۔ عرفان اسلامی کے اوّلین سرچشمے اور اس کا مواد استاد مطہری کی نظر میں اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن ہے۔ یہ عالم وجود واسلامی ہستی کی شناخت کے معاملات میں جلوہ گر ہے۔ خدا سے انسان کا رشتہ، انسان کا خود اپنے آپ سے رشتہ، انسان کا سماج سے رشتہ اور انسان کا دنیا سے رشتہ، ان امور پر عملی ونظری حیثیت سے اسلامی مکتب وتہذیب میں نہایت خوبی اور جذبے کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اسلامی رجحانات اور اسلامی تہذیب کی سطحیں ہی باطنی اور عرفانی سطحیں ہیں۔ عرفاء نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی متون وبطون سے ان کا استخراج کیا ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ اسلامی محدثین وفقہا کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ عارف اسلام کے پابندنہیں،عرفان کا کتاب وسنت سے استنادعوام فریبی ہے ۔ اس گروہ کی نظر میں عرفان کو اسلام سے کوئی ربط ونسبت نہیں۔

دوسرا گروہ جو معاصر متجددوں پر مشتمل ہے، کہتا ہے کہ عرفان وتصوف اسلام وعربوں کے خلاف ایک تحریک ہے جو معنویت کے پردے میں چلائی جارہی ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ عرفان ایک ایسی وارداتی اور اجنبی تحریک ہے، جو اسلام ومسلمانوں کی مخالفت میں جاری ہے۔ استاد شہید مطہری کا عقیدہ ہے کہ پہلا گروہ اسلام کی اورعام مسلمانوں کی بنیاد پر عرفاء اورعرفان کی مخالفت کرتا ہے۔ دوسرا گروہ بعض عرفاء کی شخصیت کو لے کر اسلام سے نبرد آزما ہوجاتا ہے ۔ یہ اسلام کے گہرے اور ظریف افکار وخیالات کی بھی مخالفت کرتا ہے۔

ایک گروہ اعتدال پسندوں کا ہے۔ یہ بے طرفی سے کام لیتے ہیں۔ یہ بعض عرفانی نظریات خاص طور پر عملی تصوف کی مخالفت کرتے ہیں ،جس کے نتیجے میں فرقہ بازی ، بدعات ، اور اصل اسلام سے انحراف وجود میں آئے ہیں۔لیکن ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ عرفاء اسلامی تہذیب کے مختلف فرقوں اور اسلام کے پیشتر طبقات کی مانند اسلام سے نہایت خلوص کا رشتہ رکھتے ہیں اور ان کی نیت میں کوئی فتور نہیں۔

استاد شہید مطہری نے تیسرے نظریئے کو دوحصوں میں قبول کیا ہے:

ایک حصہ وہ ہے جو اسلامی تہذیب کی گہرائیوں اور باطنی معارف سے تعلق رکھتا ہے اور جسے عرفان کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرا وہ حصہ ہے جو بعض عرفاء کے عرفانی نظریات اورعرفاء کے بعض فرقوں کی کارکردگی اور ان کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ:

عرفان، اسلامی معارف وتہذیب وتمدن کے میدانوں میں ایک ہے۔ اس سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے۔ مقدس دین اسلام کی باطنی سطوح، اصلی اور خالص اسلامی عرفان میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود عارفوں کا عمل اور عرفاء وتصوف کی کارگردگی پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ بہرحال عارفوں کے نظریات کی کتاب وسنت اور اصلی اسلامی تہذیب اورعرفان وتصوف کی کارگردگی میں مطابقت کا تجزیۂ اور اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگائیں جو اس میدان کے ماہر ومتخصص اور کارشناس ہیں۔

استادمطہری کا نظریۂ ہے کہ اسلامی عرفان نے اپنا اصلی مواد اسلام سے اخذ کیا ہے۔ عرفا نے ان کے لئے اپنے ضوابط و اصول وضع کئے ہیں ۔عرفان بتدریج اسلامی تہذیب میں پروان چڑھا اور مکمل ہوا۔ عرفانِ نظری اور عملی کی تفسیر اور ان کے حصول اور ترقی میں بعض دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں، جیسے کلامی وفلسفی افکار پر اشراقی فلسفہ کے خیالات نے خاص طور پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ استاد مطہری نے بعض فقہاء کے عرفان پر نظریات اور اس کی نفی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ کا نقطۂ نظر کسی بھی طرح قابل قبول نہیں۔ اوائل کے اسلامی نظریات اس قدر غنی اور وسیع ہیں کہ یہ گروہ اپنی نادانی کی وجہ سے اس کو سمجھ نہیں سکے۔ توحیداسلامی بھی اس قدر سادہ نہیں جیسا کہ اس گروہ نے فرض کرلیا ہے۔ اسی طرح انسان کی معنویت بھی اسلام میں صرف خشک زہد پر نہیں ہے، اور حضور اکرمؐ کے نیک صحابہ بھی اس قسم کے نہیں تھے۔ اسلامی آداب محدود نہیں ہیں ۔ اسلامی تعلیمات نے گہرے معارف کے ایک سلسلے کو سرشار کیا ہے۔

استادمطہری نے اس سلسلے میں قرآنی آیات پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

ظاہر ہے اس قسم کی آیات،افکار وخیالات کو برتر اور عالی تر توحید کی طرف مائل کرتے ہیں اور یہ، بقول استاد، توحیدعوام سے مختلف ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر نکلسن اور میسی تیون جیسے افراد نے، جن کا اسلامی عرفان کا مطالعہ وسیع ہے اور جو اسلام سے بھی بیگانہ نہیں ہیں، یہ اعتراف کیا ہے کہ عرفان اسلامی کا اصل سرچشمہ قرآن وسنت ہے۔

استادشہید مطری نے عرفان اسلامی کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے ۔ ہر مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور کامیاب کوشش کی ہے کہ وہ عرفان کے ان تمام پہلوؤں پر اظہار خیال کریں جو باعث اختلاف رہے ہیں اور جن کی وضاحت میں خود عارف وغیر عارف سرگردان رہے ہیں۔ ایسے ہی مسائل میں ''وحدت الوجود'' بھی ہے ۔ استاد کا قول یہ ہے کہ وحدت الوجود کو لوگ سمجھ ہی نہیں سکے۔ اسی وجہ

سے اس کی مختلف علماء ودانشمندوں نے مختلف نوعیت کی تعریفیں کی ہیں ، جس کی وجہ سے ''وحدت الوجود'' ایک اختلافی مسئلہ بن گیا ہے ۔ استاد نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ وحدت الوجود میں حلول واتحاد کی کوئی گنجائش نہیں اور منصور حلاّج کے ''انا الحق '' میں بھی نہ اتحاد ہے اور نہ حلول۔

استادمطہری نے عرفان میں ماوراء الطبعی مفاہیم پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک عارف کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا تک پہنچنے کو افضلیت دے، نہ کہ اُسے سمجھنے کو۔ اور یہ رسائی اس وقت ممکن ہے جب ایک شخص منازل ومراحل کے سلسلے سے گذرے جسے عرفان میں ''سیر وسلوک'' کہتے ہیں ۔استاد نے ریاضت مجاہدہ، عشق ومحبت ، عشق مجازی اور عشق حقیقی وغیرہ عرفانی موضوعات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان امور کی وضاحت میں اپنے کمال علم ومشاہدہ کا مظاہرہ کیا ہے۔

استاد شہید مطہری کی اپنی زندگی بھی ایک عارف کی زندگی تھی۔ وہ ہر روز حتی کہ سفر میں بھی طلوع فجر سے دو گھنٹے پہلے بیدار ہوتے اور عبادت میں مشغول ہوجاتے۔کبھی کبھی مشغولیت کی وجہ سے رات میں دیر سے سوتے، لیکن صبح کی اس عبادت کے معمول میں کوئی فرق نہ آتا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک شخص حضرت حق کے ساتھ عشق وانس کے سائے میں زندگی گذارے۔ رہبر معظم حضرت آیت اللہ خامنہ ای، استاد شہید مطہری کے دوست وہم فکر ہیں۔ آپ نے استاد مرحوم کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایک عبادت گذار انسان تھے، اہل تصفیہ وتزکیۂ اخلاق وروح تھے۔ جب آپ مشہد آتے تو ہمارے گھر اکثر آجاتے اور کبھی کبھی اپنی بیگم کے رشتے داروں کے گھر بھی جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ ہر رات ، آدھی رات تک بیدار ہو کر تہجد پڑھتے اور اپنے رب کے حضور میں گریہ وزاری کرتے تھے۔ یہ گریہ وزاری اور مناجات اس قدر بلند آواز میں ہوتی تھی کہ گھر کے افراد جاگ جاتے تھے۔

☙•❧

امام الاولیاء پیران پیر حضرت علیؑ

سرخیلِ سلاسلِ صوفیاء بالخصوص سلسلہ عالیہ چشتیہ

ڈاکٹر سید لیاقت حسین معینی

مولودِ کعبہ، اسد اللہ غالب، اخی رسولؐ ،شوہر زہرا و پدرِ حسنینؑ ،جد امامین المعظم ،مرشد اولیاء عظام واہل اللہ اکرم مولائے کائنات شاہِ عرفان اکمل لا کملان بحرِ حقائق ومعارف سرمایہ افتخار برائے عابدان وزاہدان باعث سند عطاء استاد امیر المومنین ابو تراب حضرت علیؑ کا سلاسلِ صوفیاء میں ایک نمایاں مرکزی وکلیدی مقام ہے۔

والدمحترم حضرت ابو طالبؑ جن کی سرپرستی اورمحافظتِ رسولؐ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور جن کی عشق ومحبت رسولؐ ویقین بالرسول نبوت کا مظہر یہ شعر اہل اللہ کے لیے باعثِ روشن چراغ ہے۔

وابیض یســقی الغمام بوجه

تمال الیتٰمی عصمته الادرمال

(اے کہ وہ (محمدؐ)نورانی چہرہ والے جس کے ''وسیلہ'' سے باران ابر رحمت کی دعا مانگی جاتی ہے وہ جو کہ یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں کی عصمت کی ڈھال ہیں)

نبی کریمؐ کے ''وسیلہ'' سے بارگاہِ خداوندی میں حضرت ابو طالب کی عرضداشت نہ صرف حضرت ابو طالب کے ''یقین محکم'' کی دلیل ہے، بلکہ صوفیائے کرام کے لیے مشعل راہ ہے۔اور اس آیت کریمہ کی مصداق'' **یا ایها الّذین آمنوا اتقوا اللّٰه وابتغو الیه الوسیلة** ۔[1]

والدہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت اسد جن کی وفات پر رحمت اللعالمین نے یہ کہہ کر گریہ فرمایا کہ میری ماں کے بعد اس خاتون نے میری کفالت کی، اور اپنا کرتا ان کی مقدس نعش مبارک کے ساتھ قبر میں رکھا۔ بالفاظ دیگر ''خلعت'' عطا فرمایا، یہاں بھی اک لطیف اشارہ بہ ردائے صوفیان نظر آیا کہ خلعت عطا ہوتا ہے۔

نبی کریمؐ کے آغوش کے پرورده زیر سایہ رحمت اللعالمین تربیت یافتہ، صحبت رسالت سے آراستہ خدمتِ نبوت سے پیوستہ وآراستہ ''مولا علیؑ'' ہی درحقیقت علمِ حقیقت ومعرفت ولدونی کے

وارث کامل ہو سکتے تھے، جس کا ثبوت نبیؐ کا اپنے بستر میں لٹا کر ہجرت کرنا اور پھر یہ اعلانِ صادق کرنا کہ:

"انا مدینة العلم و علیٌ بابھا"

''میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ'' یعنی بذریعہ علیؓ ہی مجھ تک پہنچ سکتے ہیں وہ تمام سلاسلِ اہل اللہ جن کو صوفیاء کی زبان مین اشجار روحانی کہتے ہیں۔

جنگ خیبر میں اعلانِ نبویؐ کہ کل ''جھنڈا'' اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا جس کو اللہ اور اس کا رسولؐ عزیز رکھتا ہے اور فتح جس کا مقدر ہے اور پھر چشمِ مبارک میں دہن رسولؐ کے چند قطرے علی المرتضیٰؓ کو وہ بصریت عطا کر گئے، جن کو صاحب مشاہدہ حضرات حجابات الٰہی کے ہونے کے مقام وراز بتاتے ہیں۔

معراج النبیؐ کے موقع پر وہ 'جبہ عرش بریں جو آقا ومولیٰ مدنی سرتاج کو عطا ہوا، اس کے حقیقی حقدار بھی شیر خداؓ ہی ہوئے اور جو سلاسل صوفیاء میں ایک عظیم برکات ورحمتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

اور پھر وہ آخری اعلان کہ

"من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ" یعنی میںؐ جس کا مولا (مالک) ہوں علیؓ اس کے مولا ہیں۔

اس بات کی تکمیل کر گیا کہ تم میرے لیے اس طرح ہو جس طرح موسیٰ کے لیے ہارون، اس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، اس کو مواخاۃ مدینہ کے واقعے نے اور بھی مستحکم کردیا کہ تم میرے بھائی (اخی) ہو آؤ سینہ با سینہ ہوجاؤ۔

اور پھر چشتی بزرگان دین نے اس قولِ نبوی کو کہ **"من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ"** اپنی طرح امتیاز روحانی محافل ذکرانہ کا یعنی سماع کا پیش خیمہ مان لیا اور اسی قول سے شروع کی جاتی ہے محفلِ سماع۔

آیت مباحلہ نے طے کردیا کہ اہل بیت حضرات کا مرتبہ ومقام ''ونسبت'' نبوی کیا ہے یہ ایک اور انوکھی شانِ مصطفیٰ تھی کہ اعلان ہوگیا کہ جو کچھ ہیں یہی میرے ہیں۔ ۲

اور میں نہیں مانگتا اپنی رسالت کی کوئی اجرت یعنی پیغام الٰہی پہچانے کا صلہ، سوائے اس کے کہ میرے اقرباء سے مودت کرو۔

قل لا أسئلکم علیه اجراً الاّ المودة فی القربیٰ۔ ۳

یہ شان بھی ''اس صوفی اعظم'' والی مرتبت کی ہوسکتی ہے کہ حضراتِ حسنینؑ کی علالت میں ''نذر'' مانی جائے تین روزوں کی۔ ادائے نذر پر زہراء اور کنیز فضہ بھی شامل ہیں۔ تینوں دن افطار کے وقت یتیم ومسکین واسیر نے صدا دی اور صرف پانی پر اکتفا کرکے مولاؑ و فاطمہ (س) اورفضہ نے سامانِ افطاری ان کے حوالہ کردی، چنانچہ قرآن پکار اٹھا:

ویطعمون الطّعام علٰی حبه مسکیناً وّیتیماً واسیراً انّما نطعمکم لوجه اللّٰه لا نرید منکم جزاء ولا شکورا۔ [۴]

مولا کی سیرۃ کی شانِ اعلیٰ تو اس کی مصداق تھی ہی، کنیز بھی اس مقام پر تھی کہ الامان والحفیظ! جہاںکنیزوں کا یہ عالم ہووہاں آقا ومولیٰ کا عالم کیا ہوگا؟

اور پھراس آیات کریمہ کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی نجوکم صدقة، ذلک خیرٌ لّکم واطھر۔ [۵]

احکام کے مطابق سیدنا علی مرتضیٰ کو واحد شرف حاصل ہے کہ صدقہ نذر بارگاہ نبوی میں پیش کرکے چندسوالوں کے جواب حاصل کئے اور پھر یہ پابندی اٹھالی گئی۔صرف اورصرف علیؑ کو ہی یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ اس احکام قرآن کی تعمیل کرسکے۔حضرت امام احمد رضا کے مطابق جوسوالات سرکارِ دو عالمؐ سے امیر الاولیاء نے دریافت کئے وہ تھے وفا (توحید کی شہادت) فساد (شرک وکفر) حق (اسلام وقرآن) اور ولایت (جب تجھے ملے) حیلہ/تدبر (ترک حیلہ)، لازم (اللہ اس کے رسولؐ کی اطاعت) دعا کیسے مانگوں (صدق ویقین کے ساتھ مانگو) (عاقبت) نجات حاصل کیسے ہو (حلال کھانا اور سچ بولنا) مسرور (جنت ہے) راحت (اللہ کا دیدار)

مندرجہ بالا سوالات وجوابات رسول بنی ہیں صبر تصوف اور حبیب اللہ ہونے کی ۔یہی چند منفردشان علی تھی کہ حضرت عمر جیسا خلیفہ پکار اٹھا کہ ''اگرعلی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوگیا ہوتا'' اور اولادِ عمر نے اولادِعلی ورسولؐ سے پروانہ غلامی حاصل کیا۔

یہ شانِ امام حسنؑ تھی کہ اتمام حجت کرکے ملوکیت بنوامیہ کے حوالہ کردی اور شانِ امام حسینؑ تھی کہ معرکۃ الآرا جہاد وشہادت تک اللہ ورسولؐ کی محبت پر اولاد ومال کی محبت غالب نہ ہو۔ایمان مکمل نہیں ہوتااگر زین العابدینؑ اور باقر وجعفرحسن بصریؒ وکمیل بن زیاد کے کردار اوران کی

تعلیمات نے بقائے اسلام وایمان اس کی اصل صورت نمائیاں نہ کردی ہوتی ،کہ پرآشوب دور میں ایمان کو جلابخشی یہ سب ہر دور کے لئے داستانِ تصوف میں ایک رنگین باب بھی ہے اور یہ اعلان بھی کہ درحقیقت دلوں پر راج ہمارا ہے تبھی تو فرزدق بے اختیار پکارا ٹھا کہ:

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے نشان قدم کو ہ وحرم پہچانتے ہیں۔ یہ خدا کے بندوں میں سے بہترین بندے کا فرزند ہے، جن پر تمام خوبیاں ختم ہوچکیں اور ممکن ہے کہ حجرِ اسود ان کی انگلیوں کی راحت کو پہچان کر ان کو تھام لے۔حسن اخلاق، پاکیزہ خصلت سے آراستہ جن کا فیض بارش کی مانند ہے اور کوئی ان کی سخاوت اور کوئی قوم ان کی برابری نہیں کرسکتی۔ ان سے محبت کرنا دین اور بغض رکھنا کفر، ان کی شرافت،فضیلت اور بزرگی لوح وقلم پر محفوظ ہے۔ ان کا ذکر بعد ذکر خدا مقدّم، جن کو معرفتِ خدا حاصل ہے وہ ان کی برتری سے واقف ہیں۔''

تصوف کے سارے ۶ اوصاف اس گھرانے کے لیے مقصود تھے۔ اور یہیں سے اس کی روانی دوسروں کو جاتی ہے۔ رئیس الطائفہ حضرت جنید بغدادی کے قول **شیخنا فی الاصول و البلاء علی المرتضی** (اصول وبلاء میں ہاں مرے رہنما وپیشوا علی مرتضٰی ہیں)،کاان پر صد فیصداطلاق ہوتا ہے۔

فرمودات:

فرمایا مولاؑ نے ''سب سے اچھا عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کوتونگر وغنی کرنا ہے تا کہ دنیا کی نیستی پریشان نہ کرے اور ہستیِ دنیاخوش نہ کرسکے۔''

''مصیبت زدہ کی فریادرسی اور مبتلائے رنج کی تکلیف دور کرنا، بڑے گناہوں کا کفارہ ہے۔''

''بہترین زہد، زہد کو چھپانا ہے''۔

''ایمان کے چارستون ہیں صبر، یقین، عدل وجہاد''۔

''قدر کی تعریف یہ ہے کہ اس نے بنایا ہے وہ جیسا چاہے استعمال کرے گا''۔

''بغیر طلب کے کچھ عطا کرنا سخاوت اور مانگنے والے کو کچھ دینا بخشش ہے''۔

''سخاوت یہ ہے کہ مانگنے سے پہلے عطا ہو اوراس کے بعد تو شرم اور خفت سے بچاؤ''۔

''قناعت وہ مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جب عقل پختہ ہوجاتی ہے تو گفتگو کم ہوجاتی ہے''۔

دغلب یمنی نے آپ سے سوال کیا کہ کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے تو آپ نے فرمایا'' کیا میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں، جسے میں نے دیکھا تک نہیں۔'' اس نے کہا'' آپ اسے کیونکر دیکھتے ہیں'' تو آپ نے کہا'' آنکھیں اس کو کھلم کھلا نہیں دیکھتیں ، بلکہ دل ایمانی حقیقتوں سے اسے پہچانتے ہیں۔''

''اگر درمیان میں موجود تمام پردے بھی اٹھا دئے تو بھی میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا (پہلے ہی اتنا یقین کامل ہے)

''میرے پاس دنیا کی کوئی چیز نہیں، میرے پاس تو صرف جان ہے سووہ خدا پر قربان''۔

''جو لوگ خدا کی عبادت شوق جنت میں کرتے ہیں ان کی عبادت تاجرانہ ہے، جو جہنم کے ڈر سے کرتے ہیں ان کی غلامانہ ہے اور جو اسے لائق عبادت سمجھ کر اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کی عبادت آزادانہ ہے۔''

''یہ محتاج اور سائل خدا کے خاص بندے ہیں جس نے انہیں نہ دیا اس نے خدا کو نہ دیا جس نے ان کو دیا اس نے خدا کو دیا۔''

''کنجوسی تمام برائیوں کی جامع ہے''۔

''تقویٰ صفات واخلاص کا سرور ہے''۔

''خدا کے کچھ بندے یعنی اولیاء اللہ ایسے ہیں جن کو خدا نے اپنی نعمتوں کے لیے مخصوص کیا ہے تا کہ دوسروں کو فائدہ ہو۔ خدا ان کو نعمتیں دیتا ہے جسے وہ دوسروں کو عطا کرتے ہیں''۔

ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے بانی خواجہ خواجگان حضرت سیدنا خواجہ معین الدین چشتیؒ روحانی پیشوا کی حیثیت سے خود اس برصغیر میں یہی پیغام تصوف حضرت علیؑ سے منسلک کرکے لائے اور اپنی عام محافل ، اور بالخصوص سماع کی محفل میں مولا کی عظمت کا بیان من کنت مولاہ، سے رکھا، جس پر امیر خسرو چشتی نے ترتیب وتضمین کی۔ شاہ مرداں، شیر یزداں قوت پروردگار کی شان ہمیشہ سے ہی ''مشکل کشا'' کی رہی۔ اس سلسلہ کے بعد کے بزرگان بھی وابستہ علیؑ رہے۔

حضرت علامہ نیاز بریلوی کی نعتیں بہ شان حضرت علیؑ آج بھی خاص وعام کی زبان پر ہیں اور محفل سماع میں روحانیت کو دوبالا کرتی ہیں۔

خواجہ اجمیریؒ کی مشہور رباعی ''شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسین'' یا قول نیاز اے دل بگیر

دامن سلطان اولیاء یعنی ''حسین ابن علیؑ جان اولیاء'' من کنت مولاہ کے بعد جب کوئی بھی محفل عرس میں قوالوں کی زبان پر آجاتی ہے تو حضور کی حدیث کہ علیؑ کی محبت پہچان مومن کی اور علیؑ کی دشمنی منافق کی پہچان۔ کی مصداق نذر آتی ہے۔ دوسرے سلاسل کے بزرگ بھی مولاؑ کی معرفت وحقیقت کے پیمانہ سے لبریز نظر آتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی مجتہد عصر شخصیات کا میلان بھی اسی مناسبت سے حضرت علیؑ کی طرف زیادہ رہا۔

اسی نسبت اور مناسبت سے ان بزرگوں کو خاص کر چشتی درگاہوں، آستانوں اورخانقاہوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اہل بیتؑ وائمہ کے تعلق سے جو وارفتگی شگفتگی اور شیفتگی ہے، وہ رشک ملائکہ ہے۔ محرم شریف کے تعلق سے خصوصاً چشتی مجالس جس ادب واحترام اورعقیدت و رقت سے انعقاد پذیر ہوتی ہیں وہ اہل سنت والجماعت کے ان فرقوں کے لئے باعث عبرت ونصیحت ہیں کہ جن کی نگاہ میں واقعہ کربلا صرف اک سیاسی مڈبھیڑ تھی (معاذ اللہ) اس لیے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے قرآن وسنت کے ساتھ اہل بیت واہل اللہ بھی ضروری ہیں اور یہی اصل تصوف ہے عظیم صوفی وہ ہے جو اس پر عمل پیرا رہے اور اسی کو بارگاہِ رب العزت میں بھی وہ مرتبہ حاصل ہے جسے حبیبؑ (دوست) کا درجہ ملتا ہے جو حضرت خواجہ اجمیریؒ کی بوقت وصال پیشانی مبارک پر جلوہ گر تھا اور یہی فنائیت ہے **ھو حبیب اللّٰہ مات فی حب اللّٰہ** ۔ واضح رہے کہ اللہ، اس کے رسول اور اہلبیت عصمت وطہارت کی محبت میں مرنے والا شہید اور ابدی حیات کا مالک بن جاتا ہے۔

حوالے:

۱(سورۂ مائدہ، رکوع ۸، آیت ۳۵)
۲(آل عمران، آیات ۶۱)
۳(الشوریٰ،بر پارہ ۲۵، رکوع ۴ آیت ۲۳)
۴(الدہر، رکوع ۱۸ آیات ۹، پارہ ۲۹)
۵(المجادلہ ۲۸ رکوع، آیات ۱۲ر پارہ)

ملفوظات ومنقولات حضرت علی علیہ السلام
عرفان وتصوف اسلامی کا عظیم سرمایہ

پروفیسر عراق رضا زیدی

ملفوظات، ملفوظ کی جمع ہے۔ فیروز اللغات میں اسکے معنی ''اولیاء اللہ کا کلام، بزرگوں کا کلام' وہ کتاب جس میں کسی بزرگ کی کیفیت اسی کی اپنی زبانی لکھی گئی ہو'' دیئے گئے ہیں۔ فارسی ادب میں یہ ایک مستقل صنف نثر ہے۔ جس کے تحت انیس الارواح ، دلیل العارفین، فوائد السالکین ، اسرار الاولیاء، راحت القلوب ، فوائد الفوائد ، افضل الفوائد، سیر الاولیاء، خیر المجالس، مفتاح العاشقین، سیر العارفین ، اخبار الاخیار اور مقابیس المجالس وغیرہ کے نام آتے ہیں ۔ ان میں کچھ ملفوظات کو جعلی بھی کہا جاتا ہے ۔ اس کے باوجود وہ ملفوظی ادب کا حصہ ہیں اور فارسی ادب میں ان کے اسلوب ، دلکش انداز بیان اور اخلاقی حکایات کی بنا پر ایک اہم سرمایہ کی صورت میں دیکھا جاتا ہے۔ ہر صنف سخن یا صنف نثر پر قلم اٹھانے کے لئے اس کے ماٴخذ اور آغاز کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے ،مثلاً غزل کے لئے کہاجاتا ہے کہ یہ عربی قصیدے کی تشبیب سے ماخوذ ہے اور قصیدے کے تشبیبی یا تمہیدی جز کو الگ کر کے صنف غزل کی شکل میں اپنایا گیا، جو آج تک اصناف سخن میں ہر صنف سے زیادہ مقبول ومعروف صنف ہے۔ غزل کی طرح اکثر اصناف سخن ونثر،فارسی زبان میں عربی زبان سے ہی ودیعت ہوئی ہیں۔ افسوس کہ آج تک کسی دانشور نے صنف ملفوظ کے ارتقاء وبنیاد کی طرف قلم کو جنبش دینے کی کوشش نہیں کی۔ جب کہ صرف یہی تنہا وہ صنف نثر ہے، جس کا آغاز کلام خدا سے ہوتا ہے۔ اللہ کے کلام میں چار مشہور کتابوں ''توریت'' انجیل ، زبور اور قرآن شریف'' کے ساتھ ساتھ سیکڑوں صحیفوں کا بھی پتہ چلتا ہے، جو اپنے اپنے وقت کے رسولوں پر نازل کیے گئے ہیں۔ جس کی گواہی قرآن میں جگہ جگہ موجود ہے۔ عیدین میں قرائت کی جانے والی سورۂ اعلیٰ کا اختتام بھی اسی شہادت پر ہے۔

"ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم وموسیٰ[۲] ۔ "بیشک یہی مضمون پہلی کتابوں میں بھی ہے۔ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی کتابوں میں سورہ ''النساء'' کی ۱۶۳ ویں آیت

میں اس مضمون کو اور بھی وسعت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

''انّا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنّبیین من بعدہٖ۔ واوحینا الیٰ ابراھیم واسمٰعیل ویعقوب والاسباط وعیسیٰ وایّوب ویونس وھارون وسلیمٰن۔ واتینا داؤد زبورا۔[۳]

ترجمہ: (اے رسولؐ) ہم نے تمہارے پاس بھی تو اسی طرح وحی بھیجی ہے، جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد والے پیغمبروں پر بھیجی تھی اور ابراہیمؑ و اسحٰقؑ ویعقوبؑ، اولاد یعقوبؑ اور عیسیٰؑ وایوبؑ ویونسؑ وہارونؑ وسلیمانؑ کے پاس وحی بھیجی تھی۔ اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی۔''

وحی بھجنے کا مطلب ہے کہ پہلے اللہ نے حضرت جبرئیل سے کچھ کہا، وہی کلام بعینہٖ حضرت جبرئیلؑ نے مندرجہ بالا رسولوں تک پہنچایا، جسے رسولوں نے لکھ لیا، یا اپنے صحابیوں کو سنایا تو انہوں نے اللہ کے کلام کو یا حفظ کرلیا یا لکھ لیا، جنہیں صحیفہ کہا گیا۔ ان ملفوظات کو ایک نام آسمانی کتاب'' یا ''صحیفے'' کا دے دیا گیا، گویا یہ '' حمد'' کی طرح قصیدہ ہو کر بھی قصیدہ نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ کا ملفوظی کلام ملفوظ نہ کہلا کر ''صحیفہ'' کہلایا۔ اور یہی مقدس نام اس کلام کے لئے زیادہ موزوں ہے۔اللہ کے کلام یا ملفوظات کے بعد نبیوںؐ، پیغمبروںؐ یا رسولوںؐ کا کلام ہے جو ملفوظات کی شکل میں ادب کا حصہ بنا۔ اس ذیل میں ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کا گراں مایہ سرمایہ ہے، جو اصول کافی اور صحاح ستہ وغیرہ جیسی متبرک کتابوں میں موجود ہے۔ یہ وہ ملفوظات ہیں، جو رسول خداؐ کی زبان مبارک سے نکل کر اہل بیت اطہارؑ اور اصحاب کرام کے دلوں کو گرماتے ہوئے سینہ بہ سینہ منزلیں طے کرکے احادیث کی کتابوں کی شکل اختیار کر گئے۔ انہیں بھی ملفوظ نہ کہہ کر احادیث کا نام دے دیا گیا۔ جو اپنی افادیت کے اعتبار سے بالکل درست نام ہے۔ ملفوظاتی ادب کی تیسری منزل ''نہج البلاغہ'' ہے، جس میں حضرت علیؑ کے ملفوظات درج ہیں۔ یہ ان خطبات کا مجموعہ ہیں، جو اکثر حضرت علیؑ نے صحابہ کرام کے درمیان ارشاد فرمائے تھے۔ گوکہ اس میں کچھ خطوط اور فرمان بھی درج ہیں، لیکن زیادہ حصہ ملفوظاتی ادب کا اساسہ ہی ہیں۔ لہٰذا کلام خدا اور احادیث رسول خداؐ کے بعد '' نہج البلاغہ'' ہی وہ کتاب ہے، جسے ملفوظاتی ادب کا سنگ میل یا بنیادی اساسہ کہا جانا چاہئے۔

حضرت علیؑ کی ذات ان تمام سلسلوں کا سرچشمہ ہے، جنہیں ملفوظ کے معنی میں جگہ دی گئی

ہے۔'' اولیاء اللہ کا کلام'' خصوصاً فارسی ملفوظاتی ادب چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کا ادب ہے اور چشتیہ سلسلہ کے پیرو کھلے عام اپنے سلسلے کو حضرت علیؑ پر ہی منتہی مانتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا پڑے گا کہ ملفوظی صنف نثر بھی دوسری اصناف کی طرح فارسی ادب میں عربی زبان سے داخل ہوئی ہے، جس کی ابتداء حضرت علیؑ کے ملفوظات سے ہوئی۔ جسے اہل تصوّف اور اہل عرفان نے فارسی ادب کے آسمان پر روشن کیا ہے۔

عرفان کے ظاہراً لغوی معنی'' اعتقاد بہ یافتن راز ہای آفرینش وحقیقت ہستی از راہ کشف شہود تلاشہای ذہنی'' ہے یعنی پہچاننا خدا کا اور کشف، مشاہدے اور ذہنی تلاش سے راہ حقیقت پر گامزن ہونا اور تصوّف و آموزہ ای عرفانی دربارہ رابطہ انسان وخدا و راہ شناختن خدا' ہے اور اردو لغت میں نام ہے اس علم کا جو صوفی لوگ پڑھتے ہیں یعنی علم فقیری۔ لیکن یہ الفاظ ظاہر سے زیادہ باطن آشنا ہیں۔ اسی لئے ان دونوں الفاظ کی شرح میں عربی ادب میں عموماً اور فارسی ادب میں خصوصاً اہتمام کیا گیا ہے۔ فارسی ادب کی تو تمام مشہور کتابیں تصوّف وعرفان کی تشریح نظر آتی ہیں۔ اب اردو زبان میں بھی اس موضوع پر کافی مواد مہیا کیا جاچکا ہے۔ صوفیاے کرام نے بھی صوفی، عرفان اور تصوف جیسے الفاظ کی جدا گانہ تعریفیں اور تشریحیں کی ہیں۔ ان میں معروف کرخی، ابوالحسن نوری، جنید بغدادی، حصری، جریری، عمرو بن عثمان، ابوعبداللہ، ابوعلی قزوینی، زکریا انصاری، عبدالواحد بن زید، ذوالنون مصری اور علی بن عثمان ہجویری وغیرہ کے اقوال ونام قابل ذکر ہیں۔ اگر ان بزرگوں کے اقوال کی روشنی میں تصوّف کی منزلیں یا ستون مقرر کیے جائیں، تو ان میں اللہ کا ذکر، ایثار وقناعت، ترک دنیا، توکّل وتحمّل، زہدوتقویٰ، صبر ورضا، عبادت وریاضت، عفو ودرگزر، عجز وانکسار، فقر وفاقہ اور نفسانی خواہشات سے بغاوت وغیرہ سرفہرست ہیں،۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے قول کی روشنی میں علم تصوف پر پہلی کتاب لکھنے والے جنید بغدادی ہیں۔

مندرجہ بالا تمام صفات واوصاف رسول خداؐ کی سیرت سے مشتق اور حضرت علیؑ کے کردار کا آئینہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصوّف وعرفان کے تمام سلسلے، سوائے نقشبندیہ سلسلے کے، حسن بصری، امام علی رضاؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام جعفر صادقؑ، امام محمد باقرؑ، امام زین العابدینؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے واسطوں سے آپ ہی پر منتہی ہوتے ہیں۔ حضرت حسن بصری کے علاوہ مندرجہ بالا سبھی نام فہرست اہل بیتؑ اور بارہ اماموں میں شامل ہیں۔

حضرت حسن بصری حضرت علیؑ کی مجلسوں میں اکثر شریک نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ اگر انہیں معلوم ہوجاتا تھا کہ آج مولا علیؑ خطاب فرمانے والے ہیں، تو وہ قلم ودوات لے کر اس جگہ پہنچ جاتے۔ بقول صاحب دائرہ معارف علوی:

'حسن بصری در بصرہ کنار جمعیت انبوہ مسجد با قلم دوات مشغول بود، امیر المؤمنین از بالای منبر او را صدا زد کہ ای حسن! چہ کار می کنی؟ گفت: کلام شما را می نویسم کہ بعد روایت کنم!۵

ترجمہ: حسن بصری، مسجد بصرہ میں ایک مجمع میں قلم دوات لیے بیٹھے لکھ رہے تھے کہ حضرت علیؑ نے منبر سے آواز دی: اے حسن! کیا کررہے ہو؟ حسن نے کہا' آپ کا کلام قلمبند کررہاہوں کہ روایت (نشر) کروں۔

حضرت علیؑ کے اقوال وافکار زرّیں کے فوائد واثرات تحریری وخبری دونوں طرح سے ہم تک پہنچتے ہیں۔تحریری شکل میں وہ خطوط ہیں جو آپ نے اپنے حریفوں ، دشمنوں، دوستوں اوردورِ خلافت ظاہرہ میں اپنے عمّالوں کے نام لکھے ہیں۔ یہ وہ تحریریں ہیں جو بقلم حضرت علیؑ ہم تک پہنچتی ہیں۔ دوسری وہ تحریریں اور دعائیں ہیں جو اکثر صحابہ کرام اور تابعین نے دوران خطابت ومناجات تحریر کی تھیں جیسا کہ ایک واقعہ حسن بصری کا قلمبند کیاجاچکاہے۔خلیل نے اپنی کتاب میں ایسے کئی واقعات نقل کئے ہیں۔اسی ذیل میں ایک واقعہ مالک اشتر کا بھی تحریر کیا جاتاہے۔

'مالک اشتر بہ حارث اعور ہمدانی خود فقیہ واز صاحبان اسرار علیؑ است ، روزی کہ غائب ازاستماع خطبہ جمعہ امام بود؟

نوشتہ آن رامی داد کہ من آن را نوشتہ ام۶

ترجمہ: ایک مرتبہ حارث (جوفقیہ تھے) خطبہ جمعہ میں حاضر نہ تھے تو مالک اشتر نے حضرت سے سن کر لکھا ہوا خطبہ حارث کو دیا کہ لیجیے یہ میں نے لکھا ہے۔

اسی طرح دعائیں اور مناجات بھی سینہ بہ سینہ ہوتی ہوئی تحریری شکل میں آتی چلی گئیں ۔ ان میں دعای مشلول ، دعای کمیل، دعای یستشیر اور دعای حضرت علیؑ وغیرہ اپنی مثال آپ ہیں۔حضرت علیؑ کے خطوط وخطبات کوجمع کرنے کا کام سید رضی علیہ الرحمہ نے خاصی تلاش وجستجو اورتحقیق کے بعد بہ حسن وخوبی انجام دیا ہے، گو یا آپ کی ولادت حضرت علیؑ کی شہادت کے ۳۱۹ سال بعد ہوئی ہے۔ ان تین سو سال سے زائد کے عرصہ میں بھی یکے بعد دیگر ے ایک طویل سلسلہ ہے جو ان تمام

اقوال، تحریروں اور خطبوں کا مؤلف ومرتب تک پہنچتا ہے۔

ان میں پہلی صدی ہجری میں حارث اعور، مالک اشتر زید بن وہب جہنی اور عبداللہ بن رافع ہیں دوسری صدی ہجری میں نصر بن عمد مزاحم، اسمٰعیل بن مہران مسکونی، ابو منذر ہشام بن محمد کلبی اور ابومخنف لوط بن یحی کے نام ملتے ہیں، تو تیسری صدی ہجری میں محمد بن عمر قدسی، ابواسحٰق ابراہیم، ابو الحسن مدائنی، ابراہیم بن ظہیر فرازی ابومحمد اور عبداللہ بن احمد بن عامر کے محترم نام شامل ہیں، جن میں آخری نام کا اپنا ایک الگ معتبر سلسلہ ہے جو براہ راست مولا علی تک پہنچتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری جو خود سید رضی علیہ الرحمہ کی صدی ہے، اس میں ابو القاسم محمد عظیم بن عبداللہ مدائنی، عبدالعزیز بن یحیٰ، ابوالخیر درازی، ابراہیم بن سلیمان نہشمی، عبداللہ بن ابی زید انباری، قاضی بن سلا مؤلف، ''دستور معالم الحکم'' اور علی بن محمد بن عبداللہ مدائینی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں مسعودی متوفی ۳۴۶ھ نے تحریر کیا ہے۔

والّذی حفظ النّاس عنه من خطبة فی سائر مقاماته اربعماة خطبة ونیف وثمانون خطبة یوردها علی البهدیة وتداول النّاس ذالک عنه قولاً وعملاً۔ ۷

ترجمہ: ان میں سے جو خطبے لوگوں کو یاد رہ گئے، وہ چار سو اسی سے کچھ زیادہ ہیں، جنہیں حضرت علیؑ بدیہی اور ارتجالی طور پر دیتے تھے، یہ خطبے لوگوں میں قول وعمل کے طور پر رائج ہیں۔

تذکروں میں یہ بھی ملتا ہے کہ اکثر اصحاب کلام خدا اور احادیث رسولؐ کی طرز پر زبان وبیان پر تسلط وقدرت حاصل کرنے کے لئے بھی حضرت علیؑ کے خطبوں اور ارشادات کو یاد کرلیا کرتے تھے۔ چنانچہ عربی ادب کا ایک بڑا ادیب'' عبدالحمید بن یحیٰ، متوفی ۱۳۲ھ، کہا کرتا تھا:

"حفظت سبعین خطبة من خطب الاصلع ففا ضت ثمه فاضت "۔ ۸

ترجمہ: ''میں نے امیر المؤمنین کے ستر خطبے یاد کئے کہ ادب میں روانی آئی اور خوب آئی'' اور اسی کتاب میں ابن نباتہ، متوفی ۳۷۴ھ، کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے:

" حفظت من الخطابةلکنزا لایریده الانفاق الاسعة وکثرة، حفظت مأة فصل من مواعظ علی بن ابی طالبؑ۔" ۹

ترجمہ: میں نے تقریروں کا وہ خزانہ حفظ کیا ہے کہ جس کا استعمال اس میں اضافہ ہی کررہا ہے، اور وہ خزانہ، علیؑ کے سو یاد کردہ خطبے ہیں۔

ان تمام دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ سید رضی کے دور تک برابر نہج البلاغہ میں درج خطوط، خطبے اور ارشادات اکثر لوگ زبانی یاد کرکے بھی دوسروں تک پہنچاتے تھے اور تحریری طور پر بھی ایک دوسرے کو ودیعت کرتے تھے۔

کیونکہ تصوّف وعرفان کے زیادہ تر سلسلے حضرت علیؑ پر منتہی ہوتے ہیں، لہٰذا زیادہ مناسب یہی ہے کہ اسلامی عرفان وتصوف کے آثار و ارکان نہج البلاغہ میں اور مناجات ودعاؤں میں تلاش کئے جائیں، جن مفکرین نے نہج البلاغہ اور حضرت علیؑ کی دعاؤں سے ہٹ کر اسلامی تصوّف پر کام کیا ہے، انہیں اسلامی عرفان میں بھی کہیں ویدانت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں، تو کہیں یونانی اور رہبانیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اے۔جے۔ آر بری کی تحقیق کے مطابق سرولیم جان پہلا یورپی دانشور ہے، جس نے تصوف کو ویدانت کے زیر اثر بتایا ہے۔ اور ۱۹۶۰ میں ایک جرمن مفکر رچرڈ ہارٹمن، نے بھی تصوّف پر ہندوستانی اثرات کا راگ الاپا ہے،تو الفرڈ وان کریمر نے ۱۸۸۶ء میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں تصوف نے مسیحیت کا اثر قبول کیا۔ حالانکہ پروفیسر براؤن نے وان کریمر کی اس رائے پر بحث کرتے ہوئے اس نظریئے کی مکمل تردید کی ہے۔ اسی طرح ایک ڈچ اسکالر ڈوزی نے ۱۸۷۹ء میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف ایرانیوں کی دین ہے اور فتح ایران سے قبل بھی ایران میں تصوف موجود تھا جس نے بعد میں اسلامی تصوف کی شکل اختیار کرلی۔ گوکہ ضیاء احمد بدایونی نے اس نظریے کی وجہ بیان کرتے ہوئے تردید بھی کی ہے۔

عرفان اسلامی کی کڑیاں قرآن شریف کی آیات اور احادیث رسولؐ سے بھی جوڑی جاتی ہیں، جو بالکل صحیح ہے۔اور کسی بھی طور پر غلط نہیں۔لیکن جب ایک دوسلسلوں کے علاوہ تمام تصوف کے سلسلے حضرت علیؑ پر منتہی ہوتے ہیں تو عرفان وتصوف کے چشموں کو بھی ''باب شہر علم نبیؐ'' کے ہی کردار، گفتار، افعال، خطبات، دعا اور مناجات کے آئینے میں دیکھنا زیادہ درست ہوگا۔ یوں بھی مولا علیؑ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جو سیرت نبی کا آئینہ دار نہ ہو، اور نہ ہی تمام زندگی کوئی ایسا جملہ آپ کی زبان سے ادا ہوا جو قرآنی آیات کے منافی ہو۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''علی منّی وانامنه'' مولا علیؑ کے افعال کی پاکیزگی اور خدا پرستی کی گواہی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ دشمنوں کی زبان پر ہی نہیں بلکہ ایک بڑا خاندانی دشمن، امیر شام معاویہ، بھی اس پاکیزہ کردار کا گواہ نظر آتا ہے، جیسا کہ کتاب خلفائے راشدین کے صفحہ ۳۵۶ پر تحریر ہے:

''امیر شام کے اصرار پر ضرار اسدی نے جوان کے اوصاف بیان کئے، ان میں ان کی خشیت الٰہی اور ترک دنیا کے بارے میں بتایا کہ'' میں شہادت دیتاہوں کہ میں نے ان کو بعض معرکوں میں دیکھا کہ رات گذر چکی ہے ستارے ڈوب چکے ہیں۔ اور وہ اپنی داڑھی پکڑے ہوئے ایسے مضطرب ہیں جیسے مار گزیدہ مضطرب ہوتاہے اور اس حالت میں وہ غمزدہ آدمی کی طرح رورہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے دنیا! مجھ کو فریب نہ دے دوسرے کو دے، تو مجھ سے کیوں چھیڑ چھاڑ کرتی ہے یا میری مشتاق ہوتی ہے؟ افسوس! میں نے تجھ کو تین طلاقیں دے دی ہیں، جس سے رجعت نہیں ہوسکتی۔ تیری عمر کم اور تیرا مقصد حقیر ہے آہ! زادِ راہ کم اور سفر دور دراز کا ہے، راستہ وحشت خیز ہے''۔
یہ سن کر امیر شام رو پڑے اور فرمایا: خدا ابوالحسنؑ پر رحم کرے۔ خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔''

تصوف کی تعریف پر نظر ڈالیں تو اس ذیل میں معروف کرخی جوامام رضاؑ سے بیعت تھے ، فرماتے ہیں:

" التّصوف الاحذ بالحقائق والیاس مما فی ایدی الخلائق"[۱۰]

ترجمه: تصوف حقائق کا حصول اور خلائق کے مال ومتاع سے یاس ہے۔

یہ تعریف نہج البلاغہ کے اکثر کلمات سے ماخوذ ہے، جن میں سے چند اس طرح ہیں:

۱۔ **المال مادة الشهوات:** مال خواہشات کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ **من اطال الامل اسآء العمل**[۱۱]**:** جو طولانی امیدیں رکھے گا، وہ اپنے کردار تباہ کردیگا۔

ابوالحسن نوری فرماتے ہیں:

التّصوف ترک کل حظ للنفس:[۱۲] نفسانی لذتوں کا ترک کردینا تصوف ہے

نہج البلاغہ میں تحریر ہے۔ ۱۔ **فمن اشتاق الجنّة سلا عن الشهوات:** [۱۳] جو شخص جنت کا مشتاق ہوتاہے، وہ خواہشات سے الگ ہوجاتاہے۔

۲۔ **من کرمت علیه نفسه هانت علیه شهواته** [۱۴] جسے اپنا نفس معزز معلوم ہوگا، خواہشات نفس اس کے لئے حقیر ہوں گے۔

ابوعمر دامشقی اس طرح رقمطراز ہیں:

"التّصوف رویة الکون بعین النقص بل محض الصرف عن الکون"[۱۵]

تصوف نام ہے دنیا کی طرف نقص کی نگاہ سے دیکھنے کا، بلکہ سرے سے نہ دیکھنے کا۔

(نہج البلاغہ) فمن احب الدنیا وتولاھا ابغض الآخرۃ وعاداھا"۱۶

پس تو جو آدمی دنیا کو چاہتا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے وہ آخرت سے دشمنی رکھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے:

طوبیٰ للزاھدین فی الدّنیا والراغبین فی الآخرہ۱۷

دنیا سے کنارہ کشوں اور آخرت سے رغبت رکھنے والوں کا کیا کہنا!

مثل الدّنیا کمثل الحیّۃ لین مسھا۔۱۸

دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے

مندرجہ بالا وہ چند مثالیں ہیں، جو اہل تصوف نے نہج البلاغہ سے اخذ کی ہیں، ورنہ تصوف کی تمام تعریفیں نہج البلاغہ سے ماخوذ ہیں، طوالت کے باعث یہاں ان سے گریز کیا جاتا ہے۔

اب ان احکام پر نظر ڈالی جارہی ہے، جو صوفیوں کے کردار کو نکھارتے ہیں۔ ان میں پہلا رکن ''ذکر'' ہے یعنی اللہ کا ذکر کرنا، عام طور پر اللہ کے ننانوے (۹۹) صفاتی نام لئے جاتے ہیں۔ مگر حضرت علیؑ نے اپنی دعاؤں میں اللہ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ یہ صفاتی نام لا تعداد نظر آتے ہیں۔ صرف دعائے مشلول میں ہی ایسے کتنے صفاتی نام موجود ہیں، جو مشہور نام بھی ہیں اور جدا گانہ بھی مثلاً۔

" یا ذالجلال والاکرام یا حیّ یا قیّوم...، یا ذالملک والملکوت ، یا ذالعزت والجبروت یا ملک یا قدّوس یا سلام یا مومن یا مھین یا عزیز یا جبّار یا متکبّر یا خالق یا باری یا مصوّر یا مفید یا مدبّر یا شدید یا مبدی یا معید یا مبید یا ودود یا محمود یا معبود یا بعید یا قریب یا مجیب یا رقیب یا حسیب یا بدیع یا رفیع یا منیع یا سمیع یا علیم یا حلیم یا کریم یا حکیم یا قیّوم یا علی یا عظیم یا حنّان یا منّان یا دیان یا مستعیان یا جلیل یا جمیل یا وکیل یا کفیل یا مقبل یا منیل یا نبیل یا دلیل یا ھادی یا بادی یا اول یا آخر یا ظاھر یا باطن یا قائم یادائم یا عالم یا حاکم یا قاضی یا عادل یا فاصل یا واصل یاطاھر یا مطھّر ویا قادر یا مقتدر یا کبیر یا متکبّر یا واحد یا احد یا صمد ...یا سامخ یا بارخ یا فتّاح یا نفّاح یا مرتاح، یا مفرّج یا ناصر یا منتصر یا مدرک یامھلک یامنتقم، یا باعث یا وارث یا طالب یا غالب... یا توّاب یا اواب یا وھاب ... یا ظھور یا شکور یا غفور.... یا لطیف یا خبیر یا مجیر

یا منیر یا بصیر یا ظهیر یا وتر یا فرد یا ابد یا سند یا صمد یا کافی یا شافی یا وافی یا معافی یا محسن یا مجمل یا منعم یا مفضل یا متکرم......"

اسی طرح تقریباً سوا سو ناموں کا واسطہ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اتنے ہی مرکب نام خدا کے ذکر میں شامل ہیں۔

دعای مشلول کی طرح دعای کمیل میں بھی امیر المومنین حضرت علیؑ نے اللہ کے ذکر اور یاد کا ایک الگ طریقہ اپنایا ہے، جو اہلِ تصوف میں رائج ہوا۔

''۱- نعمت کا واسطہ جو ہر شئی سے بڑھی ہوئی ہے ۲- تیری اس عظمت کا واسطہ دیکر سوال کرتا ہوں جس سے ہر چیز پُر نظر آتی ہے ۳- اسی ذات کا واسطہ جو ہر شے کے فنا ہوجانے کے بعد باقی رہے گی۔ ۴- اس علم کا واسطہ جو ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ۵- اس نور کا واسطہ جس کی وجہ سے ہر چیز میں چمک دمک ہے۔ ۶- میں تیری یاد کے ذریعہ سے تیری حضوری میں تقرب چاہتا ہوں۔۷- میرے لئے اپنا قرب زیادہ کر اور اپنی یاد میرے دل میں ڈال۔۸- جو کچھ میرا حصہ مقرر کیا ہے اس پر میں راضی رہوں اور قناعت کروں۔۹- اور ہر حالت میں تیرے بندوں سے بتواضع پیش آؤں۔ ۱۰- تیری حکومت سے بھاگ کر نکل جانا ممکن نہیں۔ ۱۱- میرا تیرے سوا اور ہے کون جس سے میں اپنی مصیبت کے دور کرنے کا اور اپنے معاملے میں غور کرنے کا سوال کروں۔ ۱۲- بعد اس کے کہ میرا دل تیری محبت میں سرشار ہو چکا ہے اور میری زبان تیری یاد میں چل رہی ہے اور میرا دل تیری محبت کی گرہ باندھے ہے۔ ۱۳-میں تیرا ایک کمزور، ذلیل، حقیر، مسکین اور عاجز بندہ ہوں۔ ۱۴- مجھے تیری ہی خدمت کرتے رہنے میں دوام حاصل ہوجائے۔ ۱۵- میرے ہاتھ پاؤں کو اپنی خدمت کے لئے مضبوط اور اسی ارادے کے لئے میرے قلب کو مستحکم کردے۔ ۱۶- مدام تیری خدمت میں لگا رہوں۔۱۷-اور تیرا قرب حاصل کرنے کا اشتیاق رکھنے والوں کا سا شوق مجھے بھی حاصل رہے اور تیرے جناب میں اخلاص رکھنے والوں کی سی نزدیکی مجھے بھی حاصل ہوجائے۔ ۱۸-میری زبان کو اپنی یاد میں چلتا رکھ اور میری زبان کو اپنی محبت میں مستغرق فرما۔''

مندرجہ سبھی جملے آئین صوفیاء کا سرمایہ ہیں، اور تصوف وعرفان کی تمام منزلیں اس دعا میں مضمر ہیں۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جتنی اسلامی صفات، مشاہدات، بیانات اور اعمال صوفیاء میں نظر آتے ہیں، وہ سب کے سب تنہا مولا علیؑ کی ذات، کردار، افعال اقوال، دعا و مناجات اور مشاہدات

سے ماخوذ ہیں۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کو سرچشمہ عرفان مانا گیا ہے۔

حوالے:

۱۔فیروز اللغات از مولوی فیروز الدین لاہور جنوری ۱۹۳۱ ص ۱۳۴

۲۔القرآن الکریم ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی عباس بک ایجنسی لکھنؤ سورہ ۵۷ آیت ۱۸،۱۹،۱۲۱ ص ۹۴۴ سورہ ۴ آیت ۱۶۳

۳۔ایضاً

۴۔فرہنگ فارسی امروز از غلام حسین صدری افشار چاپ دوم فروردین ۱۳۷۵،گلشن

۵۔دائرہ معارف علوی بخش اول ص ۲۶

۶۔ایضاً ص ۲۵

۷۔مروج الذھب از مسعودی طبع مصر ۱۳۴۶ھ جلد نمبر ۲۔ص ۴۵

۸۔شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید طبع مصر جلد نمبر ۱ ص ۸

۹۔ایضاً

۱۰۔تصوف اسلام اور اس کی تاریخ از ڈاکٹر محمد شکیل صدیقی مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۴ ص ۶

۱۱۔نہج البلاغہ تدوین سید رضی باہتمام سید محمد جعفر رضوی احباب پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۸ ص ۹۱۱

۱۲۔ایضاً ص ۹۰۷

۱۳۔تصوف اسلام اور اس کی تاریخ مذکور ص ۷

۱۴۔نہج البلاغہ مذکور ص ۹۰۵

۱۵۔تصوف اسلام اور اس کی تاریخ مذکور ص ۷

۱۶۔نہج البلاغہ مذکور ص ۹۹۳

۱۷۔ایضاً ص ۹۴۸

۱۸۔ایضاً ص ۹۲۵

تصوف کی تفہیم میں چند اہم کتابیں

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تصوف جس کی حقیقی روح اسلام ہے۔ اس کے مطالعہ کے متعدد نظری، عملی اور تاریخی پہلوؤں پر گراں قدر نگارشات موجود ہیں، جن کو مختلف ادوار پر تقسیم کیا جاسکتا ہے: مثلاً سادہ اور عام فہم تصانیف کا دور جس میں زیادہ تر ایسے رسائل وکتب ہیں، جن کی مدد سے تعلیمات مریدین وسالکین کی تربیت ورہنمائی اور تزکیۂ نفس وتصفیہ باطن مقصود ہیں، جو قرآنی آیات واحادیث، صوفیانہ تفاسیر اور اخبار صحابہ پر مشتمل ہیں ۔ ان میں دنیاوی معاملات ، روز مرہ کے اصول اور وہ اخلاق وعادات مندرج ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر انسان لقدخلقنا الانسان فی احسن تقویم کے دائرہ میں نظر آتا ہے۔

تصوف کے لٹریچر کا دامن نہایت وسیع وعریض ہے، اس میں عام فہم وسادہ انداز بیان میں بھی کتابیں موجود ہیں اور دقیق ومشکل حقائق ومعارف و اسرار اور رموز کے انکشاف کی کتب بھی، مع مکاتیب اور ملفوظات کے۔ نیز نثری تخلیقات کے ساتھ ہی منظوم تخلیقات سے بھی اس کا دامن مالامال ہے۔ عرب وعجم میں تصوف ، اس کی مبادیات اور تعلیمات کی تفہیم وتشریح سے متعلق جو کتب ورسائل منصۂ شہود پر آئے ،ان کی مجموعی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، لیکن اس کی بنیادی کتابوں میں جن کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ کتاب اللمع از طاؤس الفقرا شیخ ابونصر سراج طوسیؒ (م ۳۷۸ھ)
۲۔ الرسالۃ القشیر یہ از امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیر یؒ (۴۶۵ھ)
۳۔ فتوح الغیب از غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ (۵۶۱ھ)
۴۔ کشف المحجوب از شیخ علی ہجویری داتا گنج بخش لاہوریؒ (۴۶۵ھ)
۵۔ عوارف المعارف از شیخ شہاب الدین ابوحفص سہروردیؒ (۶۳۲ھ)

۱۔ کتاب اللمع ۔ اس کے مصنف اپنے عہد کی عظیم المرتبت شخصیت ہیں۔ ایک باروجد

کی حالت میں دہکتے ہوئے آتش دان میں منہ ڈال کر سجدہ کیا، مگر رویاں تک نہ جل سکا۔ بعد میں لوگوں کے سوال پر فرمایا کہ جس نے بارگاہ الٰہی میں اپنی آبرو دیدی اس کے چہرہ کو بھلا آگ کیا جلاسکتی ہے۔ وہ تصوف کو قرآن وسنت کا اصل الاصول اور روح ثابت کرتے ہیں۔ یہ تصنیف ایک مقدمہ، متعدد کتب اور بکثرت ابواب پر مشتمل ہے، جن میں علم تصوف، صوفیہ اور ان کے طبقات کا ذکر، ان معاندین کا مدلل رد جو یہ کہتے ہیں کہ کتاب وسنت سے تصوف کا کہیں پتہ نہیں چلتا ہے۔ نیز تصوف کی تعریف، ماہیت، توحید ومعرفت کی حقیقت، مومن وعارف کا فرق مقامات وحقائق اور احوال کے معنی کے بیان کے بعد توبہ، ورع، زہد، فقر وفقرا، مقام صبر وتوکل، رضا واہل رضا کی تعریف، محبت حال قرب، اطمینان، مشاہدہ ویقین وغیرہ کا مفصل بیان ہے۔

محبت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: اہل محبت کی تین حالتیں ہیں۔ (۱)۔ عام لوگوں کی محبت جس کا سبب وہ احسانات ومہربانیاں ہیں، جو اللہ ان پر کرتا ہے۔ حضرت سہیل بن عبد اللہ تستریؒ سے محبت کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ دلوں کا اللہ سے موافقت کرنا پھر اس موافقت سے چمٹے رہنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری کرنا، اللہ کے ذکر سے والہانہ اور مناجات سے حلاوت محسوس کرنا محبت کہلاتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں :

لوکان حبک صاد قا لاطعته ان ب لمن یجب یطیع

(اگر تم اپنی محبت میں سچے ہو، تو یقیناً اس کی ہر بات میں پیروی کرو کیوں کہ عاشق معشوق کا ہر حال میں مطیع وفرمانبردار ہوتا ہے)۔

فوائد الفواد میں مذکور ہے:

''چوں کسی محبّ ایشان شد ہر آئینہ متابعت ایشان کند واز ناشائستہ دور باشد۔ چون این چنین شود ہر آئینہ گناہ نہ نویسند، آنگاہ فرمود کہ تامحبت حق در غلاف قلب باشد، امکان معصیت است، اماچون محبت در سویداء قلب در آید بیش امکان معصیت نہ باشد''۔

(جب کوئی شخص ان کا محبّ ہوگیا، تو ان کی پیروی ضرور کرے گا اور برے اعمال سے دور رہے گا۔ اور جب ایسا ہوگا تو یقیناً اس کے گناہ بھی نہ لکھے جائیں گے ۔ پھر ارشاد فرمایا کہ حضرت حق کی محبت جب تک غلاف قلب میں ہے گناہ کا امکان باقی ہے، لیکن جب سویداء قلب میں گھر کرجاتی ہے تو معصیت کا امکان باقی نہیں رہتا۔)

۲۔ دل کی نگاہ ، اللہ کی مالداری ، جلال ،عظمت ،علم اور قدرت کی طرف لگی ہے۔ یہ صادقین اور متحققین کی محبت ہے۔ ارادوں کا مٹ جانا اور تمام صفات وحاجات کا جل جانا محبت ہے۔

۳۔صدیقین اور عارفین کی محبت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اور معلوم کرلیتے ہیں کہ اللہ نے بغیر کسی علت کے ان سے ازل سے محبت کی تو یہ بھی بغیر کسی علت کے اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اس محبت کی تعریف حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پاک وصاف محبت جس میں کوئی کدورت نہیں یہ ہے کہ دل اور اعضاء سے محبت اس طرح ساقط ہوجائے کہ اس میں محبت ہی نہ رہے اور تمام اشیاء اللہ کے ساتھ اور اللہ کے لئے ہوں۔ ایسا شخص محبّ اللہ کہلاتا ہے۔

کتاب المسائل میں جمع وتفریق ، فنا وبقا ، حقائق وصدق ، اصول مذہب صوفیہ، اخلاص ، ذکر، استغناء،فقر، روح، مسئلہ ظرف ،مروت ،صوفیہ کوصوفیہ کیوں کہا گیا ،حب وؤد میں فرق نیز صفاء معاملت اور صفاء عبادت ،سخاوت اور نیت کا بیان ہے۔

صوفی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ انہیں دوسرے لوگوں کی کدورتوں سے پاک ہونے اور اشرار کے درجہ سے خارج ہونے کی وجہ سے صوفی کہاجاتا ہے۔ مسئلہ تمنا کے ضمن میں فرماتے ہیں: مرید کو آرزو کی اجازت نہیں البتہ امید لگائے رکھنے کی اجازت ہے، کیوں کہ تمنا میں یہ پایا جاتا ہے کہ اس کی نگاہ نفس کی طرف ہے اور امید میں یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قدیم حکم کی طرف نگاہ لگائے ہوئے ہے۔تمنا نفس کی صفت ہے اور امید دل کی ۔ پھر سخاوت کے سلسلہ میں ارشاد ہے کہ سخی وہ ہے جسے کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ اس نے کس کو کیا دیا؟

کتاب مکاتبات صدور اشعار اور دعوات ورسائل کے بیان میں حضرت ابوسعید خراز ،عمرو بن عثمان مکی، ابو بکر کتانی ،جنید بغدادی ، ابوعلی ردودباری اور ابوسعید اعرابی رحمہم اللہ کے مکاتیب کے ضمن میں عجیب وغریب اسرار کا بیان ہے۔ بعد ازاں ان ادعیہ ماثورہ کا تذکرہ ہے جو متقدمین مشائخ کے معمولات میں داخل تھے۔

کتاب السماع میں سماع اور اس کے معنی کے بارے میں اختلافات و جواز کو بیان کرنے کے بعد جواز کے سلسلہ میں مدلل اور موثر گفتگو فرمائی ہے۔

کتاب الوجد کے ۶ ابواب میں مفصل بحث کے بعد ابوسعید بن الاعرابی کی کتاب الوجد کامختصر اور جامع بیان ہے۔

معجزات وکرامات کے ثبوت کے باب میں دونوں کا فرق اور خاص لوگوں اور ان کے احوال کا بیان ہے، جو کرامات میں شمار نہیں ہوتے حالانکہ یہ کرامات سے کہیں زیادہ کامل اور پُر لطف ہوتے ہیں۔ مشکلات کی تشریح میں حضرات صوفیہ کے کلام میں صدہا مشکل الفاظ کی تشریح مثلاً الحق بالحق للحق، منہ بہ کہ، انا انا، انا انت،غین ،نحن بلانحن ، بحری بلا مشاطی وغیرہ ہے۔

انا بلانحن ونحن بلاانا، میں میں نہیں اور ہم ہم نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال میں ہوتے ہوئے بھی ان سے یکسر غافل ہے۔

میں تو ہوں، تو میں ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ اپنا مشاہدہ بیان فرماتے تھے : رایت ربّی بعین ربّی فقال من انت قلت انت ۔میں نے اپنے رب کو اسی کی آنکھ سے دیکھاتو اس نے مجھ سے پوچھا تم کون، ہو میں نے کہا تو۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

یا منیة المتمنّی افنیتنی بک عنّی ارنیتنی منک حتی ظننت انّک انّی

اے آرزو کنندہ کی آرزو تو نے اپنی ذات کے ساتھ مشغول کر کے مجھے اپنی ذات سے فنا کردیا اور مجھے اپنے سے اتنا قریب کرلیا کہ میں اب یہ خیال کرتا ہوں میں اور تو ایک ہیں۔ من تو شدم تو من شدی

بعد ازاں ان تمام لوگوں کا تذکرہ ہے، جنہوں نے ان فروع میں غلطی کی ہے جو انہیں گمراہی تک نہیں لے جاتے۔ اس ضمن میں فقروفنا ،سستی ، مجاہدہ اکتساب ذوق ، بشریت کے فنا ہونے، رویت بالقب اور روح کے بارے میں موثر اور مدلل اظہار خیال کیا ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر پیر محمد حسن کے اردو ترجمہ جو حواشی کے ساتھ ادارۂ تحقیقات اسلامی،اسلام آباد، پاکستان سے بھی شائع ہوچکی ہے۔

۲۔ الرسالۃ القشیریہ: اختصار کے باوجود اس رسالہ کی اہمیت اور جامعیت ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مصنف اس کی وجہ تصنیف اس طرح لکھتے ہیں:

اس رسالہ کو فقیر عبد الکریم بن ہوازن قشیری نے اسلامی ممالک کی جماعت صوفیہ کے نام لکھا ہے۔اس کی تالیف کا سبب یہ ہے چونکہ متقدمین صوفیہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ان کے طریقے ناپید ہورہے ہیں ۔حقیقت کے میدان میں سناٹا چھا رہا ہے، نہ وہ بوڑھے باقی رہے جن کی

راہ پر چلا جائے اور نہ وہ جوان جن کی سیرت اختیار کی جائے۔ زہدو تقویٰ کی بساط الٹ گئی اور حرص وطمع کا دور دورہ ہوگیا..... اس رسالہ میں میں نے شیوخ طریقت کی سیرتوں کا ذکر کیا ہے، جن سے ان کے آداب واخلاق اور معاملات وعقائد پر روشنی پڑے گی۔ ان کے وجدو حال اور کیفیات ترقی کی جانب اشارے ہیں تا کہ ان کے مطالعہ سے طریقت کے سالکین وطالبین کوقوت حاصل ہو۔

ابتدائی چندصفحات میں اصول توحید ومسائل توحید مندرج ہیں۔ ۸۰ سے زائد مشائخ کے تذکرہ کےضمن میں ان کے احوال حکایتیں اور اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

دوسرے باب میں اصطلاحات تصوف کی تشریح ہے۔ علاوہ ازیں تو بہ ، مجاہدہ ، حزن ، جوع،فتوح الغیب، عالم معانی کے رموز ونکات کا ایک نایاب ذخیرہ ہے، جس کوحضرت شیخ قدس سرہٗ کے صاحب زادہ حضرت شرف الدین عیسیٰؒ نے جمع ومرتب کیا۔ یہ ان مواعظ کا مجموعہ ہے جو آپ مختلف مجالس میں فرماتے تھے اور وہ ان کوقلم بند کر لیتے تھے۔ بعد میں صاحب زادہ نے ۷۸ مقالات کو آپؒ کے حضور میں پیش کیا، جسے آپؒ نے حمدونعت سبب تالیف کا اضافہ فرما کر کتاب کی شکل دیدی۔ اصل کتاب میں حمدونعت سےقبل مندرجہ ذیل عبارت ہے۔:

قال والذی الامام الاوحد المويد ۔ امام الائمه محی الدين سيد الطوائف ابو محمد عبد القادر بن ابی صالح ابن عبد اللّٰه الجيلی قدس اللّٰه روحه ونور ضريحه ۔

میرے والد امام یکتا موید، پیشوائے پیشوایان محی الدین سید الطّوائف ابومحمد عبد القادر بن ابی صالح بن عبداللہ نے، خدا ان کی روح کو پاک اور ان کے مزار کو روشن رکھےفرمایا:

ابتدائی عبارت سے ہی حضرت شیخ کےعلمی تبحر اورمنفرد اسلوب بیان کا پتہ چلتا ہے۔

..... الذی خلق فسویٰ وقدّرفهدیٰ وامات واحییٰ واضحک وابکیٰ واقرب وادنی ورحم واخزیٰ واطعم واسقیٰ واسعد واشقیٰ ومنع واعطیٰ الّذی بکلمته قامت السمٰوات السبع الشداد وبهاارست الرواسی والاتاد واستقرت الارض المهاد۔ فلاقنوطاً من رحمتهٗ ولاماموتاً من مکرهٗ وغیرهٗ ونفاذ قضیتهٗ وفعلهٗ وامرهٗ ولامستنکفا عن عبادته ولا مخلو من نعمتهٗ فهو المحمود بماحنی والشکور بما زویٰ.....

جس نے پیدا کیا اور بنایا (عالم تقدیر میں) اندازہ کیا اور(عالم تدبیر میں) رہبری کی۔

مارا اور جلایا ،ہنسایا اور رُلایا۔ نزدیک بلایا اور پستی میں لایا، مہربانی کی اور رسوا کیا، کھلایا، پلایا نیک بخت اور بد بخت کیا، محروم کیا اور کرم فرمایا، جس کے کلمہ سے سات مضبوط آسمان قائم ہوئے اور پہاڑ لنگروں اور میخوں کی طرح جم گئے اور زمین پھیل کر بچھ گئی۔ نہ اس کی رحمت سے کوئی مایوس ہے اور نہ اس کے مکر، غیرت ، اس کی قضا اور فعل وحکم کے جاری ہونے سے کوئی مامون ومطمئن، نہ اس کی عبادت کسی کے لئے عار ہے اور نہ اس کی نعمت سے کوئی تہیدست۔ جو دیا اس پر اس کی تعریف ہے اور جو روک لیا اس پر اس کا شکر ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ یہ چند کلمات ہیں جو مجھ پر فتوح غیب سے ظاہر وعیاں ہوئے، جو دل میں اتر آئے اور بھر گئے۔ تب صدق حال نے انہیں باہر لاکر ظاہر کیا۔

فتوح الغیب بلاشبہ ایک مکمل دستور حیات ہے، جس پر عمل پیرا ہوکر مقصد حیات سے انجان عرفان ذات حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی زندگیاں نکھر، سنور اور سج سکتی ہیں۔

صدق اختیار کرو اور شک میں نہ پڑو، صبر کرو اور بے صبری نہ کرو۔ ثبات واستقامت اختیار کرو اور بددل نہ ہو۔ خدا سے مانگو اور رنجیدہ نہ ہو کہ وہ نہیں سنتا ہے، بلکہ انتظار کرو اور آمادہ رہو ناامید نہ ہو۔ آپس میں بھائی بنو اور دشمن نہ بنو۔ اللہ کی فرمانبرداری پر جمع ہو اور متفرق نہو۔ آپس میں دوستی کرو اور بغض نہ رکھو۔ گناہوں سے پاک رہو اور ان میں آلودہ نہ ہو۔ اپنے پروردگار کی طاعت سے آراستہ ہو۔ اپنے مالک کے دروازے سے نہ ٹلو ۔ اس سے منہ نہ موڑو اور گناہوں سے توبہ کرنے میں دیر نہ کرو اور اپنے خالق سے رات دن عذر خواہی کرنے میں نہ تھکو۔ ایسا کرنے سے امید ہے تم پر رحم کیا جائے اور سعادت بخشی جائے۔ دوزخ سے نجات دی جائے اور جنت میں خوشی عنایت کی جائے۔

جا بجا نفس ونفسانیت کو چھوڑنے کی نصیحت ہے، کیوں کہ جب تک بندہ نفس میں محصور ہے، خدا تک رسائی ممکن نہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت حق ....سے پوچھا تیری طرف راہ کیونکر ہے؟ فرمایا اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ۔ حضرت بایزیدؒ فرماتے تھے کہ میں اپنے نفس سے اس طرح باہر نکلا جیسے سانپ کیچلی چھوڑتا ہے:

اٹھارویں مقالہ میں سختی وبلا پر صبر وشکر کرنے کی تاکید اس طرح فرماتے ہیں۔

تم پر جو تکلیف وسختی نازل ہو اس کا گلہ کسی دشمن یا دوست کے سامنے مت کرو پروردگار نے

جو کچھ تمہارے معاملہ میں کیا ہے اور جو بلاتم پر نازل کی ہے، اس سلسلہ میں اس پر تہمت نہ رکھو بلکہ ہمیشہ اچھی حالت اور شکر ظاہر کرو..... کون شخص ہے کہ نعمت حق سے خالی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم اس کی نعمتیں شمار کرو تو احاطہ نہیں کر سکتے، نہ معلوم کتنی نعمتیں تمہارے پاس ہوں گی جن کی تمہیں خبر بھی نہیں ہے۔

مخلوقات میں کسی کا آسرا نہ رکھو اور انس نہ کرو۔ نہ اپنا حال کسی سے کہو، بلکہ تمہارا انس خدا کے ساتھ ہونا چاہیے اور آسرا اسی کا اور اس کا گلہ اسی سے کرنا چاہیے، کسی تیسرے کو درمیان میں نہ دیکھو۔

آج کے دور میں حسد کی بیماری بہت عام ہوچکی ہے اور اس کی مختلف نئ نئ شکلیں ظہور پذیر ہورہی ہیں۔ اس سے بچنے کی ترتیب ۷۳ ویں مقالہ میں یہ کہہ کر بیان کی ہے:

اے مومن ! کیا بات ہے کہ میں تجھے اپنے ہمسایہ سے اس کے کھانے، پینے ، لباس ، نکاح، مکان اور اس کی دولت مندی اور خدا کی نعمتوں اور اس کی قسمت کے حصہ پر حسد کرتا دیکھتا ہوں! کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ حسد تیرا ایمان ضعیف کردے گا اور خدا کی نظر سے گرادے گا اور اسے تجھ سے ناراض کردے گا... ماشاء اللہ تیری قسمت دوسرے کو نہیں دی جائے گی اور تیری اس کی طرف منتقل نہ ہوگی۔

۷۴ ویں مقالہ میں قرب حق کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ خواب میں ایک پیر مرد نے مجھ سے پوچھا کہ بندوں کو خدا کا قرب کیسے حاصل ہوتا ہے۔ میں نے کہااس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا۔ ابتدا ورع اور انتہا تسلیم ورضا ہے۔

تکملہ کتاب میں آپ کے صاحبزادے نے وقت وصال آپ کی کیفیت اور صاحبزادوں سے آپ کی وصیتیں وغیرہ درج فرمائی ہیں۔ وصال سے قبل آپ کے صاحبزادہ، شیخ عبد الجبارؒ، نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں پر تکلیف ہے، فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں ہے اور وہ خدا کے ساتھ ہے۔

اس عجیب وغریب تصنیف کا غالبًا سب سے پہلا فارسی ترجمہ اور فارسی شرح حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے کیا اور پہلا سلیس عمدہ اردو ترجمہ مولوی محمد عالم قیصری کاکوروی نے ۱۳۴۷ھ میں کیا، جو کاکوری شریف سے شائع ہوا۔

۴۔ کشف المحجوب فارسی زبان میں ہے۔ اس کے مصنف محققانہ ومجتہدانہ انداز سے واردات ومکاشفات اور ذاتی تجربات قلمبند کرنے اور مباحث سلوک پر ردوقدح کرنے میں قطعی تامل نہیں کرتے۔ یہ کتاب تصوف کے مبادیات اور نظری پہلو کے سمجھنے میں بھی ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے، گویا یہ ایسا شاہکار ہے جو اس حقیقت آشنا قلم کی تراوش فکر کا نتیجہ ہے، جو فطرت انسانی وتصوف اسلامی کا سچا تر جمان ہے ۔اور یہ شاہکار دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے کا مصداق ہے جس کا انداز بیان دل آویز ودلپذیر ہے۔

یہ کتاب ۳۴ ابواب اور متعدد فصول پر مشتمل ہے۔ شیخ نے گیارہ حجابات کو ہر ہر باب میں بڑے دلنشین انداز سے اٹھایا ہے۔

مقدمہ کتاب میں ۸ فصلیں ہیں، جن میں سبب تالیف ، اغراض نفسانی سے اعراض ، اسرار الٰہی اور ان حجابات کی وجہ تسمیہ کا بیان ہے ۔ پہلے باب میں ثبوت علم کے ضمن میں حضرات صوفیہؒ کے ارشادات بیان کیے ہیں۔

یحیٰی بن معاذ فرماتے ہیں: اجتنب صحبة ثلاثة اصناف من النّاس۔العلماء الغافلين والفقراء المداهنين والمتصوة الجاهلين۔

(غافل عالموں ، خوشامدی فقیرون اور جاہل صوفیوں کی صحبت سے اجتناب کرو)

دوسرے باب میں درویشی اور فقر و غنا کے متعلق مشائخ کے اقوال ہیں۔ نیز باب ۳، ۴، ۵اور ۶ میں تصوف کے معانی ، اس کے مقامات اور ملامت وغیرہ مندرج ہیں۔

ابن جلاءؒ فرماتے ہیں التصوف حقيقه لارسم له ۔تصوف ایک ایسی حقیقت ہے، جس کی ظاہری تعریف کوئی نہیں ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں: الصوفی اذانطق بان نطقه من الحقائق وان سكت نطقت عنه الجوارح بقطع العلائق، صوفی جب بولتا ہے، تو اس کا کلام اس کی حقیقت حال سے بالکل واضح ہوجاتا ہے اور جب خاموش ہوجاتا ہے تو اس کے اعضاء اس کی طرف سے قطع تعلقات دنیاوی کو بیان کرتے ہیں۔

۷ سے ۱۳ ابواب تک متعدد فصول میں حضرات صحابہ ،صوفیہ ، اہلبیت اطہار، تابعین وتبع تابعین اور متاخرین صوفیہ کے حالات اور ان کے ضمن میں اسرار ورموز تصوف کا بیان ہے۔ اسی طرح

۱۴ ویں باب میں فصول کے تحت قضیۂ فرقہ محاسبیہ، قصاریہ، جنید یہ، نوریہ، حکیمیہ، حلولیہ حل فرمایا اور بعض مسائل تو کئی کئی بار طواف وزیارت کے بعد حل ہوئے اور شاید اس کی اثر آفرینی کی وجہ یہی ہے۔ عوارف المعارف اپنی زبان وبیان، فصاحت وبلاغت اور شستہ ولطیف پیرایہ میں عربی ادب کی اعلیٰ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اسی بنا پر علماء ومشائخ اورصوفیہ کرام کے یہاں باقاعدہ درس کے حلقوں میں شامل رہی ہے۔

طرز تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

الحمد للّٰه العظيم شانهٗ القوى سلطانهٗ الظّاهر احسانهٗ الباهر حجتهٗ وبرهانهٗ ا�تجب بالجلال والمتّفرد بالكمال والمتردى بالعظمة فى الآباد والازال لايصورهٗ وهم وخيال ولايحصرهٗ حد ومثال ذى العزّ الدائم السرمدى والملك القائم الديمومى والقدرة الممتنع ادراک كنهها والسطوة المستوعرطريق استيفاء وصفها لقطت الكائنات بانّه الصانع المبدع ولاح من صفحات ذرات الوجود بانّه الخالق المخترع رسم عقل الانسان بالعجر والنقصان والزّم فصيحات الائسن وصف الجصر فى حلبية البيان الخ۔

یعنی تمام تعریف اس پر وردگار کو سزا وار ہے جس کی شان بڑی، اختیارات ظاہر اور احسانات ودلائل وبراہین آشکار اوروشن ہیں۔ وہ اپنے جلال کے حجابات میں پوشیدہ، اپنے کمالات میں یکتا ولاثانی اور ابدوازل میں ردائے عظمت وکبریائی میں ملبوس ہے۔ کسی کا وہم وخیال اس کی تصویر کشی نہیں کرسکتا اور نہ کوئی حدومثال اس کا احاطہ، وہ ہمیشگی والی عزت کا مالک اور دوامی سلطنت کا بادشاہ ہے۔ اس کی حقیقت کی کیفیت معلوم کرنا ناممکن اور اس کے جاہ وجلال کی تمام کیفیات اور ان کی تعریف محال ہے۔

مولانا جامیؒ فرماتے ہیں:

سبحان من تحیر فی ذاتہ سواہ فہم خرد بہ کنہ کمالش نہ برد راہ

کائنات نے اس بات کی گواہی دی کہ وہی ہر چیز کا بنانے والا اور ایجادنو کرنے والا ہے، اس کا وجود کائنات کے ذرہ ذرہ سے عیاں ہے کہ وہی تمام کائنات کا پیدا کرنے والا اور ایجاد گر ہے۔ عقل انسانی ذات باری کے سلسلہ میں عاجزی اورکوتاہی سے دوچار ہے۔ فصیح زبانیں بھی اس کی

حقیقت کے بیان کے سلسلہ میں درماندہ ہیں۔ اس کے جلال کے انوار نے انسانی فہم وخرد کے پرندے کے پروں کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔اورعزت وجلال کے ذریعہ فہم کی راہوں کو مسدود کر دیا۔

سبب تصنیف کے سلسلہ میں جامی رقم طراز ہیں کہ واضح ہو میں اس جماعت صوفیہ کا مسلک پسند کرتا ہوں۔ کتاب وسنت پر مبنی ان کے صحیح مسلک کی وجہ سے ان سے محبت ہے اور اسی محبت نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کے بارے میں یہ مختصر کتاب لکھوں اور حقائق وآداب کے سلسلہ میں ایسے چند ابواب تحریر کروں، جن سے صراط مستقیم کا پتہ چلے اور وہ معتبر معلومات ایسی ہوں، جن سے ان کے عقائد کا علم ہو، کیوں کہ ان جیسے بہت سے لوگ پیدا ہوگئے ہیں۔ ان کے باہمی حالات میں اختلاف ہے اور بہت سے پردہ دار ان کے لباس میں پوشیدہ ہیں لیکن ان کے اعمال خراب ہیں جو لوگ ان بزرگوں کے اصولوں سے لاعلم ہیں، ان کے دل میں انکے لئے بدگمانی پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان کے خلاف طعن وتشنیع کریں اور یہ سمجھ لیں کہ تصوف بھی محض رسومات کا مجموعہ ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت حق نے میرے قلب پر جن معلومات کا انکشاف کیا۔ وہ اس کا فضل و احسان ہے۔ یہ قابل ذکر کتاب دوحصوں اور ۶۳ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں بہت کچھ نہیں بلکہ سب کچھ ہے۔

مقدمہ کتاب میں حضرات صوفیہ کرام کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اپنے جسموں کے لحاظ سے تو زمینی مخلوق ہیں مگر ان کے دل آسمانی ہیں۔ ان کی شکلیں گوشت پوست کی ہیں مگر روحیں عرشی ہیں۔ ان کے نفوس منازل خدمت کی سیر میں، مگر روحیں فضائے قرب میں پرواز کررہی ہیں۔ ان کی بندگی کے طریقوں کی عام شہرت ہے۔ ان کی روحانیت کے جھنڈے زمین پر گڑے ہوئے ہیں، مگر جاہل اور ناواقف انسان یہی کہتا ہے کہ ان کا فقدان ہے۔

پہلا باب علم تصوف کی تعریف ونشوونما کے بیان میں ہے۔ بعد ازاں مذہبی بصیرت ،علم کی فضیلت ، تصوف وفقر کی اصل حقیقت وماہیت وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد شیخ کی اہمیت وضرورت ، خرقہ پوشی، اہل خانقاہ کی فضیلت ، اصحاب صفہ سے ان کی مشابہت ، بزرگوں کی زیارت مجاہدہ نفس ،سفر کے فرائض وفضائل وغیرہ مندرج ہیں۔

کیمیا نظری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ منٰی کے مقام پر مسجد خیف میں چکر لگا کر لوگوں کے چہروں کو گھور گھور کر دیکھا کرتے تھے ۔ وجہ پوچھی گئی، تو فرمایا کہ اللہ کے ایسے بندے

بھی ہیں کہ جب وہ کسی طرف دیکھتے ہیں تو اسے خوش بختی وسعادت سے ہمکنار فرمادیتے ہیں۔

بائیسواں باب سماع اور اس کی فضیلت کے بیان پر مشتمل ہے جس میں اس کی حقیقت وماہیت پر مدلل بحث کی ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ سماع کے وقت سننے والوں پر رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے، کیوں کہ وہ وجدانی کیفیات کے ساتھ سنتے ہیں اورحق کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ ایک مرتبہ بغداد تشریف لائے تو ایک قوال نے یہ اشعار پڑھے:

صغیر هواک عذبنی فکیف به اذا احتنکا

وانت جمعت من قلبی هوی قد کان مشترکا

اما ترثی لمکتب اذا ضحک الخلی بکا

(تمہاری تھوڑی سی محبت ہی میرے لیے عذاب ہے، اگرکہیں یہ بڑھ جائے تو کیا حال ہوگا؟ تم نے میرے دل میں اپنی بکھری ہوئی محبت کو سمیٹ کر یکجا کردیا ہے کیا تم غموں کے مارے اس انسان پر ترس نہیں کھاتے جو اپنے دوست کے ہنسنے پر بھی آنسو بہاتا ہے؟

حضرت ذوالنون مصریؒ ان اشعار کو سن کر فرط مسرت سے وجد میں آگئے اور پیشانی کے بل ایسا گرے کہ خون نکل پڑا۔

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے کسی سے یہ شعر سنا

اسائل عن سلمیٰ فهل من مخبر یکون له علم بها این تنزل

(میں سلمٰی کے بارے میں لوگوں سے پوچھتا ہوں۔ کیا کسی کو اس کا علم ہے کہ وہ کہاں فرو کش ہوتی ہے) تو وجد میں ایک نعرہ مارا اور فرمایا نہیں خدا کی قسم اس کا پتہ بتانے والا دونوں عالم میں کوئی نہیں ہے۔ ۲۹ ویں، ۳۰ ویں اور ۳۱ ویں باب میں اخلاق اور حضرت صوفیہ کے اخلاق کی تشریح فرمائی ہے۔ اور سرکشی وتکبر اور نخوت سے بچنے کی تاکید کی ہے، پھر تواضع وانکسار، خاطر مدارات، ضبط غصہ، ایثار وہمدردی، اخوت وبھائی چارگی، آداب تصوف، سادگی وبے تکلفی اور قناعت وغیرہ کا مفصل بیان ہے۔

ادب کے سلسلہ میں تمام ارباب تصوف نے بہت زور دیا ہے کہ تصوف سراسر ادب ہے۔ کلام پاک میں مومنین سے خطاب ہے۔

یٰا ایُّھا الّذین آمنوا لاتقولوا راعنا وقولوا انظر نا ۔ (اے ایمان والو! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ نہ کہو کہ آپ ہماری رعایت وخیال فرمائیں، بلکہ یہ عرض کرو کہ ہماری جانب نظر کرم وتوجہ فرمائیں)۔

اسی لئے حضرات صوفیہ کا قول ہے کہ ہم کو بہت زیادہ علم کے بجائے تھوڑے ادب کی ضرورت ہے۔ بعد ازاں نماز کی فضیلت واہمیت اس کے اسرار اور رموز اور آداب ، روزہ کی فضیلت اس کے اثرات، کھانے کے فوائد ونقصانات ، لباس کے آداب ، شب بیداری کی فضیلت ،صوفیہ کے معمولات ، آداب مریدین وشیوخ ،صحبت واخوت ،معرفت نفس وروح اور اس کی تفاصیل ، واردات قلبی اور ان کی شناخت ، حال ومقام کی تشریح ، روحانی مقامات اور اس کے ضمن میں صبرو توکل،شکر، رضا،تقویٰ وخشیت الٰہی ،محبت اور اس کے لوازم واقسام اور ان جیسے انگنت موضوعات پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے۔

آخری دونوں ابواب اصطلاحات تصوف کی تشریح ،خود شناسی وخدا شناسی ، اصلاح نفس، مراحل تصوف جیسے مضامین پر مشتمل ہیں۔

عوارف المعارف کے تراجم فارسی واردو میں بکثرت ہوچکے ہیں۔

ان مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ حضرات صوفیہ کی تعلم وتربیت ، تزکیۂ نفس ، تصفیہ باطن وتجلیہ روح کے سلسلہ میں عربی وفارسی میں ہزاروں کتب ورسائل موجود ہیں،جن میں عوام کی تفہیم کے لئے صوفیانہ طرز بیان اختیار کیا گیا ہے اور بزرگوں نے اپنے سیرومشاہدہ کے موافق آزادانہ طور پر حقائق ومعارف بھی بیان کیے ہیں۔ ارباب تصوف کی ان نگارشات کے مطالعہ سے یہ احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کھانا پینا ،سونا ، جاگنا، لذتیں حاصل کرنا اور پھر سب چھوڑ کر مرجانا اور بس یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ خدا کی خدائی میں اور بھی بہت کچھ ہے، جسے اس کے بیشمار بندوں نے پایا اور پاتے رہیں گے، وہ سب کچھ جہاں ہمارے خواب وخیال کی رسائی بھی نہیں ہے ۔حضرت سرمدؒ فرماتے ہیں:

زنہار مگو کہ رہروان نیز نیند   کامل صفتان بے نشان نیز نیند
زین گو نہ کہ تو محرم اسرار نۂ   پنداری کہ دیگران نیز نیند

(ہرگز یہ مت کہو کہ راہرو ان کامل صفت اور بے نشان لوگ دنیا میں نہیں ہیں، اگر تم اپنی کورچشمی کی وجہ سے اسرار ورموز کے محرم نہیں ہوسکے تو یہ کیوں سمجھتے ہو کہ دوسرے بھی نہیں ہیں)۔

شائقین تصوف اور خدا طلبی میں سرگرداں لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل کتابوں کو بھی نظر انداز نہ کریں:

۱۔ کتاب الرعایۃ الحقوق اللہ۔ شیخ حارث محاسبیؒ
۲۔طبقات الصوفیہ۔ شیخ ابوعبد الرحمٰن سلمی نیشاپوریؒ
۳۔ منازل السائرین۔ خواجہ عبد اللہ انصاریؒ
۴۔ مرصاد العباد۔ نجم الدین ابوبکر محمد بن رازیؒ
۵۔فصوص الحکم شیخ، محی الدین بن عربیؒ
۶۔فتوحات مکیہ۔ شیخ محی الدین بن عربیؒ
۷۔فوائد الفواد، امیر حسن علا سجزیؒ
۸۔قوام العقائد، محمد جمال قوامؒ
۹۔ احسن الاقوال، خواجہ حماد کاشانیؒ
۱۰۔ ارشاد السالکین، بندہ نواز گیسو درازؒ
۱۱۔مفتاح العاشقین، بندہ نواز گیسو درازؒ
۱۲۔رسالہ عشقیہ، بندہ نواز گیسو درازؒ
۱۳۔جوامع الکلم، بندہ نواز گیسو درازؒ
۱۴۔شرح آداب المریدین، بندہ نواز گیسو درازؒ
۱۵۔المنقد من الضلال، امام ابو حامد غزالیؒ
۱۶۔در نظامی، علی بن محمود جاندارؒ
۱۷۔شمائل الاتقیا، رکن الدین دبیر کاشانیؒ
۱۸۔ القول الجلی فی ذکر آثار الولی، شیخ محمد عاشق پھلتیؒ
۱۹۔بحر المعانی، شیخ ابوجعفر مکی حسینیؒ
۲۰۔ روض الازہر فی مآثر القلندر، شاہ تقی علی قلندر کاکورویؒ
۲۱۔مقالات صوفیہ، شاہ تراب علی قلندری کاکورویؒ
۲۲۔مطالب رشیدی، شاہ تراب علی قلندری کاکورویؒ

۲۳۔ القول الموجہ، حافظ شاہ علی انور قلندر کاکورویؒ
۲۴۔ مناظر اخص الخواص، شاہ محبّ اللہ الہ آبادیؒ
۲۵۔ سیر الاولیاء فی محبۃ الحق جل وعلا، امیر خورد کرمانیؒ
۲۶۔ کتاب التعرف لاہل التصوف۔ شیخ ابوبکر محمد بن ابراہیم الکلابادیؒ
۲۷۔ التسویۃ بین الافادۃ والقبول، شاہ محبّ اللہ الہ آبادیؒ
۲۸۔ الکہف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ شیخ عبد الکریم الجیلیؒ
۲۹۔ الانسان الکامل فی معرفۃ الاواخر والاوائل۔ شیخ عبد الکریم الجیلیؒ

متقدمین کے اخیر دور میں حقائق ومعارف کو منظوم کرنے کی ابتداء ہوچکی تھی اور اس کی وجہ وہی تھی، جس کی طرف عارف رومیؒ نے اشارہ فرمایا ہے:

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

شیخ عطارؒ حکیم سنائی، مغربیؒ عراقیؒ ،نظامیؒ ابوسعید ابوالخیرؒ خسروؒ، جامیؒ، مولانا رومؒ، سعدیؒ وحافظؒ جیسے ان گنت صوفی شعرا اس بحر ناپیدا کنار کے بہترین شناور وغواص ثابت ہوئے، جنہوں نے تصوف کے رموز ونکات اور حقائق ومعارف کو نہایت دلنشین وموثر پیرایہ میں پیش کیا۔

بطور نمونہ حضرت عطارؒ کے چند اشعار درج ہیں:

خلق ترسد از تو من ترسم زخود کز تو نیکی دیدہ ام در خویش بد

لوگ تو تجھ سے ڈرتے ہیں اور میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں، اس لئے کہ تجھ سے بھلائی کا تجربہ ہوا اور اپنے سے برائی کا)

ذرہ دردم دہ اے درمان من زان کہ می دردت بمیرد جان من
کفر کافر را و دین دیندار را ذرۂ دردت دل عطار را

(میرے طبیب مجھے درد محبت کا ایک ذرہ عنایت کر کہ تیرے درد محبت کا نہ ہونا میری جان کی موت ہے۔ کافر کو کفر مبارک ہو اور دیندار کو دین اور عطار کو تیرے درد کا ایک شمہ)

رحمت الٰہی کا آسرا ارباب تصوف کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں:

تو یقین می دان کہ صد عالم گناہ از تف یک توبہ بر خیزد زراہ
بحر احسان چو در آید موج زن محو گرداند گناہ مرد وزن

یہ وہی عطارؒ ہیں جن کے متعلق مولانا جلال الدین رومیؒ جیسے عارف کہتے ہیں:

ہفت شہر عشق را عطار گشت ماہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

مولاناؒ کے لایق صاحبزادے حضرت سلطان ولد فرماتے ہیں:

عطار روح بود سنائی دو چشم او ما از پے سنائی وعطار آمدیم

آخر میں اپنی گفتگو کے تتمہ وتکملہ کے طور پر اور حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی نسبت سے آپ کے ایک پیر بھائی حضرت شیخ ابوجعفر مکی حسینی قدس سرہ کی حقائق ومعارف میں معرکۃ الآرا تصنیف بحر المعانی کا مختصر تعارف درج کیا جارہا ہے۔

یہ عجیب وغریب تصنیف اب سے تقریباً سو سال قبل طبع ہوچکی ہے، مگر اس میں اس قدر اغلاط ہیں کہ پڑھنا اور پھر صحیح مفہوم نکالنا مشکل ہے۔ بحر المعانی کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں راقم السطور کا مقالہ بحر المعانی اور اس کے مصنف۔(فکرونظر ۱۹۹۰ء، جلد ۲۷، شمارہ ۴، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) ملاحظہ ہو۔ ۴۰۰، سے زیادہ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۳۶ مکتوبات اور ایک خاتمہ ہیں۔ مکاتیب الیہ، حضرت شیخؒ کے برادر طریقت ملک محمود عرف شیخین ہیں۔ پہلا مکتوب ایمان سے متعلق ۱۰/صفر المظفر ۸۲۴ھ کا ہے بعد ازاں نماز ، زکوٰۃ روزہ وحج ، معرفت روح عشق ، اسرار انسانی، مشاہدات ، طالب ومطلوب ، کفر اسرار قرآن ،شکر ، وصول ،معرفت نفس وعجب ، اسرار مذاہب، سماع ، رویا، نماز اور اس کے لوازم وغیرہ جیسے مباحث پر عجیب وغریب حقائق معارف بیان فرمائے ہیں۔ آخری مکتوب ۲۷/محرم الحرام، ۸۲۵ھ، کا عشق واسرار سے متعلق ہے۔ خاتمہ میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے فضائل ومناقب ہیں ۔ ان مکاتیب میں جابجا حضرت شیخؒ کے عارفانہ فارسی اشعار بھی ہیں۔ تخلص محمد ہے۔

ابتدا اس طرح ہے! آن خدای کہ انگبین شیرین نوش را از فوارہ تلخ نیش زنبور بقدرت خویش چکاند وآن سبحانی کہ نبات در قمطرۂ عطا از شاخ نومیدی رساند وآن ملکی کہ اشک دیدہ پر ابر الخ۔

(یعنی وہ خدا جو اپنی قدرت سے شہد کی مکھی کے لئے تلخ شگوفوں کے فوارہ سے رنگین شیرین نوش ٹپکاتا ہے اور وہ سبحان جو سوکھی شاخ سے عین یاس میں اپنے کیسۂ عطا سے سبزہ ظاہر فرماتا ہے اور وہ تصرف کرنے والا جو گھرے ابر کے آنسو جن کو بارش کہتا ہے رات کو صدف کی آنکھ کے خانے میں فروزاں کرتا ہے) اور وہ قادر جو کالی رات کے نفس کو جن کو تو صبح کہتا ہے نیلے آسمان

کے نیچے دن کی خلعت پہنا تا ہے اور ایسا صانع جو عارض خورشید سے اندھیری رات کی زلف کا نور دکھا تا ہے اور آسمان کے چہرے پر روشن ستاروں کی آنکھیں کھولتا ہے۔ وہ ایسا ستار ہے جو اپنے فضل کی آگ سے گناہ گاروں کے گناہوں کا کھلیان جلا ڈالتا ہے اور عنایت کی راہ پر چلنا سکھا تا ہے۔ اہل وجدا اور عاشقوں کو محبت کرنا سکھا تا ہے اور موحدوں کی گردنوں میں توحید کی لڑی باندھتا ہے اور اپنے جمال کا شوق مشاق کے باطن میں مقرر فرما تا ہے وہ ظہور کرنے والا جو اپنے سراپردہ کبریائی کو اپنے نور کی چمک کے سامنے لٹکا دیتا ہے، تاکہ اس کے انوار جمال کے درد فراق سے دل خون ہوجائیں اور کشتی سلوک کبھی جلال کا کشف کرے، یہاں تک کہ تجلی صفات پاک کی ہیبت سے آنکھیں بہہ نکلیں اور کبھی اہل عرفان کی محبت کو جنبش دیکر ہزار فرسخ کے بعد کو ختم کردیتا ہے تاکہ موسیٰ کی طرح طور میں اور وحی غفور کے حریم میں مستغرق ہوجائیں۔ اور اپنے آپ کو وہی دیکھیں اور لیس فی الوجود الاّ اللہ (اللہ کے سوا وجود میں کوئی نہیں ہے) کا گیت گائیں اور کبھی اہل اسلام کی جان میں اسرار کے جام لڑھکائے تاکہ وہ غایت مستی میں اس کی ہستی میں مستغرق ہوجائیں اور انا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی کے نعرے لگائیں الخ۔

بحر المعانی کی اہمیت اور منزلت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ پنجشنبہ ۲۷ رمحرم الحرام کو جب ۳۶ واں مکتوب لکھ رہا تھا اور قلم اسرار عشق میں بڑی تیزی سے چل رہا تھا جب زرغبا تزددحبا (کبھی کبھی مِلا کرو محبت بڑھے گی) کے مقام پر پہنچا تو ایک دوسری کیفیت وحال میں چلا گیا اور گھٹنوں پر سر رکھ دیا اسی عالم میں مشاہدہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام صحابہ کرام مع حضرت مرتضٰی رضوان اللہ علیہم سے لیکر حضرت نصیر الدین محمودؒ (چراغ دہلی) تک تمام حضرات مسجد قبا میں تشریف فرما ہیں۔ میں نے بڑی عاجزی وانکساری سے سلام عرض کیا۔ سب بزرگوں نے اس گناہگار پر نظر رحمت فرمائی اور بیٹھنے کا حکم فرمایا، چنانچہ خاکسار ایک جگہ بیٹھ گیا۔

در حلقۂ عاشقان چالاک
ماصدر نشین زیر وستم

میں نے دیکھا کہ ہر ایک کے چہرہ مبارک سے مسرت وخوشی ظاہر ہورہی ہے۔ اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فارسی زبان میں مجھ سے فرمایا: اے حضرت لم یزل ولایزال مست فرزند بحر المعانی لاؤ۔ میں نے جو ۳۵ یا ۳۶ مکاتیب لکھے تھے فوراً پیش کردیے۔ سرکار صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نبوت کی طاقت سے تمام مکتوبات بہت جلد پڑھ کر فرمایا: بیٹے! تمام تعریف اس ذات کی ہے جس نے تم کو ان اسرار ورموز کا علم عطا فرمایا بعد ازاں فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس سے زیادہ علم عطا فرمائے۔ اس کے بعد فارسی زبان میں ارشاد فرمایا کہ دوستو! بحر المعانی کا یہ مصنف وہ شخص ہے جس نے پورے کلام مجید کے حقیقی معنوں کو بحر المعانی میں لکھ دیا ہے۔ اگر روئے زمین کے تمام علوم دھودیے جائیں اور ایک ورق بھی ان علوم کا باقی نہ رہے تب بھی یہ شخص ان علوم کو از سر نو تحریر کرڈالے گا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ بیٹے، حضرت لم یزال ولم یزل کے مست، ان اسرار ورموز کو صحرا میں نہ ڈال دینا کیونکہ شریعت کے امور دنیامیں بہت کم ہوتے جارہے ہیں اور اہل شریعت سے لوگ نفرت کرنے لگے ہیں۔ میں نے اقرار کیا کہ ارشاد سر آنکھوں پر۔ چنانچہ ۳۶ ویں مکتوب سے آگے اس واقعہ کے بعد لکھنا شروع کیا اور بحر المعانی کو مکمل کیا۔

مکتوب دوم میں فرماتے ہیں بھائی! اگر تم ہزار سال کی عمر پاؤ اور اہل ظواہر بھی پائیں اور تم نماز پڑھتے رہو اور وہ نماز پڑھتے رہیں۔ ہرگز قربت تک نہ پہنچیں گے، جیسا کہ خواجہ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔'' سیئاتی علی الناس فی امتی زمان یجتمعون فی المساجد ویصلون ویصومون فی رمضان ومافیھم مسلّم۔''(عنقریب میری امت کے لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب وہ مساجد میں جمع ہوں گے نمازیں پڑھیں گے رمضان میں روزے رکھیں گے لیکن ان میں کوئی مسلمان نہ ہوگا)۔ جان لو کہ یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے۔

چودھویں مکتوب میں حضرت علی مرتضیٰ کے فضائل ومناقب کے بیان میں جو حقائق ومعارف ہیں، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی مکتوب میں فرماتے ہیں:

یہ فقیر ایک روز مصر کے دریائے نیل میں کشتی پر حضرت خضرؑ کے ہمراہ تھا اور شاہدان لایزالی کے بارے میں گفتگو تھی۔ خضرؑ نے یہ بھی فرمایا کہ عبد القادر گیلانیؒ اور شیخ نظام الدین بدایونیؒ مقام معشوقیت میں تھے۔ پھر فرمایا کہ خدا کی قسم نظام الدین بدایونیؒ اور عبد القادر گیلانیؒ کا جیسا نیلے آسمان کے نیچے نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔ اس کے بعد مقام معشوقیت اور مقام غیرت کی تشریح فرمائی ہے۔ ۱۹ ویں مکتوب میں کفر جمال، کفر روحی، کفر جلالی اور کفر الٰہی کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ بیچارے مولانا جلال الدین رومیؒ کو ان کفروں کی خبر اور ان کا اثر پہنچا تھا کہ اس مقام سے اپنے کو آگاہ کیا ہے۔

هنوز از کاف کفرت خود خبر نیست حقایقهائے ایمان راچہ دانی

(تو ابھی اپنے کفر کے کاف سے ہی واقف نہیں ہے، ایمان کے حقایق کو تو کیا جانے؟)

اسی مکتوب میں ابلیس کے کفر کے سلسلہ میں ایسے عجیب وغریب اسرار ودقائق ضبط تحریر میں لائے ہیں کہ عقل انسانی حیران ہے۔

حضرت علی مرتضٰیؓ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''محبوب ! نہ کہو کہ حضرت علی مرتضٰیؓ کے مناقب میں کوشش بلیغ کرتا ہے، جب کہ ہندوستان میں جو کوئی دو مرتبہ علیؓ کا نام لے اس کو رافضی کہنے لگتے ہیں۔ واللہ میں نے ان کے جو مناقب مشاہدہ کیے ہیں، اگر ان کا ایک ذرہ بھی ظاہر کردوں تو آفتاب کا جمال بالکلیہ محو ہوجائے۔''

بیچارے اہل ظاہر، حضرات صوفیہ پر جو چشم باطن وحقیقت سے حضرت علی مرتضٰیؓ کے محامد ومناقب مشاہدہ کرکے بیان فرماتے ہیں رفض ، شیعیت اور تفضیلت جیسے اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔

فرماتے ہیں: اے محبوب ! نبوت کا خزانہ ختم ہوگیا اور ولایت کا خزانہ ابد الآباد تک صرف میں ہے۔ مولانا روم کی جان پر اللہ کی رحمت ہو، انہوں نے کیا خوب کہا ہے:

ہارون ولایت کہ پس از موسیٰ عمران واللہ کہ علی بود علی بود علی بود

این نیست تناسخ سخن وحدت محض است تاہست علی باشد وتابود علی بود

پچیسویں مکتوب میں ''سکر'' سے متعلق عجیب وغریب اسرار کا بیان ہے۔ ۲۶ واں مکتوب ''وصل'' سے متعلق ہے۔ مختلف منازل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے محبوب ! عالی ہمت بنو کہ سوائے حق کہ کسی مطلوب ومحبوب کو گوشۂ چشم سے بھی نہ دیکھو اور اگرا نبیاء کے مقامات بھی تم پر پیش کیے جائیں تو ان پر بھی نظر نہ ڈالو اور حق کے سوا باطن میں کسی سے مشغول نہ ہو۔ اسی ضمن میں حضرت بایزید بسطامیؒ کی مثال دی ہے۔ بعد ازاں فرماتے ہیں کہ جب درویش مقام کبریا میں نزول کرتا ہے تو اس پر انبیاء ورسل کے مقامات پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ اس کی عالی ہمتی وپست ہمتی کا امتحان لیا جائے۔ اگر پست ہمت ہے تو ان مقامات پر نظر کرتا ہے اور باطن میں تمنا کرتا ہے۔ مگر فوراً اس مقام کبریا سے سرنگوں کرکے پلٹا یا جاتا ہے اور اس کے احوال پلٹ دیے جاتے ہیں۔ بھلا نبوت کے طویلہ کے کتوں کو مسند نبوت سے کیا کام ہے۔

۲۷ واں مکتوب شنبہ ۱۰ ذالحجہ ۸۲۴ ھ کا معرفت نفس وعجب کے بیان سے متعلق ہے فرماتے ہیں ۔ سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ عابد کے حق میں اس کے اکثر طاعات معصیت ہوتے ہیں اور طالب کے حق میں اس کے اکثر معاصی طاعت ہوتے ہیں ۔ اے محبوب ارباب قلوب کے نزدیک بھی یہی معنی مقرر ہیں کیوں کہ ہر وہ طاعت جو غرور اور عجب کا سبب ہو وہ عین معصیت ہے اور ہر وہ معصیت جو اعتراضات اور عذر کی طرف لے جائے طاعت ہے۔ درحقیقت وہ معرفت تیرے لیے طاعت سے زیادہ مفید ہے۔

اے محبوب ! حضرت صمدیت جلت قدرۃ کے ایسے محبّ بھی روئے زمین پر ہیں کہ خط دین کے قواعد ان کے اقدام صدق سے معمور ہیں اور آدم وآدمیت کا سران کے احوال کے جال سے پاک ہے۔ وہ عرض ولایت کے سلطان اور بارگاہ عنایت کے ستون ہیں۔ ان کی ہمت کا ہما سوائے تاب قرب کے کہیں نہیں بیٹھتا۔ ان کی دولت کا عنقاء سوائے سدرۂ کبریائی کے کہیں قرار نہیں پاتا۔ وہ وحدت کے ایسے شاہباز ہیں جن کی ہمت اکسیر بادیہ جہالت کے مردود کو خالص سونا بنا دیتی ہے۔ وہ جناب حضرت صمدیت کے ایسے پاکباز ہیں جن کے مبارک انفاس کی برکت سے وہ گمراہوں اور ظالموں کو قبول کرکے مقبول بنا دیتا ہے۔ ایسے محبوب حضرت لایزالی کے شہباز صحرائے محبت میں ڈیرے ڈالتے ہیں لیکن دیکھنے والوں کو آنکھیں میسر نہیں کہ وہ ان حضرات کے محرم ہوسکیں۔

۲۹ ویں مکتوب میں سماع کے اسرار ورموز ، اس کے فوائد ، حضرات مشائخ چشتؒ کے سماع، ان کی کیفیات اور واردات کا بڑے پُر اثر انداز میں بیان ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے محبوب! اپنی فنا میں سماع فیض مطلق ہے یعنی اگر آواز سے کچھ سن لیا اور سنتے ہی حالت پیدا ہوئی اور انس نے لذت کو تازہ کردیا، گویا کہ الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) سنا اور غیر محبوب سے بے خبر ہوگئے، جیسے مصر کی عورتوں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھتے ہی خود کو فراموش کردیا اور اپنے ہاتھ کاٹے۔

مطربا! اسرار ما را باز گو　　قصہ ھای جانفزا را باز گو
ماجرای رفت ما را در ازل　　باز گو آن ماجرا را باز گو
مخزن انا فتحنا برکشا　　سرجان مصطفیٰ ؐ را باز گو

محبوب ! اہل ظاہر نادانوں کا گروہ ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ شریعت حضرت رسالت علیہ

السلام کے نفس کا عمل ہے اور سماع حضرت رسالت علیہ السلام کی روح کا عمل، پس نفس کے عمل کو مقبول اور روح کے عمل کو غیر مقبول بنادیا۔

ایک روز حضرت شیخ کبیر بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اپنے مریدوں میں اہل سماع اور اہل وجد کا ذکر فرما رہے تھے۔ برسبیل تذکرہ فرمایا کہ ہم نہریں کھود کر کاشتکاری کرتے ہیں، لیکن چشتی پانی لے گئے اور لے جاتے ہیں کیوں کہ ان کو سماع میں وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو ہم کو چالیس دن میں حاصل نہیں ہوتی۔ بعض بزرگ مریدوں نے عرض کیا کہ آپ کیوں نہیں سنتے، فرمایا وہ ایسی معراج ہے جس سے ہم محروم ہیں۔

آخری مکتوب عشق اور اس کے اسرار ورموز سے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں : اے محبوب! حضرت صمدیت جلت قدرت کو اپنے آپ سے ایسا عشق ہے کہ جو کچھ کرتا ہے اپنے ساتھ کرتا ہے، جیسے کہ شب معراج میں حضرت رسالت علیہ السلام کو قاب قوسین او ادنیٰ میں ندا پہونچی کہ اے میرے محبوب ٹھہر جایئے خواجہ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نامرادی کا نعرہ مارا اور فرمایا کیوں ٹھہروں۔ دوسری ندا پہنچی کہ انّ اللّٰہ یصلی (اللہ تعالیٰ نماز پڑھ رہا ہے) خواجہ عالمؐ نے فرمایا ماصلوتک (تیری نماز کیا ہے) قال اللّٰہ تعالیٰ صلوۃ الشناء الذّاتی (اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری نماز ثناء ذاتی کی نماز) یہ جلال عظمت اور کمال سلطنت جو کچھ رکھتا ہے اپنے آپ سے رکھتا ہے ۔کما قال اللّٰہ تعالیٰ یا موسیٰ ان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعاً فانّ اللّٰہ غنیٌ حمید۔ (جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ اگر تم اور روئے زمین کے سبھی لوگ کفر کے مرتکب ہو تو بھی کوئی فرق نہ پڑے گا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور تعریف کیا ہوا ہے)۔

اے محبوب ! میں ایک رات خلوت میں طواف کعبہ کر رہا تھا اور حرم کے اندر مشغول تھا۔ شوق نے جوش مارا میں نے کہا: خداوندا! تو کس کا ہے ؟ میرے سر نے کہا کسی کا نہیں۔ پھر کہا تو کس کا تھا؟ کہا کسی کا نہیں۔ پھر کہا کس کو چاہتا تھا؟ کہا کسی کو نہیں۔ نامرادی سے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گیا۔ مکہ کے لوگوں نے مجھے اٹھایا اور گھر لے گئے۔ اسی عالم میں صبح سے عشاء تک چار نمازیں قضا ہوئیں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں۔ اے محبوب! ضلالت عشق کو سمجھو تا کہ ہدایت پاؤ۔ ووجدک ضالاً فھدیٰ (اے رسولؐ ہم نے آپ کو ضال پایا تو ہدایت دی) حضرت رسالت علیہ السلام کی

عشق سے تھی یعنی خداتعالیٰ کا عشق ان کے لئے حجاب ہوگیا تھا۔ البتہ اے محبوب! اپنے جد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غیرت سے ڈرتا ہوں کہ یہ بات کہتا ہوں، لیکن راز کو سمجھ کہ حضرت رسالت پناہ علیہ السلام ہر دن ورات ستر بار استغفار فرماتے تھے۔ یہ استغفار کیا ان کا کیا گناہ تھا؟ نہیں ہرگز نہیں! استغفار رفع حجاب کے لئے تھا، کیوں کہ عشق بھی حجاب ہے بس ضلالت نہ تھی سب ہدایت تھی۔؟

چوں حجاب مشکل آمد عشق وجاں در کوئے او لاجرم در کوئے او بے عشق وبے جان می روم

ضلالت سے ضلالت عشق مراد ہے۔ حضرت صمدیت جلت قدرۃً صرف اپنا عاشق ہے جو کچھ کرتا ہے اپنے عشق میں۔ اے محبوب! اسی واسطے سے کہتا ہوں کہ سارے عالم نے خدا کو جانا اور حضرت رسالت علیہ السلام کو نہ جانا اور ذرہ بھر بھی نہ پہچانا۔ خسرو کی جان پر اللہ کی رحمت ہو، جنہوں نے کہا۔

ایوان مراد بس بلند است
کانجا بہوش رسیدہ نتواں
کین شربت عاشقی ست خسرو
جز خون جگر چشیدہ نتواں

حقائق ومعارف کے اس گنجینہ کا اختتام ایک مناجات اور مختصر عبارت اور پھر ۱۳ اشعار پر ہوتا ہے۔ مناجات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یا الہ العالمین در ماندہ ام غرق خون وخشک کشتی راندہ ام
اے گنہ آمرز عذر آموز من سو ختم سدرہ چہ خواہی سوزمن
من زغفلت صد گنہ کردم بساز تو عوض صد گونہ رحمت دادہ باز
مبتلای خویش وحیران توام گر بدم ورنیک ہم زان توام
دست من گیرد مرا فریاد رس دست بر سر چند دارم چون مگس
خونم از بس شوق تو آمد بہ جوش تا جوان مردی بسی کردم نیوش

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے بحر المعانی میں صاحب تصنیف کے صدہا اشعار حقائق ومعارف پر مشتمل مذکور ہیں اور ہر شعر ایک جہان معنی رکھتا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار درج ہیں:

اس اہم کتاب کا اردو ترجمہ وشرح جناب مولانا حافظ تقی انور صاحب علوی کاکوروی مد ظلہ

العالی نے فرمائی ہے:

پیش ازاں روز کہ یاد می ومیخانہ نہ بود جان ما سوی خرابات ہمی کرد سجود
عاشقان را بہ طواف حرم کعبہ چہ کار شاہد ما چو رخ از خانہ خمار نمود
سر وحدت ہمہ روشن شود آن را کہ دمے زنگ ہستی خود از آئینہ دل بزدود
بادہ می نوش کہ معشوق حقیقی ہر گز ہر کہ او بستۂ زہد است برو درنہ کشود
بس کہ از نعرۂ مستان صبوحی تاروز در این میکدہ چشمان محمدؐ نہ غنود
گر گذر یابی زنفس وجسم وجاں آشنا گردی یقین باجان جان
جان جان ہم پر تواست از ذات او کس نہ بیند جزبدان مرات او
چون روح در نظارہ فنا گشت این بگفت نظارۂ جمال خدا جز خدا نہ کرد
نی بو مغزان بیک می مست شو نی بیک دردی ہمی معذور باش
گرمئے می وصل محمدؐ درکشی مست ولا یعقل مشو مخمور باش
ہمچو آن حلاج بدمستی مکن یا خسی باش یا منصور باش
در عشق اگر نیست شوی ہست شوی وز عقل اگرہست شوی پست شوی
ویں بوالعجبی است کہ از بادۂ عشق ! ہشیار گہی شوی کہ سرمست شوی

آخر میں انہی کے ایک شعر پرمضمون کوتمام کرتاہوں:

بہ پایان آمد این دفتر حکایت ہمچنان باقی
بصد دفتر نمی گنجد حدیث حال مشتاقی

۞

شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی کی عربی تحریروں کا ایک جائزہ

پروفیسر زبیر احمد فاروقی

شاہ ہمدان میر سید ہمدانی فارسی زبان وادب کے ایک بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب پر بھی یکساں قدرت رکھتے تھے۔ انکی عربی تحریریں، جو زیادہ تر رسائل سے عبارت ہیں، ان کے پختہ اسلوب انشاء پر دلالت کرتی ہیں۔ فارسی کی طرح ان تحریروں کے موضوعات بھی عام طور پر تفسیر قرآن، حدیث، اخلاق، تصوف، اصلاحِ باطن اور حکمت ہیں۔ یہ تحریریں زیادہ تر مخطوطات کی شکل میں ایران اور دوسرے ممالک کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اور ان کی اشاعت کے سلسلہ میں میری ناقص معلومات کے مطابق ابھی تک سنجیدگی کے ساتھ کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس مختصر جائزے میں ان کی کچھ اہم عربی تحریروں اور ان کے مضامین پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں بیشتر معلومات ڈاکٹر پرویز اذکائی کی تصنیف ''عروج اسلام اور ایران صغیر''[۱]، نور الدین جعفر بدخشی کی تصنیف ''خلاصۃ المناقب'' بہ تصحیح ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر (مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد) اور ڈاکٹر محمد ریاض کی تصنیف ''احوال وآثار واشعار میر سید علی ہمدانی'' (مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد) سے ماخوذ ہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے ہم میر سید علی ہمدانی کی عربی تحریروں کو چار بڑے زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں: تفسیر، حدیث، تصوف اور ادب۔ ان میں تصوف کا دائرہ نسبتاً زیادہ وسیع ہے، اس لئے کہ اخلاقیات، ادعیہ اور اوراد جیسے مضامین بھی اس ذیل میں آتے ہیں۔

آپ کی عربی تحریروں میں رسالہ ''**الانسان الکامل یا الروح الاعظم**'' اپنے موضوع اور اسلوب کی بنا پر امتیازی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ لندن کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کا عکس جامعہ ملیہ اسلامیہ لائبریری میں موجود ہے، مگر اس تک میری رسائی نہیں ہوسکی۔ اس رسالہ میں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، انسان کامل کے اوصاف وکمالات کی طرف جسے 'الروح الاعظم' کا نام دیا گیا ہے، اشارہ کیا گیا ہے۔ رسالہ کی ابتدا خدا

کی حمد و ثنا سے ہوتی ہے اور اسکے بعد آں حضرتؐ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: '' **انا من اللّٰہ والمؤمنین منّی** '' (میں اللہ سے ہوں او رمومنین مجھ سے ہیں)۔ انسان کامل کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ انسان کامل وہ ہے جو کامل ترین انسان یعنی حضرت محمدؐ کی تقلید کے ذریعہ انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچے۔ اس سلسلہ میں میر سید علی ہمدانی نے رسولؐ اور اہل بیتؑ رسولؐ کی پیروی اور محبت کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہوئے، حضورؐ کا یہ قول نقل کیا ہے:''**لا یدخل الجنة اقوام افئدتھم مثل افئدة الطیر**'' جنت میں وہ لوگ داخل نہیں ہونگے، جن کے قلب پرندوں کے قلب ۲؎ جیسے ہیں۔ پھر فرمایا کہ جنت دراصل حضورؐ کا قلب ہے اور جس نے اہل بیتؑ سے محبت کی وہ جنت میں داخل ہوگیا۔ اسی طرح حضرت علیؑ کے قول ''**ھذا کتاب اللّٰہ الصامت وانا کتاب اللہ النّاطق**'' (یہ خدا کی خاموش کتاب ہے اور میں خدا کی بولتی ہوئی کتاب ہوں) کو اس بات پر استشہاد کے لئے پیش کیا گیا ہے کہ اعلیٰ مقام تک آپ کی رسائی صرف پیروی رسولؐ کے طفیل میں ممکن ہوئی۔

اس کے علاوہ رسالہ میں فلسفہ وحدت الوجود کی طرف بھی کافی اشارے ملتے ہیں اور آپ کے نزدیک انسان اسی وقت کامل ہوسکتا ہے جب 'موتوا قبل ان تموتوا'' ۳؎ کے مصداق 'اتصال بحق' کی کیفیت اپنے اندر پیدا کرلے۔

تصوف کے موضوع پر لکھے گئے دیگر رسائل میں فقراء اور مساکین کے اوصاف سے متعلق دورسالے ''صفتہ الفقراء'' اور ''فی فضل الفقر وبیان حالات الفقراء'' کے عنوان سے مشہور ہیں، جن میں آیات قرآنی، احادیث رسولؐ اور اقوال صوفیہ سے استشہاد کرتے ہوئے فقراء اور اولیاء اللہ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ یہ عبارت ملاحظہ ہو:

" الفقر حلیة الانبیاء ولاس الاولیاء وشعارالاصفیاء ورداء الاتقیاء و منیة الصّادقین ومطلب الزّاھدین ومقصد الصالحین وبرھان السّالکین و عنوان العارفین ونھجة الحبین وبھجة المشتاقین ودأب المؤمنین وزین المحققین وشین المنافقین"

(فقر انبیاء کا زیور ہے، اولیاء کا لباس، اصفیاء کا شعار، پرہیزگاروں کی چادر، اہل صدق کی آرزو، زاہدوں کا مقصود، اہل محبت کا راستہ، اہل اشتیاق کے لئے سرور، مومنوں کی عادت، اصل محقق کی زینت اورمنافقین کے لئے باعث عار ہے۔)

اہل سلوک کے اوصاف کے بیان میں آپ نے ایک رسالہ'' طائقانیہ'' کے نام سے چھوڑا ہے۔

یہ بھی ایک قلمی نسخہ ہے اور کاتب نسخہ کے مطابق طائقان ایک جگہ کا نام ہے، جو رشت اور قزوین کے درمیان واقع ہے۔ میر سید علی ہمدانی کا وہاں سے گزر ہوا تھا۔ ابتدا میں اس کے موضوع کے بارے میں جو عبارت ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ آپ نے اہل طائقان کے لئے لکھا تھا اور اس میں سالکان اہل دین کے لئے ضروری شرائط اوصاف بیان کئے ہیں، جن میں ارادت، توبہ، مجاہدہ، تواضع، توکل، صبر وشکر، مراقبہ، استقامت، اخلاص، صدق، حیاء اور محبت وشوق وغیرہ جیسے اوصاف کا خصوصی تذکرہ ہے۔ ایک اور رسالہ اسی موضوع پر ''من خواص اہل باطن'' کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ توبہ کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ ''رسالۃ التوحید'' کے عنوان سے ہے، جس میں توبہ کی تعریف اور اس کی بنیادی شرائط کا بیان ہے۔''**فالتّوبة هی الرجوع من المخالفة الی الموافقة وشرائطه ثلاثة اشیاء: النّدم والاعتذار والاقلاع، الاوّل وظیفة الجنان والثانی ورد اللسان والثالث کف الجوارح عن العصیان**''

توبہ مخالفت سے موافقت کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ اسکی تین شرطیں ہیں: ندامت، معذرت اور گناہوں سے رک جانا، پہلا عمل قلب کا ہے، دوسرا زبان کا اور تیسرا اعضاء رئیسہ کا۔''

توحید باری کے اثبات وایضاح کے سلسلے میں ایک اہم رسالہ (اسرار النطقہ) کے نام سے موجود ہے، جس کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسکا آغاز مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

الحمد لله الّذی ظهر بما شاء بمشیته الازلیة واستتر ممن شاء عزّته الرصدیة و جعل خصائص النقطة بقدرتهٖ آیةً دلت علی حقائق أحدیته الغیبة واطلع طوالع حقائقها من عالم الرقم عکسوا بسون تجلیاته الذّاتیة وتنزلات آیاته القدسیّه"

رسالہ" **العوالم الخمس الکلیه** " معرفت نفس کے موضوع پر ایک اہم رسالہ ہے۔ تصوف اور اصول کے موضوع پر آپ کے اور عربی رسالے'' الواردات الغیبة و اللطائف القدسیه'' جسے آپ نے سلطان محمد بہرام شاہ بن سلطان خاں حاکم بلخ وبدخشاں کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا، رسالہ سیر الطالبین، رسالہ نوریہ، رسالہ معاش السالکین اور رسالہ کشف الحقائق کے نام سے موسوم ہیں۔

آپ کا ایک اور مشہور رسالہ'' الخواطریه'' ہے جو ایمان وعمل کے اعتبار سے کمزور قلوب پر شیطانی قوتوں کے اثرات سے متعلق ہے۔ اسکے نسخے، تہران، تاشقند اور انگلستان میں موجود ہیں۔

ذکر اور اوراد کے موضوع پر آپکے جو عربی رسائل ہیں، ان میں رسالہ ''اورادفتحیہ'' آسانی سے مطبوعہ شکل میں دستیاب ہے۔ یہ مسنون دعاؤں پر مشتمل ہے اور کشمیر اور اس کے قرب وجوار میں آج بھی عوام میں بہت مقبول ہے۔ اس رسالہ کے اردو، انگریزی اور کشمیری زبان میں ترجمے بھی دستیاب ہیں۔ نیز اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

دوسرا رسالہ '' **رسالة الاوراد** '' کے نام سے ہے، جو تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ذکر اوراد کی فضیلت کا بیان ہے، دوسرا باب طالبان اتصال ذات الٰہی کے لئے اوراد کی ضرورت سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں ذکر اوراد کے لئے اوقات کی تقسیم وتجدید کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں قرآنی آیات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات

واصبر نفسک مع الّذین یدعون ربّھم بالغدوة والعشی (سورہ کھف)

فاذا قضیتم الصلوٰة فاذکرو اللّٰہ قیاماً وقعودا(سورة نساء)

وسبح بحمد ربّک قبل طلوع الشمس قبل غروبھا وآناء اللیل (سورة طٰہ)

آپ کا شعری ذوق، سلیقہ اور مرتبہ مکمل طور پر آپکے فارسی کلام میں نمایاں ہے، البتہ تذکرہ نگاروں نے آپ کے آثار کے ضمن میں ایسی کسی چیز کی طرف رہنمائی نہیں کی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے عربی شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ زبان پر ان کی قدرت کے پیش نظر عربی میں بھی انہوں نے ضرور کچھ عارفانہ اشعار کہے ہوں گے، جو قلمبند نہیں کئے جا سکے۔

بہر حال عربی ادب سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کچھ عربی قصائد کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے، جن میں ابوعبداللہ شرف الدین البوصیری کا مشہور قصیدہ ''البردہ'' شامل ہے جو حضورؐ کی مدح میں ہے اور ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ 'البوصیری' پر فالج کا حملہ ہوگیا۔ ایک شب اسے حضورؐ پاک کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی، اس طرح کہ آپؐ اس کے جسم پر اپنا دست مبارک پھیر رہے ہیں۔ شاعر جب خواب سے بیدار ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اسکی بیماری مکمل طور پر غائب ہوچکی ہے۔ اس بنا پر اس قصیدہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور مختلف زبانوں میں اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔

اسی طرح آپ کا ایک اور رسالہ ''مسارب الاذواق'' کے نام سے بہت مشہور ہوا، جو پانچویں

صدی کے معروف شاعر ابوحفص ابن فارض کے قصیدۂ جیمیہ کی شرح ہے، اس کے قلمی نسخے آسانی سے دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر احمد ریاض نے اسے مجلّہ فرہنگ ایران میں شائع کرنے کے علاوہ اسے اپنی کتاب 'احوال وآثار اشعار میر سید علی ہمدانی، میں بھی شامل کیا ہے۔

اس شرح میں الفاظ کی لغوی اور نحوی صرفی تحقیق کے علاوہ مضامین کی وضاحت میں جس بسط وتفصیل سے کام لیا گیا ہے، وہ عربی زبان وادب پر گہرا عبور رکھنے والے شخص کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ بعض اشعار کی تشریح تو کئی کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا عربی رسائل کی تحریریں یقیناً ایک ایسے عالم کی ہیں، جسے زبان وبیان پر پوری قدرت اور فصیح وبلیغ تعبیرات کے تقاضوں کا پورا علم ہے۔ مضامین کے اعتبار سے یہ تحریریں میر سید علی ہمدانی کی فارسی تحریروں سے مکمل مماثلت رکھتی ہیں اور ان میں ادب کے بنیادی عناصر اخلاص، صدق، جذبہ اور واقعیت بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر ان کی ان تحریروں کو ادب اسلامی کے شہ پاروں میں جگہ دے سکتے ہیں۔ان شہ پاروں کو مطبوعہ شکل میں محفوظ کرنے کی ضرورت ہے، جس کی طرف اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

حوالے:

۱- دانشگاہ بوعلی سینا، ہمدان

۲- طیور کے قلب جیسا ہونے سے اشارہ غالباً ضعف قلب اور ضعف ایمان ویقین کی طرف ہے۔

۳- مرنے سے قبل (خدا کی راہ میں) فنا ہوجاؤ۔

ہندوستان میں

''ہمدان'' کے چند صوفیائے کرام

(حیات وخدمات)

ڈاکٹر شاہد اقبال

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اپنے ظہور کے ابتدائی مراحل میں ہی سرزمین ایران میں داخل ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایرانی عوام مجموعی اعتبار سے مشرف بہ اسلام ہوگئے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے تمام مصنوعی اور خودساختہ خداؤں کی نفی وتردید اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت پر بھرپور تاکید اور اس میں کسی قسم کی مفاہمت سے انکار کرتے ہوئے ایرانیوں کو اس بات کی کھلی چھوٹ دیدی تھی کہ وہ اپنی ہزاروں سال قدیم ثقافتی اور تہذیبی میراث کو گلے لگائے رکھیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اسلام ایرانی تہذیب اور فارسی زبان کے کندھوں پر سوار ہوکر مرکزی ایشیائی ممالک میں داخل ہوگیا اور جب مسلم حاکموں اور حملہ آوروں نے اپنی ظالمانہ راہ وروش کے ذریعہ انسان دوستی پر مبنی اسلامی تعلیمات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تو ایرانی صوفیاء کرام عشق ومحبت کا پیغام لے کر آگے بڑھے اور انسانیت کو منزل کمال عطا کرنے میں ہمہ تن سرگرم ہوگئے۔ ایران اور مرکزی ایشیائی ممالک کے مختلف علاقوں سے جوق در جوق ہندوستان تشریف لانے والے صوفیوں میں ہمدانی علماء وصوفیاء کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ایران کے شہر ''ہمدان'' میں پیدا ہوئے، لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر اجمیر شریف تشریف لائیں گے، جہاں کفر وظلمت کی ردا ان کے ہاتھوں چاک ہوگی اور جہاں لاکھوں افراد ان کے دست حق پر مشرف بہ اسلام ہوں گے۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی ایران کے شہر سمنان سے اترپردیش کے ضلع فیض آباد کے قصبہ کچھوچھہ شریف تشریف لائے اسی طرح حضرت سیدشہاب الدین پیرجگجوت کا وطن وسط ایشیاء کا شہر کاشغر تھا۔

بالکل اسی طرح ہمدان کی سرزمین سے ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کرنے والے صوفیائے کرام میں حضرت سید امیر مسعود ہمدانی، حضرت سید موسیٰ ہمدانی، حضرت سید احمد چرم پوش ہمدانی اور حضرت سید علی ہمدانی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ یہ وہ صوفیائے کرام ہیں جنہوں

نے بنگال، آسام بہار، اتر پردیش، تبت، نیپال اور کشمیر میں اسلام کی شمع روشن کی۔ ذیل میں مذکورہ بالا صوفیائے کرام کے احوال وآثار کا خاکہ پیش کیا جارہا ہے:

۱۔حضرت سید امیر مسعود ہمدانی (المتوفی ۶۳۵ھ)

آپ کی ولادت ہمدان (ایران) میں ہوئی۔ تذکرہ نگاروں نے آپ کے والد کو بادشاہ وقت اور عالم بھی لکھا ہے، چنانچہ جب آپ کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو آپ کے والد انہیں شاہی مدرسہ لے گئے اور معلم کے سپرد کردیا۔ معلم نے بسم اللہ شریف پڑھانے کے بعد کہا پڑھو ''الف'' آپ نے پڑھا ''الف'' پھر معلم نے کہا پڑھو ''ب'' آپ نے فرمایا جس نے ''الف'' پڑھ لیا۔ اس کو ''ب'' پڑھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ''الف'' ہی اصل چیز ہے۔ پھر آپ نے ''الف'' کے کئی ایک معنی بیان فرمائے۔ معلم کو معلوم ہوگیا کہ یہ لڑکا اولیاء کاملین میں سے ہوگا۔ بہر حال آپ نے علم ''ہمدان'' ہی میں حاصل کیا۔

ابھی بیس سال کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آپ کے سر سے سایہ پدری اٹھ گیا۔ چنانچہ ''ہمدان'' کے تمام امراء جمع ہوئے اور آپ کو تخت شاہی پر بٹھایا۔ چند ماہ بعد تخت وتاج چھوڑ کر پیر کی تلاش میں نکل گئے۔ عراق اور شام کے مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے ہوئے ملتان پہنچے۔ ملتان اس زمانے میں صوفیوں کی اقامتگاہ بنا ہوا تھا۔ وہاں بڑے بڑے صوفیائے کرام موجود تھے۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت وحید الدین کرمانی، حضرت شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ (م: ۶۳۳ھ) حضرت خواجہ اسحاق چشتیؒ اور حضرت بابا فرید گنج شکرؒ (م: ۶۶۸ج) وغیرہ۔ آپ نے ہر ایک سے مصافحہ فرمایا۔

اس زمانے میں دہلی کے بادشاہ شمس الدین التتمش (م:۶۳۳ھ) تھے۔ ان کے حکم پر حضرت سید امیر مسعود ہمدانی نے الف، ب، ت، ث، اور کلمہ توحید پر بڑی پر زور تقریر کی۔ آپ کی تقریر نے وہ اثر دکھایا کہ سامعین جھوم اٹھے اور لوگوں کو عجیب سرور حاصل ہوا۔

سلطان شمس الدین التتمش، حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مرید تھے۔ سب مل کر آپ کو حضرت بابا فرید گنج شکر (م: ۶۶۸ھ) کی خدمت میں لے گئے انہوں نے خلافت کا تاج درویشی عطا کیا۔

حضرت سید امیر مسعود ہمدانی نے اپنے چند ہمرائیوں (شیخ شاہ حسین مدنیؒ اور سید برہان الدین بخاریؒ) کے ساتھ مشرقی ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ بنگال جو کفر وظلمت کے اندھیرے میں گم تھا وہاں شمع اسلام روشن کی اور لاکھوں تاریک دلوں کو منور کیا۔ بعد ازاں آپ نے علاقہ اودھ کے ضلع فیض آباد بھیاؤں شریف میں قیام فرمایا۔

آپ کا وصال ۲۴؍محرم الحرام ۶۳۵ھ بعد نماز ظہر ہوا اور اسی قصبہ بھیاؤں شریف میں آپ کا مدفن ہے۔ آپ کے روضہ مبارک پر شاندار سبز گنبد والی عمارت قائم ہے۔

حضرت سلطان سید اشرف جہانگیر نے فرمایاہے کہ شیخ مسعود بڑے بزرگ باتصرف اور باکرامات ہیں۔ جو شخص اس طرف (جانب مشرق) سے میری زیارت کے لئے آئے تو بغیر شیخ مسعود کی زیارت کے نہ آئے، ورنہ ایسے آدمی سے میں بیزار ہوں۔

۲۔ حضرت سید موسیٰ ہمدانی

نسب نامہ میں آپ کا نام سید سلطان موسیٰ کاظم ہمدانی بھی لکھا ہے۔ آپ ہمدان، ایران کے صاحب ثروت واقتدار خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے آپ کو ہمدان کا حکمراں بھی لکھا ہے۔ آپ نے عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ کر راہ فقر اختیار کی اور ہندوستان کا رخ اختیار کیا، حضرت سید شہاب الدین پیر جگجوتؒ (المتوفی۔۶۶۰، مدفن کچی درگاہ جٹھل شریف، پٹنہ (بہار) کی صحبت اختیار کی اور روحانی فیض حاصل کیا۔ حضرت پیر جگجوتؒ صوبہ بہار کا قدیم صوفی خانوادہ حضرت سید شہاب الدین پیر جگجوتؒ ہی کی نسل سے ہے۔ حضرت کی چار صاحبزادیاں تھیں اور سب کی سب ولیہ کاملہ تھیں۔

(۱) بڑی بیٹی حضرت بی بی رضیہؒ زوج حضرت مخدوم احمد یحیٰ منیریؒ بن شاہ اسرائیل بن امام محمد تاج فقیہؒ جن سے چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئیں۔

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ آپ ہی کے منجھلے صاحبزادے تھے۔

(۲) منجھلی بیٹی بی بی حبیبہؒ زوجہ مخدوم سید موسیٰ ہمدانی جن سے مشہور سہروردی بزرگ سید احمد چرم پوش ہوئے۔

(۳) تیسری بیٹی بی بی ہدیہ عرف بی بی کمال زوجہ حضرت سلیمان لنگر زمین بن مخدوم

عبدالعزیز بن امام محمد حاج فقیہؒ جن سے ایک بیٹا مخدوم عطاء اللہ اور ایک بیٹی بی بی کمالؒ (ہم نام والدہ) ہوئیں ۔جلیل القدر سہروردی بزرگ حضرت حسین دھکر پوش آپ ہی کے صاحبزادے تھے۔

(۴) چھوٹی بیٹی بی بی جمال زوجہ شیخ حمید الدین بن حضرت مخدوم آدم صوفیؒ (خلیفہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ) ان سے حضرت مخدوم یتیم اللہ سعید بازؒ ہوئے، جنہوں نے سید موسیٰ ہمدانیؒ کا نکاح اپنی دوسری صاحبزادی بی بی حبیبہؒ سے کیا تھا۔جن سے تین صاحبزادگان تھے: سید احمدؒ سید محمد اور سید محمودؒ۔

حضرت سید احمد چرم پوش سلسلہ سہروردیہ کے نامور بزرگ ہیں اور آپ کا مزار مبارک درگاہ انبیر (بہار شریف) میں ہے۔ جبکہ ان کے بھائی سید محمدؒ اور سید محمودؒ کے مزارات شہر ہمدان (ایران) میں ہیں۔

حضرت سید موسیٰ ہمدانی کے سال وفات کا صحیح علم نہیں ہے کہا جاتا ہے۔ کہ آپ کا مزار بہار شریف کے جوار (عمار پور سٹرک کے قریب کھیت میں) واقع ہے۔لیکن نشان مٹ چکا ہے۔

۳۔حضرت مخدوم سید احمد ہمدانی چرم پوشؒ (م:۷۷۶ھ)

آپ کی پیدائش ہمدان میں ہوئی تھی لیکن پروفیسر سید حسن عسکری نے شک کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی ولادت بہار ہی میں ہوئی ہوگی۔آپ کے والد کا نام حضرت سید موسیٰ ہمدانی اور والدہ بی بی حبیبہؒ بنت حضرت سید شہاب الدین پیر جگجوتؒ تھیں۔ آپ مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (المتوفی ۷۸۲ھ مدفن بہار شریف) کے خالہ زاد بھائی تھے۔آپ کی ابتدائی تعلیم ہمدان میں ہوئی تھی اور بعض روایتوں کے بموجب اعلیٰ تعلیم کے لئے بغداد گئے تھے اور علماء وفضلاء سے استفادہ کیا اور اس کے بعد ہمدان لوٹ آئے۔ پھر اپنے والد کی طرح تلاش حق میں سیر و سیاحت اختیار کی اور ملتان پہنچے۔ جہاں خدا رسیدہ بزرگ حضرت علاؤ الدین علاالحق سہروردیؒ سے ملاقات ہوئی تو ان سے بیعت ہوئے اور ان کی سرپرستی میں روحانی ریاضت کے مراحل طے کئے پھر اپنے مرشد کی ہدایت پر تبت کا سفر کیا اور لاسہ پہنچے۔ ایک روایت کے مطابق وہ نیپال آئے۔ بہر حال نیپال ہو یا تبت ،آپ نے اشاعت اسلام کی راہ میں صعوبتیں برداشت کیں اور لاکھوں انسانوں کے دلوں میں شمع ہدایت روشن کی۔آپ نے چالیس سال تک بند کنوئیں میں چلہ کشی بھی کی۔

آپ کا لقب چرم پوش تھا۔ یہ چمڑا اس مخصوص دنبہ کا تھا جو حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ قربان ہوا تھا۔ آپ نے حضرت حسن پیارے ملتانی سے دہ چمڑا بڑی عاجزی سے مانگ لیا تھا اور اس کو درمیان سے چاک کر گلے میں ڈال لیا تھا آپ کا انتقال ۲۶/صفر ۷۷۶ھ کو بہار شریف میں ہوا، مزار مبارک ابنیر درگاہ بہارشریف میں ہے۔ وصال کے وقت آپ کی عمر۱۱۸ سال تھی۔ آپ مخدوم جہاں شرف الدین یحیٰ منیری سے عمر میں چار سال بڑے تھے۔ آپ نے مخدوم جہاں سے چھ سال قبل وصال فرمایا۔

آپ قادر الکلام اور پر گوشاعر بھی تھے۔''دیوان احمدی'' آپ کی مطبوعہ یادگار ہے۔ اس کے علاوہ ایک ملفوظ بنام''ضیاء القلوب'' دستیاب ہے۔

۴۔حضرت سیدعلی ہمدانی عرف شاہ ہمدان یا علی ثانی (م: ۷۸۶ھ)

حضرت سید علی ہمدانیؒ نے اپنے وطن ہمدان سے نکل کر، کشمیر میں قدم رنجہ فرمایا تو ہندو اور بودھ مذہب پر ایمان رکھنے والے ۳۷ ہزار افراد نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ آپ کی پیدائش ۷۱۴ھ میں بمقام ہمدان ہوئی تھی۔ بیس سال کی عمر میں سیاحت کی غرض سے نکلے اور انیس سال تک مختلف ممالک کی سیر کرتے رہے بعد ازاں وہ اپنے مولد ہمدان واپس آئے اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہوگئے۔ تقریباً سات سال تک قیام کرنے کے بعد آپ ۴۶ سال کی عمر میں ۷۶۰ھ میں ختلان ہجرت کر گئے اور یہی وہ زمانہ تھا جب انہوں نے اپنے چند ساتھیوں کو دعوت دین کی غرض سے کشمیر روانہ کیا۔ ۷۷۳ھ میں امیر تیمور جیسے جابر بادشاہ سے میر سید علی ہمدانی کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے اسے ظلم وجبر سے باز رہنے کی تلقین کی۔ امیر تیمور ان کی نصیحت قبول تو کیا کرتا البتہ انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی۔ لہٰذا اب سیدعلی ہمدانی کے سامنے سوائے ہجرت نبوی کی سنت پر عمل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ۷۷۴ھ میں کشمیر ہجرت کر گئے۔ حضرت میر سید علی ہمدانی کی وفات ۷۲ سال کی عمر میں ۷۸۶ھ میں ہوئی۔ آپ کے مرید آپ کا جنازہ ختلان لے گئے، جو اب تاجکستان کا ایک حصہ ہے۔ جسے اب''کولاب'' کہا جاتا ہے۔

حضرت سیدعلی ہمدانیؒ کی نمایاں خصوصیت سلطان جارح کے سامنے ان کی حق گوئی و بے باکی تھی۔ ان کی اس حق گوئی سے ناراض ہوکر امیر تیمور نے انہیں قتل کی دھمکی دے دی تھی۔ لیکن شاہ

ہمدان نے اپنا مشن جاری رکھا اور ایک دوسری سنت نبویؐ پرعمل کرتے ہوئے انہوں نے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور انہیں رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ کشمیر کے بادشاہ قطب الدین کو شاہ ہمدان ایک خط میں لکھتے ہیں:

'اے عزیز! حرام مت کھا۔ اور کمزوروں کو محروم واپس مت کر''۔ اس خط میں آگے چل کر شاہ ہمدان بادشاہ کو خبردار کرتے ہیں کہ قیامت کے دن عام لوگوں سے نماز اور دیگر فرائض کے بارے میں پرسش ہوگی، لیکن حاکموں اور بادشاہوں سے سب سے پہلے ان کے عدل وانصاف کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ میر سید علی ہمدانیؒ کی حق پسند فطرت کا اندازہ ان چند جملوں سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے کشمیر کے ایک دوسرے بادشاہ سلطان غیاث الدین کو اپنے خط میں لکھے تھے:

''اگر ساری زمین میں آگ لگ جائے اور آسمان سے تلوار برسنے لگے تو بھی اس حق کو نہیں چھپاؤں گا اور دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کروں گا۔''

شاہ ہمدان کی نگاہوں میں دنیا کس قدر حقیر تھی اس کا اندازہ ان کی اس گفتگو سے بخوبی ہوسکتا ہے جو امیر تیمور کے ساتھ ہوئی تھی۔ در اصل عوام میں آپ کے زبردست اثر ونفوذ کو دیکھ کر بادشاہان وقت کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ آپ اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ امیر تیمور نے آپ سے اپنے اس خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ حصول اقتدار کے لئے یہ سب کررہے ہیں۔''

شاہ ہمدان نے جواب دیا۔

''سلطنت کے بارے میں ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لنگڑا کتا آیا اور اس کو اٹھا لے گیا۔ میں نے اسی وقت سے اپنی توجہ آخرت کی طرف کرلی۔ تیمور! تو اطمینان رکھ میں دنیا کا طالب نہیں ہوں۔''

شاہ ہمدانی کی تصانیف کی کل تعداد ایک سوستر بتائی گئی ہے۔ تاہم ان میں ''فتوحات نامہ'' کو زیادہ شہرت ملی، جس میں عبد اور معبود کے حوالے سے شاہ ہمدان کے عارفانہ خیالات اور صوفیانہ نظریات پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آگئے ہیں۔

شاہ ہمدان ایک مصلح اور ایک داعی ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک نازک خیال شاعر بھی تھے۔ آپ کی عارفانہ غزلوں کا مجموعہ ''چہل اسرار یا گلشن اسرار کے نام سے مشہور ہے۔

ماخذ ومنابع:

۱۔بحوالہ بحرِ ذخّار، جلد اول،صفحہ نمبر ۶۱۶

۱۔عبدالحفیظ مسعودی تحفہ مسعود،تاج آفیسٹ پریس ، جلال پور، امبیڈکر نگر، یوپی ۲۰۰۳ء

۲۔سید قیام الدین نظامی،تذکرہ صوفیائے بہار (شرفاء کی نگری)اسکائی لائن پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۹۵ء صفحہ ۱۰۹

۳۔ڈاکٹر محمد طیب ابدالی، تذکرہ مشائخ بہارجلد اوّل، مؤلفہ خانقاہ اسلام پور (نالندہ) ۲۰۰۳ء،ص ۱۶۴،۱۵۷/ ۵۰_ ۱۴۹

۴۔تذکیرہ (سہ ماہی مجلّہ رغازی پور) مرتبہ مولانا عزیز الحسن صدیقی ، سلسلہ نمبر ۳۲،ص نمبر ۴۷، ۲۴

بحوالہ۔تذکرہ مشاہیر غازی پور،مؤلفہ مولانا محمد عزیز الحسن صدیقی ،تبصرہ نگار ڈاکٹر سید شاہد اقبال

۵۔دیوان (سہہ ماہی مجلّہ رپٹنہ) مرتبہ ڈاکٹر سید حسین احمد جلد ۱، شمارہ ۱،ص ۵۵ ۔ ۴۲

(بحوالہ مضمون ، سلطان احمد چرم پوش اور ان کی شاعری از ڈاکٹر سید شاہ امام الدین

۶۔ضیا وجیہ (ماہنامہ رام پور) ایڈیٹر مولانا وجاہت اللہ خاں، بابت جولائی راگست ۲۰۰۱ء،

بحوالہ مضمون سید علی ہمدانی از ڈاکٹر رضوان اللہ آروی

مکتوبات اشرفی کی اہمیت

ڈاکٹرمحمد موصوف احمد اشرفی

حضرت میر سید مخدوم واحد الدین اشرف سمنانی رضی اللہ عنہ کی(ولادت ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ء میں ہوئی۔ آپ کی وفات ۲۸/محرم الحرام ،۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ء بمقام کچھوچھہ شریف، ضلع فیض آباد (امبیڈکر نگر، یوپی) ہوئی۔ آپ کا سلسلۂ نسب سمنان کے سلطان نسب، سادات نور بخشیہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ'' آپ مادر زاد ولی تھے اورعلم لدنی کے دروازے آپ پر کشادہ تھے۔'' سات قرأت کے ساتھ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف کا حفظ مکمل کیا۔ چودہ سال کی عمر میں تمام علوم منقول ومعقول سے فارغ التحصیل ہوئے اور صحاح ودیگر احادیث کی کتب کا مطالعہ و سماعت بھی کر چکے تھے۔ والد گرامی، سلطان سید ابراہیم نور بخشی، کے وصال کے بعد سلطنت کے اراکین نے آپ کو تخت پر بٹھایا۔ باوجود سلطنت کی ذمہ داری نبھانے کے، آپ کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ آپ اکثر شیخ رکن الدین علاء الدین سمنانی، شیخ اصیل الدین قیلوی اور دیگر مشائخ وقت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ حضرت خضر علیہ السلام سے متعدد بار بار بالمشافہ ملاقات رہی۔ حضرت خواجہ اویس قرنی کی روحانیت سے بھی مالا مال ہوئے، انہوں نے آپ کو اذکار اویسیہ کی تعلیم مرحمت فرمائی۔ مخدوم جہانیان جہاں گشت سے اوچ شریف میں ملاقات رہی۔انہوں نے آپ کو چودہ سلاسل سے خلافت واجازت بیعت عطا کی۔ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کی نماز جنازہ آپ ہی نے پڑھائی ۔مخدوم اشرف نے اپنے زمانے کے تمام (۱۹۲) مشائخ وقت مثلاً شیخ جلال الدین بخاری ،شیخ علاء الدین سمنانیؒ میر سید علی ہمدانیؒ خواجہ بندہ نواز گیسودراز ، میرصدر جہاں، شیخ مبارک گجراتی ، خواجہ حافظ شیرازی، شیخ رکن الدین شہباز، سید تاج الدین اودھی، شیخ عبد الملک وغیرہ کی صحبت پائی، ان سے فیض یاب ہوئے اور ان میں سے بعض مشائخ کی تربیت بھی کی۔

آپ کی بزرگی اور مناقب میں مرآۃ الاسرار کے مصنف شیخ عبد الرحمٰن چشتی رقم کرتے ہیں:

'' آن سلطان مملکت دنیا ودین ۔ آں سر حلقۂ عارفان ارباب یقین، آں محبّ ومحبوب

خاص ربّانی، غوث الوقت، حضرت میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ، آپ یگانہ روز گار اور شان رفیع، ہمت بلند، کرامات وافر کے مالک تھے۔''

میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی کا بیش تر حصّہ بنگال (پنڈارہ شریف) اور اودھ میں گذارا۔ سیر وسیات سے غیر معمولی دلچسپی رہی۔ ۳۰ سال تک سفر میں رہے۔ آپ نے ایک سفر''ربع مسکون'' کا ہمراہ میر سید علی ہمدانی کیا۔ متعدّد بار دنیا کا سفر کیا اور مختلف شخصیات ومخلوقات سے ملاقات کی اور ہم کلام ہوئے۔ میر سید اشرف، شیخ علاء الحق والدّین پنڈوی چشتی قدس سرہ کے مرید وخلیفہ تھے۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سلسلۂ مشخیت ہدایت کو آپ ہی نے از سرنو زندہ کیا۔ آپ کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ مکتوبات اشرفی اور لطائف اشرفی کے علاوہ درجنوں کتابیں آپ سے منسوب ہیں مثلاً فصوص الحکم شرح ہدایہ (فقہ) شرح عوارالمعارف، نحو اشرفیہ، فتاویٰ اشرفیہ، تفسیر نور بخشیہ، رسالہ غوثیہ، مراۃ الحقائق، ترجمہ قرآن پاک بہ زبان فارسی، رسالہ تصوّف واخلاق اور رسالہ قبریہ وغیرہ۔

غوث العالم سید اشرف جہاں گیر سمنانی کی غیر معمولی تصانیف میں لطائف اشرفی کو جو شرف وقبولیت حاصل ہوئی، ان کی دیگر تصانیف کونہیں ہوئی۔ لیکن ان کی دوسری اہم تصنیف مکتوبات اشرفی ہے۔ مکتوبات اشرفی کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب''اخبار الاخیار'' میں ایک طویل خط مخدوم صاحب کے مکتوبات سے من وعن نقل کیا ہے۔ یہ خط قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام رقم کیا گیا ہے۔ یہ خط فرعون کے حالت ایمان پر مرنے کے استفسار کے جواب میں ہے۔ مکتوبات اشرفی کے اس خط پر اخبارالاخیار کے مصنف نے سکوت اختیار کیا ہے۔

مکتوبات اشرفی کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں چودہویں اور پندرہویں صدی عیسوی کے تمام مشاہیر علماء، مشائخ، بادشاہِ وقت، امراء مثلاً قاضی شہاب الدین دولت آبادی، سلطان ابراہیم شاہ شرقی، نور قطب عالم پنڈوی، ہوشنگ خاں، سالار سیف الدّین انچولی، صیف خاں حسام الدّین، مولانا علام الدّین جائسی، شیخ فرید، شیخ رکن الدّین جونپوری، میر صدر جہاں، قاضی شیخ عبد الملک، شیخ عمر، شیخ عثمان، شیخ رضی، شیخ کبیر، شیخ راجا، مولانا

کریم الدّین ردولوی، ملک محمود، شیخ خیر الدّین انصاری وغیرہ کے استفسار پر تحریر کیے گئے ہیں۔

یہ مکتوبات اشرف جہاں گیر سمنانی کا گراں قدر سرمایہ ہے، جسے آپ نے اپنے ارادت مندوں کی طرف سے بھیجے گئے دقیق مسائل کے استفسار کے جواب میں رقم کیا گیا ہے۔ یہ خطوط مشکل مسائل دینی ودنیوی امور کے حل کے لئے آپ نے عنایت فرمائے ہیں۔

مکتوبات اشرفی کے جامع اوّل آپ کے اہم خلیفہ حضرت نظام الدین یمنی ہیں۔ آپ ۷۵۰ھ میں مخدوم صاحب کے بیعت وارادت میں داخل ہوئے۔ جامع ثانی، جانشین مخدوم اشرف سید نا عبدالرزاق نورالعین ہیں۔ مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی کے مکتوبات کا مطالعہ حق تعالیٰ کی شان ربوبیت اورتصوّف کی رمز وماہیت اور ایمائیت کو سمجھنے کا مؤثر ذریعہ اورنعمت غیر مترقّبہ سے کم نہیں ہے۔ ان مکتوبات میں صوفی کے قلب کی تسکین کا سامان اور سوزوسازودردِ و داغ وجستجو وآرزو، کے مقاصد کا حصول مشمول ہے۔ علماء وقت کے اسرار وتقاضے پر بعض دقیق فقہی اورصوفیانہ مسائل کے علاوہ مشکل اشعار کی تعبیر وتوجیہ بھی مخدوم پاک نے فرمائی، مثلاً خواجہ امیر خسرو کے شعر، ابوسعید ابوالخیر کی رباعی اور شیخ شرف الدین پانی پتی کے بیت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ذیل میں خسرو کے ایک شعر کی تعبیر وتشریح مخدوم صاحب کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے:

ز دریائے شہادت چوں نہنگ لا بر آرد ہو
تیمّم فرض کرد و نوح را در عین طوفانش (خسرو)

''جاننا چاہئے کہ متقدمین سے فضلائے روز گار کے اشعار کے مضمون اورشعرائے متقدمین کے گفتار کا مفہوم صوفیہ کے مشارب میں سے ایک مشرب ہے۔ پیش کردہ اشعار کی ترکیب اور ان ابیات کی غرض سمجھنے کے لئے اولاً اس گروہ کے اصطلاحات کوسمجھنا پڑے گا، کیوں کہ بغیر اس کے مقصود ومفہوم کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

دریائے شہادت سے مراد موجودات عینیہ ہیں۔ جب دریائے محیط نہایت نہیں رکھتا تو اس کے مقابلے میں 'ہوٗ آتا ہے اور یہ عالم غیب سے عبارت ہے۔ نہنگ لا میں اضافت بیانیہ ہے۔ ماسوا الٰہی کی نفی اور نامتناہی کا نقش کھینچنا ہے۔ ہر وقت موحد موجودات کے آئینہ سے رخسارۂ وحدت مشاہدہ اورحجلۂ کائنات سے عذار حقیقت کے معائنہ میں استغراق حاصل کرتا ہے، اس استغراق سے ایک قسم

کی رائی ومرئی رخسار وآئینہ سے قائم ہوتی ہیں۔ جسے شعر میں تیمّم کہا گیا ہے۔ تیمّم کا معنی بمقتضاء فتیمّوا صعیداً خاک کی طرف (قصداور) توجہ کرنا ہے۔ اور وہ خاک جمع مکنونات عینیہ وخارجیہ کی بناء ہے۔ اس سے مراد وحدت ذاتیہ اورصرف 'ہوٗ' ہے۔ پس موحد کے لئے کہ ظہور صفاتیہ کے اعتبار سے جمیع مکنونات میں اسے دیکھنا اور جاننا ضروری ہے کہ اس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی مشہود نہیں ہے۔ بلکہ وہی ہے جو اسماء وصفات کی صورت سے ظاہر ہے اور اس (مقام) کے سوا کوئی موجود حقیقی نہیں، جس کا مشاہدہ کیا جائے، بلکہ وہی ہے جو بصورت اسماء وصفات ظاہر ہے۔ بذات واجب ولازم اورصورت وپیکر سے منزّہ اور معرّا ہے۔

نوح عبارت ہے صاحب مشاہدہ کی ذات سے۔ فرض وقت ہے کہ دریائے ظہور کے عین مشاہدہ کے وقت خاک احدیت سے تیمّم کرکے پاک ہونا ہے، یعنی ذات احدیت کو جاننا۔ پس موحد تمام اوقات میں باہمہ یا بے ہمہ کی کشاکش سے آزاد ہوتا ہے، مگر جس وقت فنا کی موج آتی ہے اوج بقا کا تلاطم اسے اچک لیتا ہے اور موج سے باہر کردیتا ہے اور بقا کی بے خودی جو فناء الفناء کے طوفان سے اٹھتی ہے اس پر طاری ہوجاتی ہے۔

دوسرا مفہوم اصحاب شغل وارباب عمل کے مطابق یہ ہے کہ شہادت سے مراد شھدا ان لا الٰہ الاّ اللّٰہ ہے کیوں کہ جب طالب صادق، نفی واثبات کے کلمہ میں تکرار پر مداومت ظاہر کرتا ہے اور اس کے معانی پر غوروفکر کے ذریعے ماسوائے حق کے سب کو دیکھتا ہے اور بجانب اثبات ذات مطلق کی بقا دیکھتا ہے، تو کثرت سے انوار الٰہی کے مقصود کا ملاحظہ کرتا ہے، جیسا کہ طالب صادق اس مشہود میں شرف فنا سے مشرف فنا سے مشرف اور ذاکر واثق اس وجود میں عرف بہا سے معرف ہوتا ہے۔ اور نوح سے مراد یہی صاحب مشاہدہ ہے کہ جو دولت فناء الفناء تک پہنچاہے بمقتضائے فتیمّوا صعیداً اس وقت اس پر فرض ہے کہ فناء الفناء کے عین میں بقاء کی طرف رجوع کرے کہ خاک اسی سے عبارت ہے یا اس دولت سے جو اس نے پائی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مبادا وہ تجلّی اس کے لئے مستقل ہوجائے اور وہ مجذوب بن کر رہ جائے کہ اس کے ذریعے سالکان راہ کی تربیت نہ ہوسکے۔ کیوں کہ سالک جب تک راہ سلوک طے کرکے شرف جذبہ سے مشرف نہ ہو، دوسرے سالکوں کی رہنمائی نہیں کرسکتا اور بحر نزول سے ساحل شعور تک نہیں پہنچ سکتا، اور بغیر اس دریا کا غوطہ

کھائے ہوئے عین ثابتہ سے نکل کر واصل بحق نہیں ہوسکتا اور انّا جعلناک خلیفۃ کے بمصداق تخت خلافت پر متمکن نہیں ہوسکتا، سے ارباب طلب کی ہدایت میسر نہیں آسکتی۔'' (مکتوبات نمبر ۲۳۔ مکتوبات اشرفی، حصہ اوّل،ص ۱۵۹ تا ۱۶۲، ترجمہ: حضرت مولانا عبدالستار صاحب)

۳۹ ویں مکتوب کا موضوع حضرت ابوسعید ابوالخیر کی رباعی کے معانی ومطالب پر مبنی ہے۔ یہ مکتوب صدر الدین کی جانب سے استفسار کے جواب میں رقم کیا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر کی ۸۰ سے زائد (بیش تر) رباعیاں کسی نہ کسی مسئلے کی عقدہ کشائی کا بدل ہیں۔ لوگوں نے آپ کی رباعیات کی برکت سے بہت ساری مصیبت اور پریشانی سے نجات حاصل کی ہیں۔ مخدوم اشرف کا ارشاد ہے کہ'' اس کا گوہر ہر شخص پر روشن نہیں ہوتا''یعنی آپ کی رباعی کی تفہیم وتعبیر اورتشریح ہر کس وناکس کے بس سے باہر ہے۔ جو ہری ہی اس کی قیمت ادا کرسکتا ہے۔ ذیل میں ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی رباعی اور اس کے مطالب پیش کیے جاتے ہیں:

حورا بنظارہ نگارم صف زد
رضوان زتعجب کف خود برکف زد
یک خال سیہ بر آں رخان مطرف زد
ابدال زبیم جنگ در مصحف زد

یہ رباعی ارتفاع علل وانقماع خلل کے لئے ہے، یعنی اس رباعی کی برکت سے بیمار صحت مند ہوتا ہے۔ جو کوئی کسی مصیبت یا پریشانی بشمول علالت میں مبتلا ہوتو یہ رباعی پڑھے، صحت یاب ہوگا اور اسے فیض حاصل ہوگا۔ ذیل میں مخدوم صاحب نے اس رباعی کے جو مطالب ومعانی کیے ہیں وہ نقل کیے جاتے ہیں:

حورا: اس سے مراد روحانیہ ملکیہ ہے۔

نگار: اس سے مراد روحانیہ انسانیہ ہے کہ روح انسانی وپیکر روحانی وصال یار کے ذوق میں زیبائے پرستہ کا نگار وعنائے پیوستہ کا شعار بن کر عروسانِ فلک وفرشتگان عرصۂ ملک کی صفوں میں صف بنائے کھڑی ہے۔

رضوان: اس سے مراد کشور بہشت کے معمار وحوران نیک سرشت لشکر کے

سردار ہیں۔ یہ سب روح انسانی کا مرتبۂ کمال دیکھ کر اور جسم انسانی کا حسن وجمال دیکھ کر نہایت حیرت وغایت سے دست اور سر کف پر کف مارتے ہیں۔

خال سیہ: اس سے مراد رُتبہ فقر محمدی ہے کہ روحانیہ انسانیہ محبوبیہ کے خال کے رخسار سے مستعمار ہے۔ لقوله علیه السّلام الفقر سواد الوجه الدّارینَ۔(ترجمہ :ان کے نبی کریم) صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق کہ فقر دارین میں چہرے کی سیاہی ہے، جب سالک صادق کے لئے راہ سلوک میں عدم سے درجہ نہایت کچھ شرائط کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی اور طالب واثق کے لئے درگاہ صعلوک میں نقد سے رتبہ غایت کچھ وسائط سے واصل نہیں ہوتا، تو اس وقت کمال درجہ کی موت اس کے حال کے تقاضا کے مطابق اسے اشارہ دیتی ہے، تاکہ وہ اپنے عین ثابتہ کے خورشید صفت زدہ سے اور صور علمیہ کے بحر جاوید مثال کے قطرہ سے پیوست ہوجائے۔ اور عیان موجودات میں سے ہر عین ،صورت ہائے ممکنات میں سے ہر صورت کل عین ثابتہ مصطفوی میں سے جزا ور جملہ صور علمیہ نبوی میں سے ریزہ ہوجائے۔ ہر گاہ کے طالب درویش کی آخری منزل اپنے عین ثابتہ تک رسائی ہے۔ کیوں کہ کل شئی یرجع الیٰ اصله(ہر شئے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) اس سے عبارت ہے۔ دست پیوند خالی کوچہ ہے کہ اس نے اپنے وصول روحانیہ کے رخسار پر رکھا ہے۔ اور نقطۂ مثال ہے کہ اس نے اپنے حصول کے عذار پر رکھا ہے۔

ابدال: اس سے مراد وہی روحانیہ ہے اور لفظ ابدال کا اطلاق اس کی حالت کی تبدیلی وتغیّر کی بنا پر ہے کہ رتبہ ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کو پہنچی یا باعتبار درجہ ابدالیہ کے لئے، کیوں کہ اس طائفہ (مخدوم اشرف) کے نزدیک یہ رتبہ بہترین مراتب اور خوب ترین مناصب میں سے ہے۔ اس کی روحانیہ کو ابدال کہا ہے۔

مصحف: اس سے مراد اس روحانیہ انسانیہ کا مرتبہ جامعیہ ودرجہ مثالیہ کا وصول ہے۔ تفرقہ کے خوف سے نکلی اور اپنی جمع وحدت سے موصوف ہوئی۔ اس حالیہ جمعیت کو مصحف کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر بشر جو اس کتاب کی آیت تلاوت کرتا ہو وہ اس راز سے ضرور واقف ہوگا۔

پس جو کوئی بیمار کے لیے اس رباعی کو پڑھے گا، تو اسے فرحت حاصل ہوگی۔ اور بے تابی

وپریشانی کے لئے جو کوئی پڑھے گا تو اسے ضرور مسرت حاصل ہوگی۔ اور یہ قاعدہ حکمائے سالفہ واطبائے بالیہ کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ بیمار کے لئے مسرت و فرحت موجب صحت ہے۔ لقوله عليه السّلام "لقاء الخليل شفاء الخليل۔" ترجمہ:ان کے (نبی کریم) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق دوست کی ملاقات دوست کے لئے شفاء ہے۔''[۱]

مکتوب نمبر ۳۱ شرف الدین پانی پتی رحمۃ اللہ کے معانی بیت (شعر) سے متعلق ہے۔ اس مکتوب میں بھی حضرت کے دوسرے مکتوب کی طرح شعر کے مطلب کی وسعت اور گہرائی دیکھنے کو ملتی ہے کہ کس طرح آپ نے بیت کی تشریح وتعبیر کی ہے:

چند انکہ از روئے تو در سینہ جائی کرد
واللہ کہ آرزوئے خدا ایم محقر است

(ترجمہ: جس قدر تونے اپنی آرزو کو سینہ میں رکھا ہے واللہ کہ میرے خدا کی آرزو محقر ہے)

ہر چند کہ آں حضرت مرتبہ واحدیت میں اپنے اندر کمالات اسماء وصفات، اجمال وتفصیل میں ظہور علمی رکھتے ہیں،اگرچہ وہ درگاہ اسمائے الٰہیہ میں اور اپنے درجات کہنے میں وجوب وامکان کو پہنچاہے،لیکن یہ کمال ظہور ارواح، مثال، اجسام واشباح میں سے ہر ایک انسان کامل کے مظہر کے خاصہ میں سے ہے۔ یہ اتّصال کہاں سے ہوگا کہ صدرو، اشباح وخیال واحتشام جمعیت برزخیہ کا خاصہ ہے۔ لكل مقام مّعلوم (ہر ایک کیلئے مقام معلوم ہے) سے اسی کی جانب اشارہ ہے۔''[۲]

سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے جملہ ۴۷ مکتوب جو اصحاب کو تحریر کیے گئے انہیں دریائے معرفت کا در نایاب تصوّر کیا جاتا ہے اور درجات کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ مکتوبات اشرفی کے جامع اوّل حضرت اشرف کے خلیفہ اور مرید خاص حضرت شیخ نظام الدین یمنی ہیں اور جامع ثانی حضرت کے جانشین اوّل مخدوم الآفاق سید عبد الرزاق نو رالعین ہیں۔ مکتوبات کا مخطوطہ آج بھی کچھوچھہ شریف کے سجادہ نشین اور بسکھاری شریف کے سجادگان کی ملکیت میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے مخطوطہ کلکشن میں بھی محفوظ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام مخطوطوں کا تقابلی جائزہ لے کر اس کی تصحیح وتدوین کر لی جائے اور صحیح متن کے ساتھ مع ترجمہ وحواشی کے شائع کیا جائے، تا کہ مخدوم اشرف

کے مخفی اسرار ورموز تک عوام وخواص کی رسائی ممکن ہوسکے۔

مکتوبات اشرفی کی اہمیت کا راز یہ بھی ہے کہ ان خطوط کے ذریعے آپ نے اکابر صوفیائے کرام کی تعلیمات کو عام کیااور ساتھ ہی آپ نے اپنے ہم عصر سلطان الوقت اور مشائخ عظام اور مقرّبین ؒ الٰہی کے مسائل کا تدارک فاصلاتی نظام تعلیم (Distance Education) کے ذریعہ کیا۔ آپ نے ان خطوط میں اپنے پیش رو اولیائے کرام مثلاً خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ قطب الدّین بختیارکا کی، بالخصوص خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ شرف الدّین احمد یحیٰ منیری کے اسلوب کو اپنایا اور ان کے طرز اظہار وبیان کومنبع تسلیم کیا، جس میں قیمتی گوہر تزئین کیے۔ قرآنی متشابہات اور متصوّفانہ متشابہات و اشعار کا کثرت سے استعمال کیا۔ ہوشنگ خان کے نام مکتوب میں مخدوم اشرف نے انہیں سلطنت کے امور سے متعلق چند مفید مشورے دیے۔ نقل کیا جاتا ہے۔

''اے بھائی دولت خلافت، خلافت ہائے معنوی میں سے ایک صورت ہے کیوں کہ اس کی خلعت غوث روزگار کے قدم زیبا پر ہے۔ اور شوکتِ سلطنت منزلت کی دس نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، کیوں کہ اس کا علم قطب ادوار کے قدم پر ہے۔ پس اس دولت کو نعیم سنی (عمدہ) میں سے ایک نعمت اور اس شوکت کو ولیم ہنی (نفیس) میں سے ایک وسیلہ شمار کرنا چاہئے۔ کیوں کہ ہر سر اس میں نہیں ہے۔ اور قبا ہر ایک پر نہیں ہے۔

امیر جو کہ پیشوائے قوم ولشکر ہوتا ہے، اسے چاہئے کہ لذّات وشہوات سے اپنے آپ کو بچائے۔ اور حتیٰ الامکان شعار اسلام کی پابندی کرے۔ خاص طور پر شراب نوشی سے پرہیز کرے، کیوں کہ اس سے عقل زائل ہوجاتی ہے۔ اور رائے ثاقب اور فکر صائب کے سوا اپنے آپ کو ظاہر نہ کرے۔ کسالت وسستی جو کہ شراب کا نتیجہ ہے، ظاہر نہ کرے۔ ہر معاملات میں نہایت ہی چاق وچوبند رہے۔''

تمام مہمات ومصالح میں سرکردہ گروہ سے مشاورت ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ''وشاورھم فی الامر'' اور معاملات میں باہم مشورہ کریں''۔ جب کسی کام پر باہم اتحاد واتفاق ہوجائے، تب اسے نافذ کرنا چاہئے۔

امت کی تعلیم کے واسطے انبیاء کرام نے مشورہ کیا ہے۔ تفہیم زمرہ کے لئے اصفیائے

کرام رحمۃ اللہ علیہ اجمعین نے رائے طلب کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے استصواب رائے مستحب ہے اور اس کے ذریعہ کام بہتر ہوتا ہے، کیوں کہ انسانی عقول متفاوت ہیں۔ افکار بشری متجاوز الادراک ہیں اور فہم خلق ایک دوسرے کے مغائر ہے۔ اس لیے اس میں سوچنے کا موقع مل جاتا ہے۔[۳]

۳۲ واں مکتوب سادات ہند کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ آپ نے اس خط میں برصغیر (ہندوپاک) کے تمام سادات کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ تقریباً ۳۰ سے زائد مقامات کے سادات اور اس کے علاوہ دیگر سادات کرام جو مختلف جگہوں پر بسے ہوئے ہیں، ان سب کے حسب ونسب پر مخدوم صاحب نے کلام کیا ہے اور ان سب کا آئینہ پیش کیا ہے۔ مکتوب ہذا کے حوالے سے ذیل میں کچھ سادات کا ذکر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ازآں جملہ سادات سامانیہ جو کہ مشہور النسب ہیں۔ یہ سب سلطان محمد توختہ کی اولاد سے ہیں۔

'' ازانجملہ سادات گیسودراز کہ ان کا سلسلہ حضرت محمد گیسودراز سے ملتا ہے اور لقب گیسودراز کا ہند سے نہیں، بلکہ ولایت سادات سے آیا ہے۔'' غایت عالی شان کہ تصنیفات راتبہ وتالیفات لائقہ اخبر التصانیف حضرت میر کی ہے۔ جس میں انہوں نے وحدت وجود مطلق میں کچھ اشارہ حضرت فصوص الحکم (ابن عربی) کی نسبت کیا ہے۔ فقیر نے اس میں کچھ تغیرّ مزاج بھی کیا ہے۔ اور کچھ دلائل عقلیہ ونقلیہ جوان میں نہیں تھے، حضرت میر تیمور کے سامنے ظاہر کیا۔ ان کے سیر میں اصلاح کیا ہے۔ اول سیر کہ بجانب حضرت میر ہے، اور سیر ثانی حضرت شاہ ید اللہ شاہ صفی اللہ کی زیارت سے مشرف ہونا ہے۔

از انجملہ سادات نوہتہ جو مشاہیر روزگار ومعارف ہر دیار میں سے ہیں۔ کشف وکرامات میں سلاطین وخواتین کے زندیک مقبول الطوائف ہیں۔

طبقہ دیگر سادات حسینان امام حسن مثنّٰی کی اولاد ہیں، فرزند اعز الآفاق سید عبد الرزاق (نور العین) مدعمرہٗ انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔[۴]

حاصل کلام یہ ہے کہ مکتوبات اشرفی میں کل ۷۴ مکتوب ہیں۔ علاوہ ازیں خاتمہ، تتمہ اور

تکملہ بھی ہے۔ ابتدامیں مقدمہ بھی مشمول ہے۔ میر سیداشرف جہاں گیر سمنانی کے خطوط کی اہمیت ومعنویت کا اندازہ سلطنت عہد کے ان جلیل القدر مشائخ ،صوفیاء علماء ، بادشاہ اور امرائے وقت کے ناموں سے لگایاجاسکتا ہے، کہ جن کے استفسار کے جواب میں یہ خطوط ارسال کیے گئے ہیں۔شعراء کے اشعار کی رمزیت ایمائیت اورتعبیر وتشریح کا معاملہ ہو کہ علوم ظاہر وباطن ،منقول اورمعقول کے دقیق مسائل کی عقدہ کشائی، بادشاہ وقت کی مہم جوئی اور عدل وانصاف کا واقعہ ہو کہ فتح ونصرت اور سلطنت کے فروغ کا مسئلہ ، ان سب پر مخدوم اشرف نے خامہ فرسائی کی ہے، اور ان سب اکابر روزگار کی رہبری ورہنمائی کی ہے۔ فاصلاتی تعلیم کوعام کرنے اور رواج دینے میں یہ خطوط میل کے پتھر ثابت ہوئے۔

بلاشبہ مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ایک عبقری شخصیت بن کر نمودار ہوئے اور اپنے علم وعمل وکردار ، خدمت خلق اورخلق کی حاجت روائی کے سبب مخدوم العالم ، غوث العالم اورمحبوب یزدانی کے مرتبے پر پہنچے ۔آپ نے تصوّف اسلامی اور سلسلۂ مشخیت چشتیہ کا احیاء کیا اور ایک نیا سلسلۂ اشرفیہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی تعلیمات وہدایات کومستحکم اور عام کرنے کے لئے درگاہ رسول پور، کچھوچھہ شریف، کو مرکز رشدو ہدایت عطا کیا۔ آپ کا آستانہ آج بھی حاجت مندوں کے لئے باعث رحمت وبرکت ہے:

لیک انار باغ سمناں را
لذّت دیگر است از ہر جای

حوالے:

۱۔مکتوبات اشرفی :ترجمہ شاہ محمد ممتاز اشرفی ،ص ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲
۲۔مکتوب نمبر ۳۱،ص ۳۲۳۔ ۳۲۴، ترجمہ: ممتاز اشرفی
۳۔سورہ آل عمران،آیت ۱۵۹
۴۔بحوالہ مکتوبات اشرفی ، بنام ہوشنگ خان ،ص ۲۹۴۔۲۹۵
۵۔مکتوبات اشرفی ،مکتوب ۲۳،ص ۳۳۶

توحید، نظریۂ صحو اور معرفتِ الٰہی
حضرت جنیدؒ کے صوفیانہ نظامِ فکر کے حوالے سے

ضیاء الحسن فاروقی

بغداد کے صوفیہ کا خاص موضوع فکر و بحث ''توحید'' تھا اور وہ عام طور پر اپنے معاصرین میں ''اربابِ توحید'' کے نام سے مشہور تھے۔ ایک صوفی کے مذہبی تجربے میں یہ احساس بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان ایک عظیم فاصلہ ہے یہ احساس اس کے شعور و ادراک پر چھایا رہتا ہے۔ صوفیہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس فاصلے کو عبور کر جائیں۔ درحقیقت اسی کا نام تصوف ہے۔ فکر، ریاضت اور زندگی کے طریقوں اور اظہارِ بیان میں صوفیہ کے مابین اختلاف ہوسکتا ہے اور ہوتا رہا ہے، لیکن سب کا مقصود ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انہیں قربِ الٰہی حاصل ہوجائے، یعنی وہ فاصلہ کم سے کم ہوجائے جو خدا اور بندے کے درمیان حائل ہے۔ حضرت جنیدؒ نے تصوف کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ انسان خدا کے ساتھ اس طرح رہے کہ اس کا پھر کسی دوسری ہستی سے کوئی تعلق باقی نہ رہے۔''[۱] اور یہ کہ'' تصوف ایک سعیٔ مسلسل ہے، جس میں انسان ہمیشہ مشغول رہتا ہے''۔ پوچھا گیا کہ یہ حق کی صفت ہے، یا خلق کی؟ حضرت جنیدؒ نے جواب دیا کہ'' اصل کے اعتبار سے تو یہ حق کی صفت ہے لیکن حالتِ انعکاس میں یہ خلق کی صفت بن جاتی ہے یعنی انسان کی تمام صفات دراصل عکسی صفات ہیں۔'' ہجویری نے اس بات کی وضاحت یوں کی ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ توحید کی حالت میں انسانی صفات باقی نہیں رہتیں، کیونکہ انہیں بقا نہیں ، وہ محض عکس ہیں۔[۲]

تصوف کے بارے میں حضرت جنیدؒ کے ان اقوال سے کس قدر ان کے نظریۂ توحید کی وضاحت ہوتی ہے۔ رسالہ قشیریہ میں توحید سے متعلق حضرت جنیدؒ کے مندرجہ ذیل اقوال درج ہیں: [۳]

۱- موحد کا خدا کی وحدانیت کی تحقیق اور کمال احدیت کی وجہ سے اسے یکتا سمجھنا توحید ہے، بایں معنٰی کہ وہ ایسا ''واحد'' ہے جس نے نہ کسی کو جنا اور نہ اسے کسی نے جنا، نہ اس کی کوئی ضد ہے، نہ کوئی مثال، نہ اشارہ۔ وہ تشبیہ، کیفیت اور تصویر وتمثیل سے منزہ ہے۔ کوئی چیز اس جیسی نہیں وہ سمیع وبصیر ہے۔

۲- جب اہلِ عقل کی عقلیں توحید سے متعلق انتہا کو پہنچ جائیں، تو ان کی انتہا حیرت پر ہوتی ہے۔

۳- توحید عارف باللہ کے دل کی کیفیت ہے جس میں تمام آثار مٹ جاتے ہیں اور اس میں لا تعداد معلومات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ ازل سے ہے۔

کسی نے حضرت جنید سے توحید خاص کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

۴- توحید خاص یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے سامنے ایک جسمِ مردہ کی طرح ہو۔ اللہ تعالیٰ کے احکام ، قدرت اور تدبیروں کا تصرف اس میں جاری ہو۔ اس کا سبب یہ ہو کہ وہ اپنے نفس سے فنا ہو چکا ہو، نہ اسے یہ خبر ہو کہ مخلوق اسے پکار رہی ہے اور نہ اس کی دعوت کے قبول کرنے کا خیال پیدا ہو۔ یہ فنائے نفس اس لیے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی قرب میں ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اسکی وحدانیت کی حقیقت کا اسے علم ہوجائے۔ اور فنائے نفس یہ ہے کہ اس کی تمام حس وحرکت ختم ہوچکی ہو، تاکہ حق تعالیٰ ان تمام امور میں جن کا وہ اس بندے سے طالب ہے، خود ہی اس کا ضامن اور کفیل ہو، بایں طور کہ بندے کی انتہا لوٹ کر ابتدا کی طرف آجائے اور وہ ایسا ہوجائے جیسا کہ وہ وجود میں آنے سے پہلے تھا۔

رسائل جنیدؒ میں توحید کے موضوع پر کچھ ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو روایتی مذہب سے میل نہیں کھاتیں، اور وہ ہیں بھی پیچیدہ۔ غالبًا یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ایسے خیالات کو برملا بیان نہیں کرتے تھے۔ بہت کیا تو انہوں نے اپنے مخصوص حلقے میں انہیں بیان کردیا یا پھر اپنے کسی معتمد معاصر کو خط کی صورت میں لکھا۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ جس مقام کا انہوں نے تجربہ کیا تھا، اس کے احوال اگر عام ہوجائیں تو کیسے کیسے خطرات اس میں ہوں گے:

اپنے ایک رسالے میں حضرت جنیدؒ لکھتے ہیں:

''جان لو کہ توحید لوگوں کے اندر چار درجوں میں پائی جاتی ہے۔ پہلا درجہ تو عوام الناس کی توحید کا ہے۔ دوسرے درجے میں وہ توحید آتی ہے جو ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو دین کے روایتی علم سے بہرہ ور ہیں۔ تیسرے اور چوتھے درجے کی توحید کا تجربہ ان خواص کو ہوتا ہے جنہیں ''معرفت'' حاصل ہوتی ہے۔

''جہاں تک ایک عام آدمی کی توحید کا تعلق ہے، اس کا اظہار خدا کو واحد ولا شریک قرار دینے

نیز بہت سے خداؤں، ساتھیوں، حریفوں، ہمسروں اور شبیہوں کا ابطال کرنے میں ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ''غیر خدا'' طاقتوں سے امید وخوف بھی وابستہ رکھے جاتے ہیں۔ اس طرح کی توحید اپنے اندر ضرور ایک فائدہ اور اثر رکھتی ہے کہ اس میں اقرار واحقاق بہرصورت قائم رہتا ہے۔

''رہی ان لوگوں کی توحید جو علمِ ظاہر (باضابطہ مذہبی علم) سے بہرہ ور ہیں تو اس کا اظہار خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار، نیز دوسرے خداؤں، شریکوں، حریفوں، ہمسروں اور مشابہتوں کے ردوابطال سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ جہاں ظاہری اعمال کا تعلق ہے ان میں ایجابی احکام کی بجا آوری کی جاتی ہے اور منہیٰ امور سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہوتا ہے اس طبقے کی امیدوں، خواہشوں اور اندیشوں کا۔ اس نوع کی توحید میں بھی ایک حد تک افادیت ضرور ہے، اس لیے کہ اس طرح خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا علی الاعلان ثبوت مہیا کیا جاتا ہے''۔

''اس کے بعد توحید خاص کا درجہ ہے اور اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے اور ارباب و انداد اور اشباہ و اشکال کو نظر اور مشاہدے سے ساقط کر دیا جائے اور خدا کے حکم کو ظاہر و باطن دونوں میں نافذ کیا جائے اور خدا کے ماسوا دوسری ہستیوں سے امید وخوف کے جذبات کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے، اور یہ سب کچھ نتیجہ ہو انسان کے اس تصور کا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ، ہر آن، اس کے ساتھ موجود ہے، نیز یہ کہ حق تعالیٰ اسے پکارتا ہے اور وہ اس کا جواب دیتا ہے''۔

''توحید خاص کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کے احساس سے یکسر عاری ہوکر ایک خیالی وجود (شبح) کی صورت میں حق تعالیٰ کے سامنے اس طرح حاضر ہو کہ ان دونوں کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہ ہو۔ پھر جس جس طرح اس ذات مطلق کی قدرت کا ملہ طے کرتی ہے، اس کی تدابیر اس خیالی وجود پر مختلف صورتوں میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسے توحید ذاتِ حق کے بحرِ زخار میں پوری طرح غرق کردیا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ خیالی وجود اپنی ذات میں بالکل فنا ہوجاتا ہے۔ پھر نہ حق تعالیٰ کی ندا کا سوال باقی رہتا ہے اور نہ اس کی طرف سے قرب اس کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس حالت میں انسان کے اندر حس اور حرکت ختم ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ جو چیز حق تعالیٰ نے اس سے طلب کی تھی، وہ اس نے خود ہی اسے مہیّا کردی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس آخری درجے میں پہنچ کر ایک سالک اپنی اس پہلی حالت میں آجاتا ہے جہاں وہ اس دنیا میں

آنے سے پیشتر تھا اوراس پر خدا تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے :

و اذ اخذ ربّک من بنی اٰدم من ظھورھم ذرّیّتھم و اشھدھم علیٰ انفسھم ،الست بربّکم ، قالو بلیٰ ... (الاعراف: ۱۷۲)

(اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنا لیا ۔(اور ان سے پوچھا):کیا میں تمہارا پروردگا رنہیں ہوں ؟سب نے کہا:''ہاں'')۔

پس یہاں کون موجود تھا، اور اپنا وجود رکھنے سے پہلے وہ کس طرح موجود تھا ۔کیا حق تعالیٰ کے استفسار کا جواب کسی شخص نے دیا تھا ،سوائے ان پاک و صاف ، لطیف اور مقدس روحوں کے جنہیں خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور مشئیت تامہ نے سامنے لا کھڑا کیا تھا ۔

''ہاں وہ ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں وہ آفرنیش سے پہلے تھا اور یہ ایک موحد کی حقیقت توحید کی آخری منزل ہے، جس میں وہ انفرادیت گم کر دیتا ہے'' ۔[۴]

اسی طرح حضرت جنیدؒ نے اپنے دیگر رسائل میں بھی اپنے نظریۂ توحید کی وضاحت کی ہے۔ توحید ان کا محبوب موضوع تھا اور درحقیقت یہی اسلامی تصوف کا اصل محور ہے ۔حضرت جنیدؒ نے مذکورہ بالا سطروں میں توحید کے مسئلے کے سلسلے میں جو درجہ بندی کی ہے، وہ علمائے دینیات کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوسکتی کیونکہ ان کے خیال میں ایمان سب ہی قسم کے اہل ایمان میں یکساں ہوتا ہے۔لیکن صوفی لٹریچر میں ''مقامات'' کی جو بحث آئی ہے، اس کی ایک شق یہ بھی ہے کہ ہر اہل ایمان کا ایک خاص مقام ہوتا ہے اور شاید درجہ بندی سے حضرت جنیدؒ کی یہی مراد ہوگی ۔انہوں نے توحید کے سلسلے میں اہل ایمان کے مختلف مقامات کی جو نشاندہی کی ہے وہ ان کے نزدیک خیالی نہیں تھی، بلکہ وہ اس رمز سے واقف تھے کہ توحید پر ایمان کی مختلف کیفیات کا ایک مومن کی ذات پر اثر پڑتا ہے اور اس کے ہر عمل اور ہر حرکت میں اس اثر کو دیکھا جا سکتا ہے ۔

حضرت جنید نے جس'' مقام'' کو توحید کی آخری منزل قرار دیا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں ایک مومن کی اپنی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں اور اس کی رضا مکمل طور پر رضائے الٰہی کے تابع ہو جاتی ہے ، بلکہ اس سے بھی ایک بلند تر مقام ہے جہاں مومن کی رضا خود رضائے الٰہی بن جاتی ہے :

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

امام ہجویری نے بھی اس طرح کی بات کہی ہے، ان کے انتقال اور حضرت جنیدؒ کی وفات میں ڈیڑھ سو برس سے زیادہ کا وقفہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جنیدؒ کے خیالات اس وقت راسخ العقیدہ صوفی حلقوں میں مقبول ہو چکے تھے اور مستند سمجھے جاتے تھے۔ امام ہجویری کا قول ہے کہ ایک موحد کو اپنی ذات کا کوئی خیال باقی نہیں رہتا۔ اور وہ ذرہ بن کر رہ جاتا ہے جیسا کہ وہ ماضی ازل میں تھا اور جب کہ میثاق عہد کو اس نے دہرایا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ جب ایک موحد پر ذات حق کے اظہار کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ مکمل طور پر ''فنا'' کی حالت میں ہوتا ہے، اور ایک ایسا لطیف مادہ بن جاتا ہے جس میں خود کوئی احساس باقی نہیں رہتا، وہ ایک آلۂ منفعل بن کر رہ جاتا ہے، اس حالت میں اس کا جسم حق تعالیٰ کے اسرار کا مخزن ہوتا ہے اور اس کا ہر قول اور ہر فعل اسی ذات سے صادر و وارد سمجھا جاتا ہے۔

توحید کا یہ بلند ترین نظریہ حضرت جنیدؒ کے بقول ان کے نظریۂ میثاق اور نظریۂ فنا پر جو ان کے صوفیانہ نظام فکر کے اہم عنصر ہیں، قائم ہیں۔ اپنے دو رسائل کتاب الفناء اور کتاب المیثاق میں انہوں نے ان نظریوں کی بہت اچھی وضاحت کی ہے۔ حضرت جنیدؒ کے نظریۂ فنا کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک موحد توحید کے اس بلند مقام پر پہنچنا چاہتا ہے، تو اسے اپنے انسانی وجود کو جس کی حیثیت محض ثانوی ہے، ختم کر دینا ہوگا تاکہ وہ وجود الٰہی میں مدغم ہوکر ایک الوہی وجود کا ادراک کر سکے۔ ''فنا کی اولین منزل یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات اور اپنے مزاج کی قید سے آزاد ہو جائے اور محنت و ریاضت کے ذریعے اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل کرلے، پھر دوسرا مقام یہ ہے کہ انسان حظِ نفس سے بھی رہائی حاصل کرے، یہاں تک کہ طاعات وعبادات کی لذت کا احساس بھی ختم ہوجائے اور وہ بلا کسی واسطے کے اللہ کا ہوکر رہ جائے، اس کے بعد تیسری اور آخری منزل یہ ہے کہ تجلیات ربانی کا اس انسان پر ایسا غلبہ ہوجائے کہ خود اس انسان کا وجود اور اسکی حقیقت ملیا میٹ ہوکر رہ جائے۔ اس منزل میں یہ انسان موحد وجود ابدی کے ساتھ متحد ہوجاتا ہے، اس لئے کہ وہ تو مٹ چکا ہوتا ہے۔ دیکھنے میں تو اس کی ظاہری شکل باقی رہتی ہے لیکن اس کا نام اور اس کی انفرادیت ختم ہو چکی ہوتی ہے''۔

حضرت جنیدؒ کا نظریۂ میثاق قرآن کریم کی آیۃ "**الست بربّکم، قالو بلیٰ**'' کی تفسیر ہے۔ ان سے جب کہا گیا کہ اس کی مزید وضاحت فرمائیں، تو جواب دیا کہ ''اس آیۃ میں خدائے عز وجل فرماتا ہے کہ اس نے بنی نوع انسان سے ایسی حالت میں خطاب کیا کہ وہ (اس کائنات میں) موجود

نہیں تھے ،صرف خدا کا وجود ان کے لئے موجود تھا ۔ اس وقت وہ مخلوق انسانی کو ایسے معنی میں وجود میں لے آیا کہ جس کی حقیقت سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا ، اور نہ کوئی دوسرا اس کا راز پا سکتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ ایسا خالق ہے، جو ہر طرف سے ان پر احاطہ کئے ہوئے ، انہیں ابتداً ایک ایسی حالتِ فنا میں دیکھ رہا تھا جو ان کی حالت بقاء سے ابھی بہت دور تھی، اور ان (یعنی بنی نوع انسان) کا وجود، وقت کی قید سے آزاد، ازل کے ساتھ وابستہ تھا۔ پس یہی وہ وجودِ ربانی اور وہ خدائی تصور ہے جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا دوسرے کو زیبا نہیں ۵؎۔ چنانچہ جب اس نے ان کو بلایا اور انہوں نے اس کی ندا پر فوراً لبیک کہا تو یہ بھی اس کی ذات کا کرم اور احسان تھا ۔ اس نے ان کو وجود میں لاکر گویا ان کی طرف سے خود ہی جواب دے دیا ، اپنی ندا اور پکار کا مدعا انہیں سمجھایا اور اپنے وجود سے انہیں اس وقت آگاہ کیا، جب کہ وہ محض ایک مشیت الٰہی تھے، جسے اس ذات نے ایک عارضی وجود کی شکل میں اپنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ پھر اس نے اپنے ارادے سے انہیں ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں منتقل کیا ۔ انہیں نطفے کی طرح کی چیز بنایا ۔ اپنی مشیت سے اسے خلق بخشا اور صلب آدم میں اتاردیا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واذ اخذ ......الست بربّکم ، (پس)وہ ان سے ایسی حالت میں ہمکلام ہوا، جب کہ اپنا کوئی وجود ہی نہ تھا سوائے اس ذات برحق کے وجود کے جو ان میں ہر طرف سے شامل تھا ۔ وہ ایسی حالت تھی کہ جس میں ان کا وجود اپنے آپ کے لئے نہیں حق تعالیٰ کے لئے اور اسی کے وجود میں محصور تھا ۔'' ۶؎

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس '' وجود ربانی '' (یعنی حق تعالی کی ذات کے اندر محصور وجود) کی تفصیلات ہمیں حضرت جنیدؒ نے نہیں بتائیں ہیں، اور شاید یہ ممکن بھی نہ تھا ، کیونکہ اس حقیقت کو صرف خدائے عز وجل ہی جانتا ہے ۔کوئی دوسرا اس راز کو پا نہیں سکتا ۔ توحید کا یہی بلند اور بے مثال مقام ہے جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی ۔ جب اس سے کمتر رہ جاتا ہے آن را کہ خبر شد خبرش باز نیامد، تو پھر اس بلند مقام تک بھلا کون پہنچ سکتا ہے ؟

بہر حال وجود انسانی سے متعلق حضرت جنیدؒ کے خیالات سے یہ پتہ لگتا ہے کہ ان کے نزدیک انسان کا ایک وجود تو اصل او ر ربانی ہے اور دوسرا ثانوی اور غیر حقیقی ۔ اس ثانوی وجود کی فطرت میں یہ آرزو ودیعت کردی گئی ہے کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جانے کے لئے بے تاب ہے ۔ ایک سچے صوفی ، زاہد اور عبادت گزار کی یہ تمنا کہ وہ اپنے دنیوی اور غیر حقیقی وجود کو خیر باد کہہ کر اپنی ابتدائی

حالت کی طرف لوٹ جائے ، تصوف کی روح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ایسے خاص اور عبادت گزار بندوں کا حال ہمیں معلوم ہے، جو اپنی انفرادیت کھو کر توحید حقیقی کے اسرار کی لذت سے بہرہ یاب تھے۔لیکن یہ وہ چیز نہیں کہ بندہ محض اپنی کوشش سے حاصل کرلے ۔ یہ چیز خدا کی نصرت و تائید ہی سے حاصل ہوسکتی ہے ۔ یہ گویا انعام ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے خاص اور برگزیدہ بندوں پر۔ اس سلسلے میں حضرت جنیدؒ نے اپنے رسالے، کتاب الفناء، میں ایک حدیث قدسی سے استدلال کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ کیا رسول اللہؐ سے مروی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ''میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں ۔ پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ......۔ے''

نظریہ صحو (بحالی ہوش)

حضرت جنیدؒ کے نزدیک توحید خاص کے روحانی تجربہٗ کا ذکر جو اوپر کیا گیا ہے، وہیں ختم نہیں ہوجاتا، جہاں انسان ایک بیکراں حیرت اور سکر و مستی کی بسیط فضا میں محو ہوکر رہ جائے ۔ان کی تحقیق یہ ہے کہ توحید خاص کی مکمل ترین صورت یہ ہے کہ موحد عالم سرشاری و مدہوشی سے نکل کر صحو (بحالی ہوش) کی فضائے حقیقت میں آجائے۔ حضرت جنیدؒ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ جب ایک موحد اپنی انفرادیت گم کرکے توحید خاص کے مقام ارفع تک پہنچ جاتا ہے اور وہ ذات الٰہی میں رہنے لگتا ہے ، اور وہ اس طرح اپنے مالک ارفع تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا ہے اور نہ کوئی مقصد ، یہاں تک کہ خیر و شر کا امتیاز بھی وہ نہیں کرسکتا کہ یہ امتیاز اس منزل میں اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا، تو پھر اس کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرتی احکام وقوانین اور مذہبی فرائض و واجبات کا مکلّف اپنے آپ کو نہ سمجھے، یعنی وہ یہ کہنے لگے کہ معروف ومنکر کی پابندیاں صرف عوام الناس کے فائدہ کے لئے ہیں ، ان نفوس عالیہ کے لئے، جو خالق کائنات کے ساتھ حالت اتحاد میں رہتے ہیں ، ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

بعض صوفیاء کے یہاں ہمیں یہ منفی رویہ ملتا ہے ، اور بات دیکھنے میں آئی ہے کہ مذہبی احکام اور معاشرتی رسم ورواج سے کامل بےتعلقی صوفی کو ایک خاص قسم کی رندی اور آزاد روی کی طرف لے گئی

ہے۔تصوف کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں ۔ رسالہ قشیر یہ میں حضرت جنیدؒ کی بابت یہ روایت ملتی ہے کہ ایک شخص نے، جو معرفت کا ذکر رہا تھا ، یہ کہا کہ اہل معرفت ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ پھر نیکی اور تقرب الی اللہ کے لئے حرکت کرنا بند کردیتے ہیں ۔حضرت جنیدؒ نے سنا تو کہا کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اعمال کے ساقط ہوجانے کے قائل ہیں اور میرے نزدیک یہ ایک بڑا بھاری گناہ ہے ۔ ایسا خیال رکھنے والے سے وہ شخص بہتر ہے جو چوری بھی کرتا ہو اور زنا بھی ، کیونکہ عارفین باللہ نے اعمال کا حکم اللہ سے لیا ہے اور اعمال میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ اور اگر میں ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں، تب بھی میں کبھی نہ چاہوں گا کہ میرے اعمال خیر میں ذرہ بھر بھی کمی پائی جائے ۔حضرت جنیدؒ کے اس قول میں ہمیں ان کے نظریۂ صحو کا سراغ ملتاہے، جو توحید کے ساتھ مل کر ان کے تصوف کی بنیاد بن جاتا ہے ۔ امام ہجویری نے کشف المحجوب میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ ''حضرت جنیدؒ کا طریقہ صحو پر مبنی تھا، اگر چہ اس معاملہ میں اخلاقی باتیں بھی ملتی ہیں۔''۹

بظاہر ایسا لگتاہے کہ ایک موحد کی آرزو اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ ''مقام فنا'' پر پہنچ جائے ،لیکن مستند اسلامی تصوف کے سامنے پیغمبر اسلامؐ کا اسوۂ حسنہ ہوتاہے اوراس کی رو سے روحانی ارتقاء کا آخری مقام اور انتہائی منزل ''مقام فنا''نہیں ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ اس ''مقام'' پر پہنچ کر پھر اس دنیا میں واپس آجائے اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کرے ، ان کے دکھ درد میں شریک ہو اور ان کے درمیان رہ کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے ۔حضرت جنیدؒ کا نقطہ نظر یہی تھا جیسا کہ ان کی ایک تحریر سے پتہ چلتاہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''......حق تعالیٰ کا اس (انسان کے بارے میں جو اس کے ساتھ متحد ہو کر فنا ہو جاتا ہے) کے وجود کے بارے میں ایک منشا ہوتاہے، جسے وہ واپس عام انسانوں میں پہنچ کر پورا کرتاہے ۔ چنانچہ وہ اسے عام لوگوں کی طرف اس حال میں واپس بھیجتا ہے کہ اس پر اس کی نعمتیں عیاں رہتی ہیں ۔ اسی کے ساتھ اس پر حق تعالیٰ کا مزید عطا واکرام یہ ہوتاہے کہ اس کی انفرادی صفات اسے واپس مل جاتی ہیں، تاکہ وہ ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے''۱۰۔گویا ایسا انسان خلق خدا کے لئے ایک نمونہ ہوتاہے اور اس کا عمل اہل دنیا کے لئے لائق اتباع۔ یہ صورت وہ ہے جب کہ ایک سچا صوفی عالم مدہوشی (سکر) کے خطرات سے نکل کر ہوش (صحو) کی حالت میں واپس آتاہے۔لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا

چاہیے کہ اپنی اس نئی حالت میں وہ اپنے روحانی تجربہ کی کیفیات سے محروم ہوتا ہے یا اس کا تعلق تقرب الی اللہ کے اس عالم سے جہاں وہ اپنی ریاضت ومجاہدہ سے پہنچا تھا، منقطع ہو جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ اپنے تجربے کو اپنی نئی حالت کے اندر ایک مخفی خزانے کی طرح دبائے رکھتا ہے اور اس کے گفتار و اعمال میں اسی خزانے سے ایک نور لطافت اور پاکیزگی عیاں رہتی ہے، اور معرفت کی جلوہ سامانیاں اس کا احاطہ کئے رہتی ہیں جس کی وجہ سے خلق کا رجوع اس کی طرف ہوتا ہے۔ اپنی اس نئی حالت میں وہ بہ یک وقت ''حالت فنا'' میں بھی رہتا ہے اور حالتِ ہوش میں بھی۔ غیاب وحضور کی یہ پر کیف حالت اللہ کے خاص بندوں پر اس کا انعام ہوتا ہے۔ ایسی ہی پاک روحیں معاشرے کا نمک ہوتی ہیں، انہیں سے زندگی میں حسن ومعنی پیدا ہوتے ہیں، انہیں کے دم قدم سے معاشرے میں اخلاقی و روحانی اقدار کا بھرم قائم رہتا ہے اور دنیا میں رہ کر بنی نوع انسان کی اخلاقی اصلاح کا اہم فریضہ انجام دیتی ہیں۔ 'جمع' اور 'تفرقہ' تصوف کی مشہور اصطلاحیں ہیں، یعنی ایک ہی وقت میں حاضر بھی ہونا اور غیر حاضر بھی۔

اس کیفیت کو حضرت جنیدؒ نے ان اشعار میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

فتحققتک فی سری فنا جاک لسانی
فا جتمعنا لمعان و افترقنا لمعانی
ان یکن غیبک التعظیم عن لحظ عیانی
فلقد صبرک الوجد من الأخشاء دانی [۱۱]

(تو جو کہ میرے باطن میں تھا، میں نے تجھے پالیا اور میری زبان تجھ سے سو پردوں میں بھی ہمکلام ہوئی۔ ہم دونوں ایک لحاظ سے متحد بھی ہیں اور ایک دوسرے لحاظ سے جدا بھی۔ اور اگر چہ رعب و ہیبت نے تجھے میری ان نظروں سے چھپا رکھا ہے۔ لیکن وجد و سرمستی نے تجھے میرے سب سے قریب تر کر دیا ہے)۔

ایک موحد عارف کی یہ کیفیت جسے ایک شاعر نے ''دم بدم بامن و ہرلحظہ گریزان از من'' کی حالت سے تعبیر کیا ہے اور جس میں 'وصل' کی لذت اور 'فراق' کے الم کا بہ یک وقت تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی روح پر ایک بڑا بوجھ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک سچے موحد و عارف باللہ کی روح ہمہ وقت بے چین، افسردہ اور غمگین رہتی ہے، یہاں تک کہ اس کے تبسم میں بھی ایک حزن ہوتا ہے۔

اپنے رسالے 'کتاب الفناءٔ میں جو سوال و جواب کی شکل میں ہے ، ایک سوال کے جواب میں کہ یہ کیسے ممکن رہے' حضرت جنیدؒ نے اپنے روحانی تجربے کی مختلف کیفیتوں کی طرف اشارے کئے ہیں ، یہ بتاتے ہوئے کہ اللہ کے مقرب وممتاز بندوں کے لئے حضور و مشاہدے کی لذت ایک مشقت ہے جسے نفوس انسانی محسوس نہیں کر سکتے ۔ وہ کہتے ہیں :

جب اللہ تعالیٰ (ایسے بندوں کی)ارواح کو (حالت فنا سے)واپس اپنی انفرادی حالت میں بھیج دیتاہے، اور ہر روح کو اپنی نوع میں واپس لوٹا دیتاہے ، تو وہ اپنی پہلی حالت کو ایک ظاہری پردے کے پیچھے چھپائے رکھتی ہے ۔ اس نئی حالت میں وہ بے چینی و بےحسی محسوس کرتی ہے ......کیونکہ وہ پہلے کی انتہائی کمال و رفعت کی حالت سے محروم ہوگئی ہے ۔ اورتعلم وتعقل کی پابندیوں میں جکڑ دی گئی ہے۔ یہ موجودہ شعور و دنیوی حقیقت کی زندگی اس کے لئے بے پناہ حسرت و اندوہ کی حالت ہوتی ہے ۔ پہلی حالت کی رفعت و بلندی سے محرومی کا غم اس کے ساتھ برابر لگا رہتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ پیہم ایک آرزو ، ایک تمنا ، کی حالت میں رہتی ہے ......ایک بار جب وہ غالب ہونے اور ذات الٰہی سے اتحاد کی روحانی برکتوں سے لذت آشنا ہو چکی ہے تو پھر وہ اس کیفیت کی آرزو کیوں نہ کرے ؟ یہی وجہ ہے کہ عارفین کی روحیں شاداب مقامات ،حسین مناظر اور سرسبز باغات کی تلاش میں رہتی ہیں ۔ دوسری اور چیزیں ان کے لئے ایک عذاب ہوتی ہیں جس کے اندر رہ کر وہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جانے کی ہمہ وقت آرزو مند رہتی ہیں ...... اس حالت کواب میں تمہیں کیسے بتاؤں جسے ذات خدا وندی نے (اس حدیث قدسی میںقال الله عز وجل : لا يزال عبدی يتقرب الیّ بالنوافل حتی أحبه......الی الخ)

جس صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ، وہ ایک ایسا اشارہ اورنکتہ ہے کہ اس کے علم میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ...... پس اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو بھی اس صفت سے نوازا ، یا جو بھی اس کے ذکر میں محو ہوا ، یا اس کے ساتھ مخصوص ہوگیا، تو پھر اس کے بارے میں یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ انسانی تصورات ہی اس کے سامنے ہوتے ہیں یا اس کے جملہ محرکات عِمل انسانی ارادوں سے پیدا ہوتے ہیں ۔ دراصل اس کی یہ صفت اس ذات کی حقیقت کی وجہ سے فنا سے محفوظ رہتی ہے اور اس کی پیش گاہ میں اس ذات کے غلبے کی وجہ سے، جو اس پر چھائی ہوئی ہے اور جس نے اسے سہارا دے رکھا ہے ، اس کی اپنی انسانی خصوصیات جاتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ اس ذات کے مواجہ

میں آتا ہے تو اس کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ایک حالت حجاب کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کیفیت شہود میں تمام آثار محو ہوکر رہ جاتے ہیں ......اس حالت میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ ذات اپنی صفات علیا اور اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے۔ یہیں سے ابتلاء و آزمائش کے اس طریقے کا آغاز ہوتا ہے جو اہل ابتلاء کے لئے جاری ہوا ہے ۔ یہ لوگ جب مسلسل کش مکش میں رہتے ہوئے ثابت قدمی دکھاتے ہیں اور کسی دھوکہ میں نہیں آتے ، تو ان پر ایک ایسی کیفیت طاری کر دی جاتی ہے، جو انہیں قوت ،علوئے مرتبت اور تقرب و تعلق کی اسی حالت میں 'فنا' عطا کرتی ہے ''۱۴

حضرت جنیدؒ کا یہ فرمانا کہ اس دنیا میں ایک عارف کی روح حسن و جمال کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے ، تو اسمیں اسلامی جمالیات کی ایک بولتی ہوئی حقیقت چھپی ہوئی ہے ، یہ حسن و جمال خواہ کہیں ہو ، آواز میں ہو ، مناظر فطرت میں ہو ، پہاڑوں پر ، ندیوں میں پتھر کے ٹکرانے والی موجوں کی پرشور روانی میں ہو ، خوش الحان طیور کی نغمہ سرائی میں ہو ، حسین مرغزاروں اور خوبصورت باغوں میں ہو ، صبح کی پہلی کرن اور شام کی گلگوں شفق میں ہو ، غرض کہیں بھی ہو ، ایک عارف باللہ اور صوفی کے دامن دل کو ضرور کھینچے گا ، کیونکہ اس کے لئے ایک حسین منظر میں اس روحانی تجربے کی گونج ہے جو اسے اس نور السمٰوٰات والارض ، کے قرب میں حاصل ہوا تھا ، لیکن دنیا کے حسین مناظر اسے اس روحانی کرب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ نور ان مناظر کے حسن و جمال سے بہت دور ہے ۔ اس کی نہ مٹنے والی یاد اور اس عظیم روحانی تجربے کی لذت کی تمنا عارف کے دل میں ہوتی ہے۔ ہمہ وقت اسے اپنے محبوبِ حقیقی کی یاد دلاتی رہتی ہے اور وہ بے چین اور مضطرب رہتا ہے :

خرم آں لحظہ کہ مشتاق بیارے برسد
آرزو مندِ نگارے بہ نگارے برسد

ایک ایسے عارف کی یہ کیفیت اسے ساری دنیا سے بے نیاز بنا دیتی ہے ، وہ اپنے گرد و پیش سے بے پرواہوتا ہے ، وہ خلوت در انجمن اور انجمن در خلوت کے لطائف سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اسے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ وہ تنہا ہے یا کسی محفل میں ۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد ہوتا ہے۔ بیدل نے اسی کیفیت کو اپنے ان دو اشعار میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے :

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ ، در دل کشا بہ چمن در آ

پی نافہ ہای خجستہ بو ، مپند زحمت جستجو
بہ خیال ِ حلقۂ زلف او ، گرہی خورو بہ ختن در آ

اسیری اور رہائی کی اس حالت کو، جس میں حضور بھی ہے اور غیاب بھی ، جگر مرادآبادی نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے :

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا　　کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

اور اس حالت میں جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے ، صوفی ایک مستقل کش مکش میں مبتلا رہتا ہے،لیکن یہ کش مکش اور یہ اضطراب اتنا پرکیف ہوتا ہے کہ اسے نہ اپنی خبر ہوتی ہے اور نہ دوسرے کی۔ حضرت جنیدؒ نے حضور وغیاب کی اس حالت کو اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے۔ امام ہجویری کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت جنیدؒ نے فرمایا : ایک زمانہ مجھ پر ایسا گزرا ہے کہ میں ان کی 'حالت غیبت' پر روتا تھا اور اب صورت یہ ہے کہ نہ مجھے اپنی خبر ہے اور نہ ان کی۔ ۱۵؎

ایک صوفی عارف کے عالم مدہوشی (سکر) کے سلسلے میں حضرت جنیدؒ کا رویہ حضرت بایزید بسطامی کے رویئے سے مختلف ہے۔ حضرت بایزید سکر یعنی عالمِ مدہوشی پر زور دیتے تھے اور حضرت جنیدؒ صحو یعنی ہوش و بیداری کی حالت کو ضروری اور افضل سمجھتے تھے۔ حضرت ہجویریؒ نے جن کی کتاب کشف المحجوب حضرت جنیدؒ کے نظریہ تصوف کے سلسلے میں ایک اہم ماخذ ہے ،سکر اور صحو کے موضوع پر ان دونوں بزرگوں کے اختلاف رائے کو بیان کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:''حضرت بایزید اور ان کے پیر صحو پر سکر کو ترجیح دیتے ہیں ۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ صحو کی حالت میں انسانی صفات تمکین و اعتدال کی صورت میں رہتی ہیں ، اور یہ چیز بندے اور خدا کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہوتی ہے۔سکر کے عالم میں انسانی صفات مثلاً عاقبت اندیشی اور انتخاب و اختیار کی صلاحیتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور (خدا کے معاملہ میں)انسان کو اپنے آپ پر کوئی قابونہیں رہتا او رصرف وہی صلاحیت وقوت اسکے اندر باقی رہ جاتی ہیں، جوجنس بشریت سے تعلق نہیں رکھتیں اور یہ قوت نہایت مکمل اور جامع ہے ......

پھر جنیدؒ اور ان کے متبعین ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سکر ایک آفت ہے، کیونکہ اس سے انسان کے صحیح احوال میں اضطراب پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ہوش وحواس اور ضبط وتمکین کھو دیتا ہے ، اور جیسا کہ تمام حقائق کا اصل اصول معلوم کرنا مقصود ہے ، فنا کے ذریعے یا بقا کے واسطے سے ، یا محو کے ذریعے یا اثبات کی راہ سے ،تو جب تک کہ (تلاش کنندہ) صحیح الحال نہ ہو، تصدیق وتحقیق نہیں ہوسکتی ......بے

بصری کسی کو خارجی مظاہر کے بندھنوں اور ان کی بگڑی ہوئی شکل سے رہائی نہیں دلا سکتی، اور رہی یہ بات کہ مظہر خارجی میں گھرے رہتے ہوئے خدا کو بھلائے رکھنا، تو یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ لوگ اشیاء کو جیسی کہ وہ ہیں، ویسی نہیں دیکھتے اور اگر وہ (انہیں اسی طرح دیکھتے جیسی کہ وہ ہیں) تو وہ ان کے بندھنوں سے آزاد ہوتے۔

''دیکھنا در اصل دو طرح کا ہوتا ہے: ایک یہ کہ دیکھنے والا چیزوں کو بقا کی آنکھ سے دیکھے اور دوسرا یہ کہ انہیں فنا کی نظر سے دیکھے۔ اگر وہ بقا کی آنکھ سے دیکھتا ہے تو دیکھے گا کہ تمام کائنات (خدا کی ذات میں) اسکی اپنی بقا کے مقابلہ میں غیر کامل ہے ...... اور اگر وہ فنا (فی ذات حق) کی نظر سے انہیں دیکھے گا تو وہ دیکھے گا کہ ذاتِ خداوندی کی بقا کے سامنے تمام موجودات فانی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں وہ (مخلوق) موجودات سے منھ موڑے گا۔ اور اسی لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی ہوتی تھی: ''اے اللہ! ہمیں اشیا کو اسی صورت میں دکھا، جیسی کہ وہ ہیں''۔ اس لئے جس کسی نے بھی اس طرح دیکھا، آسودہ رہا......پس بصیرت صحو کی حالت میں میسر آتی ہے، اور اہل سکر کو اس عالم کا کوئی شعور نہیں ہوتا جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عالم سکر میں تھے کہ ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہوگئے۔ اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ معظّمہ سے قاب قوسین تک عالم صحو میں تھے، جب کہ ہر طرف تجلی تھی اور آپ ہمہ وقت ہشیار تر اور بیدار تھے۔

"شربت الراح کاساً بعد کاس فما نفد الشّراب وما ردیت"۱۶؎

صحو وسکر کے معاملہ میں ہجویری مسلک جنیدی کے پیرو تھے، انہوں نے لکھا ہے کہ سکر بچوں کی بازی گاہ اور صحو شہادت گیر مرداں ہے۔ میں کہ علی بن عثمان الجلابی ہوں، اپنے شیخ سے متفق ہوں اور کہتا ہوں کہ صاحب سکر کی حالت کمال یہ ہے کہ وہ صاحب صحو ہو جائے (یعنی عالم مدہوشی سے عالم ہوش میں آجائے''۱۷؎

معرفت الٰہی

معرفت الٰہی سے متعلق حضرت جنیدؒ کا نظریہ بھی، ایک لحاظ سے ان کے بحال ہوش کے نظرئے کی مزید وضاحت ہے۔ عام طور پر صوفیہ یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت عقل کی مدد سے

نہیں حاصل ہوسکتی ، اس لئے کہ عقل محدود ہے اورحق تعالٰی لامحدود متکلمین کا خیال ہے کہ معرفت علم ہے، اس لئے ہرعلم معرفت ہے اور ہر معرفت علم۔ ہرشخص جو عالم باللہ ہے، عارف باللہ ہے ۔مگر صوفیہ کے نزدیک معرفت ایک ایسے شخص کی صفت ہے جوحق تعالٰی کو اس کے اسماء وصفات کے ساتھ پہچانے، پھر وہ اللہ تعالٰی کے معاملہ میں سچا اورمخلص ہو، اپنے آپ کونفس کی کمزوریوں اور بری باتوں سے دور رکھے ۔ اس کے بعد وہ آستانہ الٰہی پر ایک طویل عرصہ تک ٹھہرا رہے اور اپنے دل کو اسی آستانے پر معتکف رکھے ۔ اسکے نتیجہ میں اسے یہ خوش بختی حاصل ہوگی، کہ اللہ تعالٰی اس کی طرف متوجہ ہوگا اوروہ اپنی تمام حالتوں میں اللہ تعالٰی کے ساتھ خلوص اور صدق دل سے عمل پیرا ہوگا اور خواطرنفس کے اثر ونفوذ سے آزادہوجائے گا، پھرکوئی خطرہ (خیال)جو غیراللہ کی طرف پکارے ، اسے اللہ کے راستہ سے ہٹانہ سکے گا ۔ چنانچہ جب بندہ مخلوق سے اجنبی اورآفات نفس ، علائق دنیوی اور ملاحظات ذہنی سے بری ہو جاتاہے توہرلحظہ اپنے باطن میں مناجات الٰہی میں مشغول اور اپنے رجوع الی اللہ میں ثابت وقائم رہتا ہے ۔تو پھراللہ تعالٰی اس پر اپنی تقدیروں کے رد وبدل کے راز کھول دیتاہے اورتب جا کر بندہ ''عارف'' کہلاتا ہے اور اس کی یہ حالت ''معرفت'' کہلاتی ہے ۱۸؎

مشائخ تصوف نے اپنے احوال کے مطابق معرفت پر بہت کچھ کہا ہے ، مثلاً ابوعلی دقاقؒ فرماتے ہیںؒ: معرفت باللہ کی علامت ہے کہ دل میں اللہ کی ہیبت پائی جائے ، لہٰذا جس قدرکسی کو اللہ کی معرفت حاصل ہوگی ،اسی قدر اسکے دل میں اللہ کی ہیبت ہوگی ۔ اور انہیں کا قول ہے کہ جس قدر دل میں معرفت ہوگی، اسی قدر دل کوسکون ہوگا، کیونکہ معرفت سے دل میں سکون ہوتاہے ۔شبلی سے جب معرفت کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا: اس کی ابتدا (دل اور زبان سے) اللہ کے ذکر سے ہوتی ہے ،اور اس کی انتہاء کی کوئی انتہانہیں ۔ ابو یزید بسطامیؒ فرمایا کرتے :مخلوق کےمختلف احوال ہو تے ہیں مگر عارف باللہ کا کوئی حال نہیں ہوتا ، اس لئے کہ اس کے تمام نشانات مٹ چکے ہوتے ہیں اور اس کی اپنی ذات حقیقت میں فنا ہو چکی ہوتی ہے اور اس کے اپنے آ ثار اس کے آثا ر میں غائب ہو چکے ہوتے ہیں ۔ ابو بکر واسطیؒ کا قول ہے : جب تک بندے کے اندر استغنا باللہ اور افتقار الی اللہ موجود ہو ، اس وقت تک معرفت صحیح طور پر حاصل نہیں ہوسکتی۔

کہا جا تاہے کہ عارف کی آنکھ روتی ہے اور دل ہنستا ہے ۔

آیئے دیکھیں کہ حضرت جنیدؒ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں: ایسا لگتاہے کہ اس مسئلے میں بھی

انہوں نے اہل توحید کی طرح اہل معرفت کی درجہ بندی کی ہے ۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت کی نوعیت تو ایک ہے، لیکن اس کے مختلف درجات ہو سکتے ہیں ۔ اس راہ میں ایک مبتدی کی معرفت کا کچھ اور رنگ ہوتا ہے ۔ وہ ترقی کرے، تو اس میں اضافہ ہوتا ہے اور اگر پوری راہ طے کر لے اور منزل مقصود پر پہنچ جائے، تو اس کی معرفت کا رنگ ابتدائی منزلوں کی معرفت سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا مکمل ادراک کر سکے ، اس لئے کہ انسانی ذہن محدود ہے اور محدود ،لا محدود کا پوری طرح احاطہ نہیں کرسکتا۔ انہوں نے متکلمین کی طرح اور اکثر صوفیہ کے بر خلاف علم ، اور معرفت کے الفاظ علم ذات الٰہی کے لئے یکساں استعمال کئے ہیں اور اس سلسلے میں یہ کہا ہے کہ اللہ کے بعض برگزیدہ بندے ایسے ہوتے ہیں جو صفات الٰہی میں بڑی شدت اور گہرائی سے غور وفکر کرتے ہیں اور ان کی ماہیت کی پہچان میں بہت دور تک نکل جاتے ہیں۔ صفات الٰہیہ کا تصور ان کے یہاں جتنا شدید اور گہرا ہوگا ، اسی قدر شدید اور گہرا خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح وتکریم میں ان کا استغراق ہوگا۔ اگر کوئی ایسا مسلمان نظر آئے جو ہمہ وقت خدا کی حمد و ثنا میں مشغول رہتا ہے ، خوف ورجا کی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے، معروضات پر عمل کرتا ہے اور منہیات سے اجتناب کرتا ہے ۔ خدا کے لئے سراپا شوق رہتا ہے ، روتا ہے ، اپنے گناہوں پر غمزدہ رہتا ہے اور کمال عجز و انکسار کے ساتھ تقرب الٰہی کا خواہاں رہتا ہے، تو اسی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ''عارف باللہ'' یا ''عالم باللہ'' ہے۔ قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرنے والے تو اہل علم ہی ہوتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ نے اپنے رسالے ،فی الفرق بین الاخلاص و الصدق، میں جو بحث کی ہے اس میں اس کی وضاحت فرمادی ہے کہ معرفت الٰہی کی راہ میں ایک منزل وہ آتی ہے جب عقل کے وساوس ختم ہوجاتے ہیں اور علم تمیزی در ماندہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ صدق اور اخلاص کے مرحلوں میں عقل کی دراندازی ، بہر حال قائم رہتی ہے مثلاً صدق روحانی تجربے کی ایک منزل ہے، لیکن اس تجربے میں مزید گہرائی اور گیرائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اخلاص بھی اس میں شامل ہوجائے ۔ اخلاص مزید کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی نیت اللہ کے لئے خاص کرلے اور محض وہی اس کا مقصد ہو ، اسکی عقل اشیاء کی دراندازی سے آگاہ ہو اور بدلتے ہوئے امور و حالات کی کیفیت اس پر عیاں ہو ، چنانچہ جو چیز اس کے مقصد کی صحت و درستی کے مطابق ہو اسے قبول کرلے اور جو چیز اس کے مخالف

ہو اسے رد کردے ۔ اس حالت میں اسے بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کی اپنی ذاتی بصیرت ختم ہوگئی ہے اور اس کی جگہ (اللہ تعالیٰ کی عنایت سے)ایک اور قسم کی بصیرت نے لے لی ہے ......پس صدق اور اخلاص ایک مخلص انسان کی ذات ہی میں اکھٹے ہوتے ہیں ، لیکن محض صدق صرف صدق کے ساتھ ہی مخصوص رہتا ہے اور اخلاص کا بہت ابتدائی حصہ اس کیساتھ شامل ہوتا ہے ۔ پس جو لوگ اپنے آپ کو عبودیت کے ساتھ متصف کرتے ہیں ، ان کا بلند ترین وصف یہی 'اخلاص' ہے اور ایک صادق کو، جو اپنے صدق میں کامل ہو، اللہ تعالیٰ اخلاص کی نعمت بھی بخش دے ۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک مخلص کو، جو اپنے اخلاص میں سچا ہو، اللہ تعالیٰ 'کفایہ' کی صفت سے نوازدے ۔تاکہ وہ اپنی بصیرت اللہ تعالیٰ کی طرف مرتکز کردے ، اور ہوسکتا ہے کہ ایک ایسے انسان کی، جسے خدا نے یہ بصیرت عطا کی ہو ، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ہر طرح (وہ) حفاظت ونگہبانی کرے''۱۹؟

اس کے بعد حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس مرحلے میں اللہ تعالیٰ اپنے اس مخلص بندے پر پوری طرح چھا جاتا ہے، اور اس بندے کی عقل مغلوب ہوکر اپنی الجھنے والی انفرادیت کھو دیتی ہے، اور وہ بندہ توحید خاص کی لذت سے آشنا ہوتا ہے ۔ اس حالت میں بندہ در اصل ایسے وجود کی صفت سے آزاد ہوجاتا ہے جسے عقلی اصطلاحوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا ۔ عارفین باللہ کی اسی حالت کو بعض صوفیہ نے '' حالت توحید'' میں ہونے سے تعبیر کیا ہے، یعنی توحید الٰہی کا علم اور چیز ہے اور حالت توحید کا تجربہ اور چیز دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس آخری حالت کے تجربے کے بعد جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم الٰہی کا ایک حصہ ہوتا ہے جو تجلی یا القاء کی صورت میں اس خاص بندے کے قلب پر نازل ہوتا ہے ۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت جنیدؒ کے نزدیک اصل معرفت کیا ہے اور عارف کس شخص کو کہا جاتا ہے؟ عارف وہ نہیں جو ذات باری تعالیٰ کے علم کی جستجو میں ہو اور اپنی عقل کی مدد سے اس علم کو حاصل کرنا چاہتا ہو ، بلکہ عارف اللہ کا وہ خاص بندہ ہے جسے اللہ تعالیٰ خود اپنے کرم سے اپنے علم کا تھوڑا سا حصہ ودیعت کرتا ہے ۔ روحانیت کی یہ وہ منزل ہے جسے معرفت کہتے ہیں یہاں خود اللہ تعالیٰ اپنی تجلیات میں اپنے آپ کو بے نقاب کردیتا ہے۔

حضرت جنیدؒ سے جب پوچھا گیا کہ عارف کسے کہتے ہیں، تو آپ نے فرمایا: عارف کی پہچان یہ ہے کہ اس کی '' حالت توحید'' اس میں بعض خصوصیات پیدا کردیتی ہے مثلاً عارف اس وقت تک صحیح معنوں میں عارف نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ وہ زمین کی طرح نہ ہوجائے کہ نیک و بد سبھی

روندتے ہیں ۔ اور بادل کی طرح نہ ہو جائے جس کا سایہ ہر سفید و سیاہ پر پڑتا ہے ، اور بارش کی مانند نہ ہو جائے کہ وہ ہر چیز کو سیراب کرتی ہے ، اسے بھی جسے وہ پسند کرتی ہے اور اسے بھی جسے وہ پسند نہیں کرتی ۔۱۹

حواشی

۱۔رسالہ قشیریہ (اردو ترجمہ) ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلام آباد ، ۱۹۷۰ء،صفحہ ۴۲۹

۲۔ہجویری ، کشف المحجوب ، تدوین ،والنٹین ژوکوفسکی ، ۱۹۲۶ء،صفحہ ۴۱

۳۔ رسالہ قشیریہ ، (بحوالہ سابق)صفحات ۴۵۹۔۴۵۸

۴۔حضرت جنیدؒ ، رسالہ مسالتہ اخریٰ (رسالہ نمبر ۱۶، ڈاکٹر علی حسن عبد القادر کی کتاب دی لائف پرسنالٹی اینڈ رائٹنگز ، آف الجنید ، لندن ، ۱۹۶۲،ترجمہ محمد کاظم بعنوان جنید بغداد ، مکتبہ جدید ، لاہور ، ۱۹۶۷ء)

۵۔حضرت جنیدؒ ، رسالہ کتاب الفناء ، (بحوالہ ڈاکٹر علی حسن عبد القادر ۔

۶۔ایضاً

۷۔ایضاً

۸۔رسالہ قشیریہ (بحوالہ سابق) صفحہ ۵۹

۹۔کشف المحجوب (بحوالہ سابق) صفحات ۲۳۵۔۳۲۔

۱۰۔حضرت جنیدؒ ، رسالہ مسالتہ اخریٰ ،بحوالہ ڈاکٹر علی حسن عبد القادر ۔

۱۱۔ابونصر سراج ، کتاب اللمع ، تدوین ، آر ۔ اے ۔ نکلسن ، مطبع بریل ،لائڈن ، ہالینڈ، ۱۹۱۴،صفحہ ۲۱۲

۱۲۔حضرت جنیدؒ ۔ رسالہ کتاب الفناء ،بحوالہ ڈاکٹر علی حسن عبد القادر

۱۳۔کشف المحجوب (بحوالہ سابق)صفحات ۲۳۲

۱۴۔ایضاً صفحات ۲۳۵۔۳۲

۱۵۔ابو الحسن بن عثمان ابو علی الجلابی المحجویری التغزنوی

۱۶۔کشف المحجوب (بحوالہ سابق ،صفحات ۲۳۲۔

۱۷۔رسالہ قشیریہ (بحوالہ سابق ،صفحات ۴۷۷۔۴۷۶

۱۸۔حضرت جنیدؒ، رسالہ فی الفرن بین الاخلاص و الصدق ،بحوالہ ڈاکٹر علی حسن عبد القادر ۔
۱۹۔رسالہ قشیریہ (بحوالہ سابق) صفحہ ۴۸۳

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ: حیات وکمالات -ایک مختصر جائزہ

حافظ شبیب انور علوی کاکوروی،لکھنؤ

ہندوستان کے لیے چھٹی صدی ہجری کا زمانہ روحانی اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ تاریخ کے وسیع وعریض منظر نامہ پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ متعدّد روحانی ہستیوں نے اپنی جدوجہد اور عزم پیہم سے ہزار ہا نفوس کی زندگیوں کے دھارے کو یکسر بدل ڈالا۔ شرک کی جگہ توحید، کثرت کی جگہ وحدت ، شر کی جگہ خیر،ظلم کی جگہ انصاف، الحاد وبیدینی اور بے یقینی کی جگہ ایمان وعرفان اور یقین کی لازوال دولت کے صد ہا سے زائد جیتے جاگتے نمونے نظر آتے ہیں۔

اسی صدی میں ملتان سے ولایت وہدایت اور رشدومعرفت کا ایک آفتاب بلند ہوتا ہے جو اپنی نورانی کرنوں، اور عرفانی تجلیات سے پورے ملک کو منوّر کرجاتا ہے۔ اس پیکر عرفان وتصوف کا نامِ نامی مسعود اور لقب فرید الدین ، گنج شکر تھا۔

حضرت بابا صاحبؒ کابل کے بادشاہ فرخ شاہ کی اولاد میں تھے۔لیکن گردش زمانہ سے ان کی حکومت ختم ہوئی۔ پھر چنگیزیوں کے حملے اور تاخت وتاراجی نے حضرت بابا صاحب کے پردادا، حضرت شیخ احمدؒ، کو شہادت کا جام پلایا اور آپ کے صاحبزادہ حضرت شعیبؒ ترک وطن فرما کر وہاں سے مع اہل وعیال لاہور آگئے، وہاں آپ کی بڑی پذیرائی ہوئی اور آپ کے علم وفضل اور تقویٰ وپرہیزگاری نے ایک عالم کو آپ کا گرویدہ بنالیا۔مگر اس سب کے باوجود آپ وہاں مستقل نہ رکے، بلکہ ملتان کے قریب قصبہ کھوتْووال میں جسے آج چاوَلی مشائخ کہتے ہیں،تشریف لائے اور یہیں مستقل طور پر قیام فرمایا۔ بادشاہ وقت نے یہاں کی مسند قضا کے علاوہ آٹھ ہزار روپے کی جاگیر بھی عطا کی۔

ان شیخ شعیبؒ کے تین لائق وفائق صاحبزادے تھے،جن میں خواجہ جمال الدین سلیمانؒ ممتاز تھے۔ والد نے اپنے اس بیٹے کا نکاح مولانا وجیہ الدین خجندیؒ عباسی کی صاحبزادی بی بی قرسم خاتون سے کیا، جو اپنے وقت کی بڑی عارفہ ، کاملہ اور ولیہ تھیں، ان بی بی صاحبہ سے تین

صاحبزادے، خواجہ اعزالدینؒ ، بابا فرید الدینؒ اور خواجہ نجیب الدینؒ اور ایک صاحبزادی بی بی ہاجرہ پیدا ہوئیں۔ ان ہی صاحبزادی صاحبہ کے بطن سے حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری پیدا ہوئے، جو ایک بڑے سلسلہ طریقت کے بانی اور کلیر ضلع سہارنپور میں آسودۂ خواب ہیں۔

حضرت بابا صاحب کے جد امجد، والدین اور بڑے بھائی کے مزارات کھوٹووال میں ہیں۔ خواجہ نجیب الدینؒ دہلی کی سرزمین میں آرام فرما ہیں۔

حضرت بابا صاحبؒ کی ولادت کی تاریخ میں بعض مورخین نے اتفاق نہیں کیا ہے، لیکن تحقیق سے یہ بات تقریباً ثابت ہوچکی ہے کہ ۲۹ رشعبان المعظم ۵۶۹ھ چہار شنبہ کی رات آپ کی ولادت ہوئی۔

ولادت سے قبل اور بعد میں بکثرت کرامات آپ سے منسوب ہیں آپ اپنے بچپن سے ہی عادات حمیدہ اور خصائل پسندیدہ سے آراستہ تھے۔ بچپن ہی میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مگر اس کے باوجود آپ کی فطری خصوصیات نے آپ میں خوش اخلاقی، رحمدلی، سخاوت وشرافت، خداترسی، صبر، قناعت، توکل، رضا، ادب وشائستگی، مخلوق خدا سے محبت، ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو اپنی سمجھنا جیسی بکثرت صفات سے آراستہ کردیا تھا۔

آپ کی والدہ ماجدہؒ نے آپ کی تربیت وتعلیم پر خاص توجہ دی۔ چار سال کی عمر میں مکتب میں داخل کیا اور نماز وغیرہ کی تعلیم دی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے والدہ ماجدہ سے دریافت کیا کہ نماز پڑھنے سے کیا ملتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ شکر ملتی ہے۔ اسی دن سے وہ جائے نماز کے نیچے تھوڑی سی شکر رکھ دیا کرتی تھیں۔ آپ نماز پڑھ کر جائے نماز (مصلی) اٹھاتے تو شکر ملتی، جسے خوشی خوشی تناول فرمالیتے۔ ایک مرتبہ آپ اپنے ہم عمر بچوں کے ہمراہ گھر سے باہر تھے۔ وہیں نماز کا وقت آگیا۔ آپ نے نماز پڑھنی شروع کی۔ والدہ ماجدہ گھر پر اس خیال سے بہت پریشان ہوئیں کہ آج اسے شکر نہ ملے گی، تو اس کے اس خیال کی تردید ہوجائے گی، بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہوئیں۔ دعا قبول ہوئی ادھر معصوم بابا صاحب نماز سے فارغ ہوئے، مصلیٰ اٹھایا تو دیکھا کہ روز سے کہیں زیادہ شکر موجود ہے، جسے آپ اور آپ کے ہمعصر بچوں نے بھی نوش فرمایا۔ والدہ ماجدہ کے پاس واپس آنے پر یہ واقعہ بیان کیا جس پر وہ بہت خوش ہوئیں۔ اسی روز سے آپ گنج شکر مشہور ہوگئے۔ تذکرہ کی بعض کتابوں میں اس واقعہ کے علاوہ بھی ایک دو واقعات ہیں، جن سے آپ کے

لقب گنج شکر کی تائید ہوتی ہے۔

مکتب کی تعلیم کے دوران آپ جب بغرض تفریح ویرانہ وجنگل کی طرف تشریف لے جاتے تو یہ آواز سنتے کہ مسعود ! بیکار نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اپنے حقیقی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ چنانچہ بچپن سے ہی آپ کا قلب ہر چیز سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

ہر کسی را بجہان خویشے و پیوندی ہست
غم تو خویش من وعشق تو پیوند من است

(ہر ایک کا دنیا میں کوئی نہ کوئی عزیز رشتہ دار ہے۔ میرا عزیز تیرا غم اور رشتہ دار تیرا عشق ہے)

اس کے باوجود سات برس کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا اور پھر تمام علوم دینیہ کی تعلیم وتحصیل میں منہمک ہوگئے۔ ابتدائی ضروری تعلیم سے فراغت کے بعد والدہ ماجدہ نے ضروری سامان ساتھ کرکے مزید تعلیم کے لئے ملتان روانہ کردیا، جہاں آپ نے مولانا منہاج الدین ترمذیؒ سے تمام درسیات کی تکمیل کی۔

ایک روز وہیں بیٹھے کتاب نافع کا مطالعہ کررہے تھے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تشریف لائے۔ دورکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد آپ کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا: کیا پڑھ رہے ہو؟ عرض کیا کہ نافع پڑھ رہا ہوں۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ نافع سے کچھ نفع پہنچنے کی امید ہے؟ بابا صاحب نے عرض کیا: اس سے تو خیر کیا فائدہ پہنچے گا، البتہ حضور کی کیمیا اثر نگاہ سے ضرور فائدہ پہنچنے کی امید ہے اور اٹھ کر حضرت قطب الدینؒ کی قدم بوسی کی اور ایک سرمستی اور وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ تعلیم کو یکسر خیر باد کہنا چاہا مگر قطب صاحبؒ نے فی الوقت منع فرمایا، چنانچہ آپ پھر تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔ اس کے لئے آپ نے مختلف جگہوں کے سفر بھی کیے۔ پھر والدہ محترمہ کی خدمت میں تقریباً ۱۲ سال گزار کر واپس آئے۔ اس تمام عرصہ میں آپ نے ریاضت ومجاہدہ نفس میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آئینہ قلب خوب صیقل ہوا۔

اپنے مستقر سے بیعت کی خاطر دہلی آئے اور حضرت قطب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ تم اپنا کام پورا کرکے آئے ہو! پھر سلسلہ عالیہ چشتیہ میں مرید فرمایا۔ اس وقت صاحب سیر الاولیاء کے قول کے مطابق حضرت قاضی حمید الدین ناگوری، مولانا علاء الدین کرمانی، سید نور الدین مبارک غزنوی، مولانا شمس الدین، شیخ نظام الدین ابو المؤید، شیخ محمود

موئینہ قدست اسرارہم جیسی عظیم شخصیتیں بھی موجود تھیں۔

بیعت کے بعد بہت سی باطنی نعمتیں عطا فرمائیں ۔ آپ کے سر پر چہار تر کی کلاہ رکھی اور ارشادفرمایا کہ فرید! شیخ وقت میں ایسا باطنی تصرّف ہونا چاہئے کہ جب کوئی طالب اس کی خدمت میں مرید ہونے حاضر ہوتو وہ اپنی باطنی قوت سے اس کے سینہ کا زنگار دور کرکے اسے دنیاوی آلائش سے پاک کرے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہنچادے۔ اگر اس میں یہ قدرت اور نصرت نہ ہوتو سمجھ جاؤ کہ شیخ اور مرید ہدایت کے راستہ سے ناواقف ہیں الخ۔

مرید فرمانے کے بعد مزید تربیت اور جلاء قلب کے لئے اپنی خانقاہ میں قیام کا حکم دیا اور آپ نے زبردست مجاہدے وریاضتیں فرمائیں۔آپ نے خدمت شیخ اور ان کی پیروی و اطاعت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ پھر چلّوں ، ریاضتوں اور مجاہدوں نیز شیخ کی کیمیا نظری سے جب آپ میں پوری صلاحیت واستعداد پیدا ہوگئی تو انہوں نے آپ کو باطنی خلافت سے بھی سرفراز فرمایا اور خلافت کی سند عطا کی۔ حضرات صوفیہ نے تحریری سند کی بڑی اہمیت فرمائی ہے۔

دہلی اور اطراف میں آپ کی بزرگی کی شہرت ہونے کے بعد مخلوق کا اژدہام شروع ہوا۔ چنانچہ آپ ہانسی تشریف لے گئے، لیکن وہاں بھی خلقت کا ہجوم رہا۔ ہانسی کے دوران قیام ہی حضرت قطبؒ کا دہلی میں وصال ہوگیا۔

وصال سے قبل حضرت قطبؒ نے اپنے تمام تبرکات مع خرقہ خلافت وجانشینی ، حضرت خواجہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ کو امانتاً سپرد فرمائے۔ حضرت باباؒ پیرومرشد کے آستانہ پر پہونچے تو قاضی صاحب نے وہ امانتیں آپ کے سپرد کیں اور تمام دوسرے خلفاء ومشائخ نے بالا تفاق آپ کو خواجہ قطب الدینؒ کا جانشین تسلیم کرلیا۔ آپ نے اسی خانقاہ پر مستقل قیام فرمایا اور جمعہ کے علاوہ خانقاہ شریفہ سے باہر نہ آتے تھے۔

ایک جمعہ کو جب آپ خانقاہ سے باہر آئے تو ایک مجذوب سے جو ہانسی (ہریانہ) سے آئے تھے، ملاقات ہوئی انہوں نے دوبارہ ہانسی چلنے کی منّت سماجت کی آپ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اپنے مرشد زادوں سے اجازت لے کر آپ ہانسی تشریف لے گئے، مگر کچھ ہی روز بعد خلقت کے ہجوم سے پریشان خاطر ہوکر شیخ جمال الدین کو خرقہ عطا فرما کر اپنے وطن کوٹھوال روانہ ہوئے ۔ وہاں بھی شہرت کی زیادتی اور مخلوق کی جوق در جوق آمد نے زیادہ عرصہ قیام نہ کرنے دیا اور آپ اجودھن، جو آج

کل پاکپتن کے نام سے مشہور ہے، تشریف لے گئے اور چوں کہ ندائے غیبی آچکی تھی کہ فرید! ’’تجھے مخلوق کی تربیت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، حقیقت کے طالبوں کو اپنے دروازہ سے خالی ہاتھ مت لوٹانا۔‘‘ اس لیے آپ نے وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی اور ایک عالم کو اپنے فیوض وبرکات سے سرفراز فرمایا۔ ۶۴۶ھ سے آپ کا مستقل قیام وہیں رہا۔

پاکپتن میں ہی آپ نے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والی سنّت نبویہ پر عمل کیا اور یکے بعد دیگرے چار شادیاں فرمائیں ۔بعض روایتوں میں تین کی صراحت ہے۔ سلطان غیاث الدین بادشاہ، دہلی کی صاحبزادی کے بطن سے آپ کے پانچ صاحبزادے ۔ (۱)۔ شیخ شہاب الدین (۲)۔ خواجہ بدرالدین (۳)۔خواجہ نظام الدین (۴)۔خواجہ محمد یعقوب (۵)۔ خواجہ عبد اللہ رحمہم اللہ، اور تین صاحبزادیاں (۱)۔ بی بی فاطمہؒ، (۲)۔ بی بی شریفؒ اور (۳) بی بی مستورہؒ پیدا ہوئے۔

آپ کے سب صاحبزادے اور صاحبزادیاں نیکی وتقویٰ اور پرہیزگاری سے آراستہ تھے ۔

ایک طویل عرصہ تک مخلوق خدا کو فیضیاب وبامراد کرکے یکم محرم ۶۶۴ھ کو آپ کیفیت وصال میں مبتلا ہوئے اور ۵ محرم الحرام ۶۶۴ھ (۱۲۶۵ء) سہ شنبہ کو واصل بحق ہوگئے۔ پاکپتن شریف میں آپ کا مزار مبارک مرجع خاص وعام ہے۔

آپ کے وصال پر بہت سے حضرات نے قطعات منظوم کیے۔

یوں تو آپ کے بہت سے خلفاء ومجاز ہوئے، مگر جن بزرگوں کے اسماء تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ شیخ نجیب الدین متوکلؒ
۲۔مولانا بدر الدین اسحٰقؒ
۳۔ سلطان المشائخ سید نظام الدین اولیاء بدایونیؒ
۴۔مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیریؒ
۵۔شیخ جمال الدین ہانسویؒ
۶۔ شیخ عارفؒ
۷۔مولانا فخر الدین صفاہانیؒ
۸۔مولانا معین الدین عبد اللہؒ

۹۔ شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ
۱۰۔ شیخ زین الدین دمشقیؒ
۱۱۔ شیخ علی شکر ریزؒ
۱۲۔ شیخ جمال کامل داؤدؒ وغیرہ

مزید برآں بعد کے سوانح نگاروں نے اور بھی بہت سے اسماء کو شامل کیا ہے، مگر اوّل الذّکر چھ برآوردہ خلفاء پر سب کا اتفاق ہے۔

صوفی حضرات کی تعلیمات اور ارشادات بڑی اہمیت اور افادیت کے حامل ہوتے ہیں، چنانچہ آپ کے چند ارشادات یہاں تبرکاً درج کیے جارہے ہیں۔ ان سے آپ کے مقام وکمالات کا بھی اندازہ ہوگا۔

۱۔ درویشی در اصل پردہ پوشی ہے۔ درویش کو چار باتوں پر عمل کرنا لازمی ہے: اپنی آنکھیں بند رکھے تاکہ کسی کا عیب نہ دیکھے، کان بند رکھے کہ ناپسندیدہ اور منع کی ہوئی باتیں نہ سنے، زبان بند رکھے، تاکہ جو بات نہ کہنے کی ہو نہ کہہ سکے، پاؤں کو لنگڑا کرے تاکہ نفس کی خواہش پر بُرے راستہ نہ چلے۔

۲۔ علماء ومشائخ کی دوستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوستی ہے۔ فقیہ عالم، ہزاروں عابدوں سے بہتر ہے، جو رات رات بھر عبادت کریں اور دن کو روزے رکھیں۔

۳۔ درویشوں کو امراء بادشاہوں کی صحبت سے حتی الامکان بچنا چاہئے، کیوں کہ ان کی صحبت فقراء کے لئے زہر ہلاہل ہے۔

۴۔ جب مومن بیمار ہو تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ بیماری اس کے لئے رحمت الٰہی ہے، جو اسے گناہوں سے پاک کرتی ہے۔

۵۔ عشق ومعرفت میں وہی شخص کامل ہے جسے ہر حال میں یادِ الٰہی کا خیال ہو۔

۶۔ خود سے چھوٹو تو حق سے ملو۔

۷۔ تم جیسے ہو ویسا ہی اپنے آپ کو ظاہر کرو ورنہ کل قیامت کے روز جیسے تم ہو تم کو دکھا دیا جائے گا۔

۸۔ سب سے ذلیل وہ ہے جو کھانے، پہننے میں مست رہتا ہے۔

۹۔ اپنے کام کو لوگوں کی ہمت شکن باتوں کی وجہ سے نہ چھوڑ دینا چاہئے۔

۱۰۔ دل کو شیطان کا کھیل نہ بناؤ۔

۱۱۔ گناہ پر شیخی نہ بگھارو۔

۱۲۔ تدبیر میں مصیبت اور تسلیم میں سلامتی ہے۔

۱۳۔ جسم کو من مانی نہ کرنے دو کیوں کہ پھر وہ بہت مانگے گا۔

۱۴۔ جو تم سے ڈرے تم اس سے ڈرو۔

۱۵، دوست کو تواضع سے اپنا بناؤ۔

۱۶۔ پرانے خاندان کی حرمت وعزت ملحوظ رکھو۔

۱۷۔ ایسا سچ بھی نہ بولو، جو جھوٹ معلوم ہو۔

عرفان علاّمہ طباطبائیؒ

کی نظر میں

ڈاکٹر عبد الحمید ضیائی

علاّمہ طباطبائی روحانی وباطنی لحاظ سے غیبی اور ملکوتی عوالم کے اعلیٰ وارفع مراتب ومدارج میں نامور مقربین اور صدیقین کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز تھے، شرعی اعتبار سے جنہیں ایک پابند شریعت فقیہ شمار کیا جاتا تھا اور جو آداب ورسومات دینی کی رعایت پر خصوصی توجہ اور مکمل دھیان دیتے تھے، یہاں تک کہ معمولی مستحبات کی بجا آوری سے بھی گریز وپرہیز نہ کرتے تھے۔ وہ شریعت مبین کے لانے والوں کے سلسلے میں غیر معمولی احترام کے قائل تھے۔ وہ مقدس شریعت اور احکام شریعت کو کماحقہ اہمیت نہ دینے والے بعض صوفیا کی روش قطعاً متفق نہ تھے اور اُنہیں انہیں نشانۂ تنقید راہ وقرار دیتے تھے، اور ان کی روش کو خطاؤں کا مجموعہ اور منزل مقصود تک رسائی سے محروم جانتے تھے البتہ دوسری طرف بعض ایسے افراد کی بھرپور مذمت بھی کرتے تھے جو حمایت شریعت اور ترویج دین کے نام پر ان علمای ربانی کو مورد لعن وطعن قرار دیتے تھے، جو محاسبہ ومراقبہ نفس، تزکیۂ روح اور عبادات الٰہیہ کے ذریعہ معنوی کمالات کی منزلوں کو طے کر چکے تھے بقول علامہ طباطبائی ایسے افکار بے جا تعصب کی دین ہیں کیونکہ ان کے اس عمل سے شریعت کی روح بیزار تھی[۱] ان افراد کی مذمت، جو کشف وشہود کے راستوں کو طے کرتے ہوئے معرفت خدا اور معنویت کی منزلوں کو طے کر چکے ہیں، فکری انجماد ہے۔ اور یہ سیرت رسولؐ اور آل رسولؐ سے یکسر مختلف ہے۔''

شہید مرتضیٰ مطہری فرماتے ہیں:

علاّمہ طباطبائی سے اپنی ملاقات وگفتگو کے دوران ھینری کربن نے سوال کیا کہ مسئلہ ولایت شیعوں نے صوفیاء سے لیا ہے صوفیا نے شیعوں سے؟ علامہ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: صوفیا نے یہ تصوّر شیعوں سے لیا ہے، اس لئے کہ یہ مسئلہ اہل تشیع کے درمیان اس وقت بھی موجود تھا، جب تصوف نے کوئی شکل وصورت اختیار نہیں کی تھی۔ یہ در اصل انسان کامل یا حجت عصر ہونے کا مسئلہ ہے، جس پر عرفا مکمل طور پر تکیہ کرتے ہیں۔ کوئی بھی زمانہ اس ولی کامل سے (جسے وہ قطب کہتے ہیں)

خالی نہیں، اور وہ اس انسانی کامل کے لئے ایسے مقام ومرتبہ کے قائل ہیں جو ہمارے افکار سے بہت دور ہے۔ ۲

اسی طرح اس عالم ربّانی سے یہ سوال کیا گیا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ تمام مخلوقات وموجودات کا سرچشمہ ذات خدا ہے، لہٰذا تمام اشیاء در اصل کلی طور پر وحدت وجود خدا کی حامل ہیں، جبکہ ہم لوگوں کو مخلوقات کی مختلف شکل وصورت دکھائی دیتی ہے صورتیں دیکھتے ہیں جیسے درخت، پتھر، انسان، وغیرہ تو اس کا جواب کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: خالق ومخلوق کے اثبات پر بے شمار دلائل ہیں، جو خدا کو فاعل اور دنیا کو فعل ثابت کرتے ہیں، اور ظاہر سی بات ہے کہ فعل کو غیر فاعل ہونا ہی چاہئے، چونکہ اگر فعل ہی عین فاعل ہوجائے گا تو پھر اس کے اپنے وجود سے پہلے ایک وجود ہونا ضروری ہوگا جو ممکن نہیں، لہٰذا دنیا، غیر خدا ہے اور اس وحدت وجود خدا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۳

عرفاء یا صوفیاء؟

علامہ طباطبائی اس گروہ عرفا کے حامی ہیں، حتیٰ کہ وہ خود اپنے کو ان کی پیروی کرنے والوں میں شمار کرتے ہیں، جو عارف باللہ اور متخلق اخلاق الٰہیہ ہیں اور، تہذیب نفس، تزکیۂ روح، ریاضت ومجاہدت اور عشق معنوی کے ذریعے کمالات کی منزلوں پر قدم رنجا ہیں۔ حسن اخلاق، علم وعمل، ذکر وفکر، ترک شہوات وفضولات جن کا شعار اور انسانی معاشرہ کی اصلاح وتربیت جن کا شیوہ ہے، فقرا اور مظلوموں کی خبر گیری اور دادرسی جن کا وظیفہ ہے، جو گمراہوں کو منزل مقصود تک پہونچانے والے، مدرسہ انبیاء اور مکتب اہلبیت رسولؐ وآل رسول کے شاگرد واقعی ہیں اور قرآنی اور روائی نکات کو فکری، علمی اور اخلاقی کاوشوں سے درک کرتے ہیں۔

ساتھ ہی علامہ نے، ایسے صوفیاء کی، جو مقام ولایت کے جھوٹے مدعی ہیں اور خود کو ہوائے نفس، حب جاہ، خرقہ بازی، ریاکاری، دکان داری، سادہ لوح عوام کو فریب دینے اور موہوم افکار کو رواج بخشنے میں مشغول کررکھا ہے، نہ صرف مخالفت کی ہے، بلکہ ان سے شدید اظہار تنفر وبیزاری بھی کیا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ایسے لوگ فریب کاریوں کے ذریعے اپنے درویشانہ اورفقیرانہ حلیہ کے عوام کو اپنے اردگرد جمع کرلیتے ہیں اور بہ نام عرفان وکرامت مشائخ صوفیاء سے متعلق مبالغہ آمیز

حکایتیں بیان کرتے ہیں۔ بقول مولانا روم مردان خدا کی گفتگو سے سرقہ کرتے ہیں تا کہ اپنی تہی دوکانی کا تدارک کرسکیں۔

چند دزدی حرف مردان خدا   تا فروشی و ستانی ، مرحبا

ایسے صوفیاء اپنے مریدوں پر صفائے نفس وروح، خداشناسی وخدا پرستی جیسا کوئی اثر نہیں چھوڑ پاتے، بلکہ انہیں امراض خود پسندی اورنخوت اپنے میں مبتلا کرتے ہوئے، خداشناسی کی طبیعت اور اعلیٰ انسانی اقدار سے دور کردیتے ہیں، اور انہیں گمرہی اور ریاکاری کی وادی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔

شمس الدین محمد اسیری لاہیجی نے کیا خوب ان کی تصویرکشی کی ہے:

آن کہ میلش سوی لھوست وسماع   وجد و حالاتش نباشد جز خداع
لاف فقر اندر جھان انداختہ   رہبر و رہزن زہم نشناختہ
صدفسون و مکر دارد در درون   مخلص و صادق نماید از برون
رہزنی چون نام خود رہ بین کند   عامیان را در ہلاکت افگند
گوید او کہ من قلا و وز رہم   وز منازل ہای این رہ آگھم
ہر کہ باور کرد آن مکر و دروغ   ماند از نور ولایت بی فروغ
گم شد و ہرگز بہ منزل رہ نبرد   در بیابان ہلاکت زار مرد
کردہ ای نفس و ھوی را پیشوا   لاجرم بویی نیابی از خدا
نور عرفان در دل و جانت نتافت   توہمی گویی چون من عارف کہ یافت
نیستت از عارفان شرم و حیا   دعویٔ عرفان و تلبیس و ھوی
وای آن طالب کہ در دامش فتاد   ہرچہ بودش نقد او برباد داد[۴]

مراقبہ اور محاسبہ:

علاّمہ طباطبائی نوجوانی سے ہی احکام شرعی کے پابند تھے، ذکر خدا ورد زبان رہتا تھا، نوافل ضرور انجام دیتے تھے، رمضان کی راتوں میں صبح تک بیدار رہتے تھے اور مطالعہ کے علاوہ دعا، تلاوت قرآن اور اذکار میں مصروف رہتے تھے،اور دعائے سحر اہل خانوادہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔[۵]

علامہ کے بیٹے نجم السّادات طباطبائی نے اپنی ماں، قمر السّادات طباطبائی، سے نقل کیا ہے کہ

علامہ جب نجف میں تھے، بعد نماز شب سوتے نہیں تھے اور نماز شب کے بعد اور صبح کے درمیان کے وقفہ میں اپنے بھائی، سید محمد حسن آملی، سے مباحثہ کرتے تھے۔۶

علاّمہ حسن زادہ آملی کی رو سے علاّمہ طباطبائی ہمیشہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہتے تھے اور خدا سے غافل نہیں رہتے تھے، چنانچہ یہ کیفیت ان کی رفتار وگفتار سے عیاں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ ہر چندوہ کسی سے محوگفتگو ہوں تو بھی ایسا لگتا تھا جیسے ان کی روح کہیں اور وابستہ ہے۔ یہ کیفیت امام جعفر صادقؑ کے اس قول کی مصداق ہے، جو مصباح الشریفہ میں درج ہے۔ امام فرماتے ہیں: عارف وہ ہے، جس کا بدن خلق خدا کے ساتھ ہو۔مگر دل خدا کے ساتھ ہو خدا کے علاوہ اس کا کوئی مونس نہ ہو۔۷

استاد عبد اللہ جوادی آملی فرماتے ہیں: علاّمہ طباطبائی انتہائی حسّاس اور بلند مرتبہ روح کے مالک تھے۔ وہ محو یاد خدا ہوتے تھے، تو ان پر ایسی کیفیت طاری ہوجاتی تھی کہ لوگ حیرت میں پڑ جاتے تھے کہ یہ کس دنیا میں سیر کررہے ہیں۔۸

علاّمہ طباطبائی چار اہم ترین عرفانی کتابوں، تمہیدالقواعد، شرح فصوص قیصری، مصباح الانس صدر الدین اور فتوحات محی الدین، پر کاملاً مسلط تھے، اور اس کی تدریس اور تحقیق کے سلسلے میں صاحب نظر تھے۔فن عرفان میں اجتہاد فرماتے تھے، کشف وشہود اور سیر سلوک سے متعلق آیت اللہ سید علی قاضی طباطبائی (۱۳۶۰۔۱۲۸۵ ہجری) اور سید حسن بادکو بہ ای (۱۳۵۸۔۱۲۹۳ہجری) سے استفادہ کیا تھا۔۹

رہبر معظم حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے مطابق: علامہ طبا طبائی کا معنوی چہرہ ایسی مضبوط شخصیت کی علامت تھا، جو محکم ایمان اور سچے عرفان کو عقلی طور پر پھیلانے والا اور اسے گہرائیوں میں اتارنے والا تھا انہوں نے ان صفات کے حیرت انگیز امتزاج سے ثابت کردیا تھا کہ اسلام دردمند افراد کی دلسوزیوں کو عقل کی طاقت سے سکون بخشتے ہوئے یکجا کرسکتا ہے۔۱۰

تماشائے ملکوت:

۱۳۰۴ہجری کے دوران علاّمہ طباطبائی کسب علم کے سلسلے میں نجف اشرف میں قیام پذیر تھے۔ ایک روز اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ آیت اللہ قاضی طباطبائی تشریف

لائے۔ آپ نے ان کا استقبال کیا۔ آیت اللہ قاضی طباطبائی نے اپنی گفتگو کے دوران فرمایا کہ جو تحصیل علم کے لئے نجف آتا ہے، اسے چاہیۓ کہ کسب علم ودانش کے علاوہ تہذیب نفس اور مکارم اخلاق بھی سیکھے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھے اور اپنے گھر چلے گئے ۔ یہ گفتگو علامہ طباطبائی کے لئے موثر ثابت ہوئی چنانچہ جب بھی آپ سیر وسلوک اور تہذیب نفس کی بات کرتے تھے آیت اللہ قاضی طباطبائی کے معنوی کمالات کا تذکرہ ضرور کرتے تھے۔ ۱۱ اس ملاقات کی سوغات تھی کہ علامہ طباطبائی فلسفہ اور علوم عقلیہ کہ کتابوں سے زیادہ تعلق رکھنے کے باوجود سیروسلوک قلبی اور بینش شہودی کے دلدادہ تھے۔ ۱۲

علامہ طباطبائی اپنے ایک شاگرد سے فرماتے ہیں کہ ان کے استاد آیت اللہ قاضی کے بیانات اتنے حیرت انگیز اور فرحت بخش ہوتے تھے کہ دل پر نقش ہوجاتے تھے ،سکون قلب حاصل ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب زندگی میں کوئی غم ہی نہیں ہے۔ ۱۳

آیت اللہ قاضی اپنے شاگردوں کو شرعی اہمیتوں کے لحاظ سے باطنی آداب کی رعایت اور حضور قلب کے ساتھ ادائیگی نماز اور عرفانی واخلاقی احکام کی پابندی وپیروی کا درس دیتے تھے اور ان کے نفوس کی ایسی نیابت کرتے تھے کہ ان میں مواعظ حسنہ کے قبولیت کی صلاحیت پیدا ہوجائے ۔ اپنے شاگردوں کو سمجھاتے تھے کہ جب بھی حالت نماز وقرائت قرآن یاذکروفکر کے دوران مسجد میں کچھ محسوس کرو یا کسی کرامت کا مشاہدہ کرو،تو بغیر اس طرف توجہ کئے اپنی عبادت جاری رکھو۔ ۱۴

علاّمہ طباطبائی نقل کرتے ہیں کہ میں ایک دن مسجد کوفہ میں بیٹھا ہوا مصروف ذکر تھا کہ میرے داہنی سمت حور بہشت ایک جام شربت لئے مجھے پیش کررہی ہے، میں نے چاہا اس کی طرف توجہ کروں، مگر اپنے استاد کی وہ ہدایت یاد آگئی، لہٰذا آنکھ بند کرکے رخ پھیر لیا۔ وہ حور اٹھی اور میرے بائیں طرف سے مجھے جام شربت پیش کیا، میں نے پھر بھی توجہ نہ کی، یہاں تک کہ وہ حور غائب ہوگئی۔ اس کے بعد سے میں جب بھی اس طرح کا منظر یادکرتاہوں تو اپنی آزادی کا احساس کرتا ہوں۔ ۱۵ اسی طرح آپ نے ایک اورواقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں نجف میں آیت اللہ قاضی کے زیر تربیت تھا، صبح کے وقت چھت پر مصلئ عبادت پر بیٹھا ہوا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ دولوگ میرے سامنے بیٹھے ہیں،ان میں سے ایک حضرت ادریسؑ اور دوسرے میرے بھائی سید محمد حسن تھے۔حضرت ادریس میرے ساتھ محوگفتگو تھے،

مگر اس طرح سے کہ اپنی گفتگو کا القاء میرے بھائی پر کرتے تھے اور مجھے اپنے بھائی کی آواز میں ان کا جواب سنائی دیتا تھا۔ ۱۶؎ اس طرح کے حالات کی تائید میں آیت اللہ بروجردی فرماتے ہیں کہ میرے استاد آخوند کاشی جو ایک باکمال شخصیت کے مالک تھے فرماتے تھے، کہ میں فرشتوں کو آسمان میں اڑتا ہوا دیکھتا ہوں۔ ۱۷؎

علاّمہ طباطبائی ایک اور جگہ بیان فرماتے ہیں: جب میں نجف میں اپنے استاد آیت اللہ قاضی کے پاس رہا کرتا تھا۔ ایک روز چشم تصور میں علی ابن جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہونچا اور ان کے اتنے نزدیک پہونچ گیا کہ مجھے ان کی سانس کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ۱۸؎

ہاں! یہ قرب خدا کی ان منزلوں پر فائز تھے کہ ان کے لئے ملکوت کے در کھل گئے تھے اور بعض ایسی نشانیاں، جو دوسروں پر مخفی رہنے والی ہیں، ان پر کھل جاتی تھیں۔ یہ اس لئے تھا کہ علاّمہ نے تہذیب نفس اور تزکیۂ روح فرمایا تھا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق کہ جو خود علاّمہ نے کسی جگہ نقل کیا ہے کہ اگر شیطان آدم کے دل کے آس پاس گردش نہ کرے تو حتماً وہ زمین وآسمان کے ملکوت کو دیکھتا۔ یہ وہ مفسر ہے، جو اس آیت'' والّذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وانّ اللّٰہ لمع المحسنین"۔۱۹؎ کا مصداق اور ان بندوں میں سے ہے، جو لطف خدا سے کشف وشہود کی منازل طے کرتا ہے۔

عرفان عملی میں علاّمہ طباطبائی کو وہ مقام حاصل تھا کہ آپ ہر شخص کا اس کی واقعیت سمیت مشاہدہ کر لیتے تھے ۲۰؎

علاّمہ اپنی زندگی کے جملہ امور میں صرف خدا کو اپنا مقصد جانتے تھے جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے خدا کو عرفانی آرزؤں کی معراج قرار دیا ہے اور دعائے کمیل میں فرمایا ہے کہ'' یاغایہ آمال العارفین'' وہ درحقیقت اس صفت کے مصداق تھے، یہاں تک کہ کبھی تحقیقی کاوشوں میں بھی وہ یاد خدا سے غافل نہیں رہتے تھے۔

آپ کے اخلاقیات بھی آپ کی نفوذ باطنی اور بصیرت ضمیر، حقیقت سیر وسلوک اور وصول حقائق عالم ملکوت کی عکاسی کرتے تھے۔ استاد شہید مطہری تفسیر المیزان کے بارے میں فرماتے ہیں: تفسیر میزان محض فکری نتیجہ نہیں ہے، بلکہ میرا ماننا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غیبی الھام کا نتیجہ ہے۔ ایسا بہت کم ہے کہ میرے سامنے دینی اور اسلامی مسائل آتے ہوں اور مجھے اس کا حل تفسیر میزان میں نہ

ملا ہو۔ ۲۱

علاّمہ طباطبائی کی عرفانی تحقیقات:

آپ علمائے حقیقی کے تئیں بے پناہ احترام کے قائل تھے۔ زہد، تصفیہ باطن اور ریاضت شرعی کے سبب ملاّ صدرا کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ فارابی کے نظریات کی ستائش فرماتے اور کہتے تھے کہ اشراقی شہود وبرہان کے امتزاج کو ابن حکیم کے آثار میں دیکھا جاسکتا ہے۔ علامہ نے ابن عربی کے بعض تفکرات کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ ۲۲

ملاّ صدرا کے تمام نظریات سے آپ متفق نہیں تھے، بلکہ اس اعتراف کے ساتھ کہ وہ ایک عظیم انسان تھے، ان کی بعض آرا پر تنقید بھی کی ہے اور استفادہ بھی کیا۔ آپ نے ملاّ صدرا کے بارے میں فرمایا کہ ان کے اکثر مباحث کی بنیاد عقل وکشف کے اتحاد پر مبنی تھی اور فکری تزکیۂ ،اور سیر وسلوک سے جنم لیتی تھی۔

اسی طرح آپ نے علی مدرس زنوزی (۱۳۰۷۔۱۲۳۴ہجری) ،صاحب بدایع الحکم، کے حواشی اور تعلیقات کو جو تہران میں فضل اللہ آستیانی کے پاس تھی، دیکھا۔ یہ حواشی اور تعلیقات اپنے آپ میں ایک رسالہ ہیں۔ علاّمہ اس حکیم کے عرفانی نظریات کے معترف تھے اور ''ممکن'' اور ''واجب'' سے متعلق ایک مباحثہ میں آپ نے صاحب بدایع کے نظریۂ کی تائید فرمائی ہے۔ ۲۳

علاّمہ طباطبائی، سید بن طاؤس کی بے پناہ عظمتوں کے بھی قائل تھے اور ان کی کتاب ''اقبال'' کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اس طرح سید بحر العلوم کے علمی وعملی سلوک کو سراہتے تھے۔ سید بحر العلوم سے منسوب رسالہ سیر وسلوک کو بہت اہمیت دیتے تھے اور شاگردوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دلاتے تھے اور خود اپنے منتخب شاگردوں کو اسے درس دیتے تھے۔

اس بیش قیمت کتاب کا ایک نسخہ ابو القاسم خوانساری (استاد ریاضی عماریہ) کے پاس نجف میں موجود تھا، جس کے ذریعہ علاّمہ طباطبائی نے ایک نمونہ کی تصحیح اور استنساخ کیا ہے اور علاّمہ نے اس کے بارے میں یہ فرمایا: ہمارے استاد آیت اللہ قاضی فرماتے تھے کہ میں نے سیر وسلوک پر اس طرح کا کوئی اور رسالہ سوائے رسالہ سید بحر العلوم کے نہیں دیکھا۔ ۲۴

ادبیات عرفانی کی بہترین کتاب 'المراقبات' ہے، علاّمہ طباطبائی نے اس کتاب پر تقریظ لکھی،

جس کی ابتداء کچھ یوں ہے :

''اما بعد بدان کہ بااین خط کہ بر کتاب ''اعمال السنہ'' نوشتہ، حجت ونمونہ آشکار آیت اللہ حاج میرزا جواد آقا ملکی تبریزی قدس اللہ روحہ حاشیہ می زنم ، قصد ستایش این کتاب گرانقدر قدر یا تعریف از مؤلف بزرگوار آن را ندارم، چہ این کتاب خود بدون شک دریایی پر از در وگوہر است کہ سنگینی آن بہ سنگ وپیمانہ نمی آید وآن نویسندہ خود بدون شک دانشمند بلند پایہ ای است کہ ارزش و قدرش را با متر ووجب نمی توان اندازہ گرفت... بلکہ منظور من از نوشتن این چند سطر آن است کہ برادران عزیز وبی آلایشم را با بعضی از تذکراتی کہ در آن است مواجہ کنم ویادآوری مومنان را بہرہ مندی سازد''.

اسی طرح شیخ محمد حسین اصفہانی معروف کمپانی (استاد علامہ طباطبائی) اور سید احمد کربلائی کے بیچ عرفانی مکاتبات پر علاّمہ طباطبائی نے زیرنویس کا اضافہ کیا ہے۔ علامہ حسن زادہ آملی نے ان مکاتبات کی نسخہ سازی کی ہے، جوشہید قدوس کے یاد نامہ میں درج ہے۔ ۲۵

علاّمہ طباطبائی ایک مکاتبات کے تعارف میں لکھتے ہیں: این نوشتار در معنای بیتی از ابیات شیخ عطار جریان یافتہ مقتضای الکلام یجر الکلام دو مبنائی معروف حکما وعرفا را کہ ہر یک از این دو بزرگوار بہ تقویت یکی از آنہا پرداختند ودر روشن ساختن مطلوب استفراغ وسع کامل فرمودہ اند۔ نظر بہ نفاست مطلب ودقت ، بحث خالی از اغلاق وغموض نبود بہ غرض حفظ آثار بزرگان وقضای حق اخذ وتربیت این بندہ ناچیز محمد حسین طباطبائی در اوراق چند بہ نام تذییلات ومحاکمات آوردہ ودر روشن ساختن حق مطلب کوتاہی نکردم۔ ۲۶

حوالہ جات:

۱۔ علاّمہ سید محمد حسین حسینی تہرانی، مہر تابان، ص ۴۷۔
۲۔ شہید مرتضی مطہری، امامت ورہبری، ص ۵۵
۳۔ ایضاً، ص ۲۱۳
۴۔ اسرار الشہود، ص ۱۴
۵۔ مجلّہ نور علم، دورہ سوم، شمارہ ۹، ص ۶۸
۶۔ مجلّہ زن روز، شمارہ ۸۹۲، شنبہ، ۲۹ آبان، ۱۳۶۱ھ

۷۔ کیہان اندیشہ، شمارہ مسلسل ۲۶،ص ۹

۸۔مجلّہ زن روز ہمان

۹۔درباره این عالم نامدار نگاه کنید به مقاله نگارنده درمجلّه پاسدار اسلام، آبان ماه،۱۲۵۷ھ،تحت عنوان نامداری ناشناختہ

۱۰۔آئینہ عرفان ،ویژه دھمین سالگرده رحلت علاّمہ طباطبائی، آبان ماه، ۱۳۷۰ھ

۱۱۔یادبود یادواره علامہ طباطبائی درکازرون، بہ کوشش منوچہر مظر وفیان،ص ۱۱۲۔۱۱۱

۱۲۔آئینہ عرفان ،ص ۳۸

۱۳۔حسن ممدوحی ،مقالہ ابتکارات علمی علامہ طباطبائی ، ہمان ماخذ ،ص ۴۶

۱۴۔مہرتابان،ص ۱۹

۱۵۔ایضاً

۱۶۔علامہ سید محمد حسین حسینی تہرانی، رسالہ لب اللباب ،ص ۹۱و۹۲

۱۷۔یادہا ویادگارہا، بہ نقل از مہرتابان،ص ۲۱۹

۱۸۔مکتب اسلام ، سال ۲۱، شمارہ ۱۰،ص ۶۷

۱۹۔قرآن ، سوره عنکبوت، آیہ ۶۹

۲۰۔مقالہ علامہ حسن زاده آملی ، کیہان اندیشہ، شمارہ مسلسل ۲۶،ص ۶

۲۱۔شہید مطہری ،حق وباطل ،ص ۸۹۔ ۹۰

۲۲۔ماخوذ از بیانات آیت اللہ جوادی آملی ، مندرج درمجلّہ شاہد، شمارہ ۸۴،ص ۴۶

۲۳۔ہزار و یک نکتہ ،ص ۱۹۸و ۶۱۰

۲۴۔چہ باید کرد ،ترجمہ وتنظیمی ویژه از مراقب حاج میرزا جواد ملکی تبریزی ، ترجمہ محمد تحریر چی، مقدمہ علاّمہ،ص ۵۳

۲۵۔یادنامہ شہید آیت اللہ قدوسی ،ص ۲۶۹۔ ۳۴۷۔

۲۶۔ایضاً۔

عرفان وتصوف قرآن اور حدیث کی روشنی میں

نسرین توکلی، دانشگاہ پیام نور، تہران

زیر نظر مقالہ کا مقصد قرآن اور اہلبیتؑ کے حوالہ سے عرفان وتصوف کا مطالعہ ہے، اور اس کا اسلوب تحقیق متعلقہ کتب پر مبنی ہے۔تحقیقی مراحل سے گزرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ قرآن اور احادیث وروایات اسلامی میں موجودعرفانی پہلوؤں کا مطالبہ وتجزیہ کیا جائے اس کے ساتھ ہی ساتھ عرفان وتصوف اور قرآنی آیات و احادیث کے درمیان جو رابطہ موجود ہے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو نگاہ میں رکھا جائے کہ عرفاء ابتداء ہی سے قرآنی تعلیمات سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ مقالہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عرفان خداشناسی اور اس کی معرفت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی دل کی آنکھ سے خدا کو دیکھے عاشقانہ اس کی عبادت کرے تو وہ عارف ہوجاتا ہے، اور اب وہ اپنے عرفان کے ذریعہ متصوفانہ خصوصیات کی آرزو کرتا ہے کیونکہ قلب عارف میں فقط خدا بستا ہے ، اور کوئی نہیں !

عرفان وتصوف کی جڑیں اور اس کی بنیاد دراصل قرآنی آیات ،احادیث پیغمبرؐ اور اقوال ائمہؑ پر مبنی ہیں۔ بغیر قرآن اوراسلامی روایات کے کچھ حاصل نہیں ہوتا! جس کا محققین بھی اعتراف کرتے ہیں البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ غیر اسلامی عقائد ونظریات نے اسلامی عرفان اور تصوف پر کم وبیش اپنا اثر مرتب کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے ، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل عرفان اورتصوف اسلامی نے اپنی اصلیت وہیئت کو پوری طرح محفوظ رکھا ہے۔

قرآنی آیات اوراسلامی روایات اور اسلامی تربیت کے حامل بزرگوں کے احوال وآثار سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ زہدو وعبادت بے روح نہیں ہیں ، بلکہ معنی مفہوم کے اعتبار سے غیرمعمولی اوج وعظمت کے حامل ہیں۔ رسول اکرمؐ ،امیر المومنین حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ اطہارؑ کی حیات، ان کے کلمات وارشادات ومناجات درحقیقت معنی ومفہوم کے اعتبار سے عرفانی علامت اور الٰہی عظمت سے لبریز ہیں عرفانی علامات اور آوازۂ الوہیت میں معنی ومطالب سے پُر ہیں۔[۱]

قرآن کریم کی آیات عمیق ترین نظری عرفان اورعملی تعلیمات کی ضامن ہیں عرفانی علامتوں

کی حامل ہیں۔ تصوف اور اسلامی عرفان نظریاتی طور پر قرآن مجید، سیرت واحادیث نبوی، سیر وعمل اصحاب منتجبین، سیرت آئمہ اور بزرگان دین، اقوال پیشوایان دین اور مشائخ اور ان کے عمل اور تعلیمات میں موجود ہے۔ بارگاہ عالیہ الٰہی میں حاضری کا ذکر قرآن میں باربار آیا ہیفقط اتنا ہی بلکہ نام الٰہی اور اس کی عرفانی علامت کی نشاندہی کی تکرار بھی دکھائی دیتی ہے اور انسانی نفس، اس کی خصوصیت نیز تزکیہ وتہذیب نفس کی طرف قرآن میں واضح اشارے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ خصوصیت کے ساتھ نفس اور اس کے خصوصایت راہ تزکیۂ وتہذیب نفس کا ذکر اس الٰہی کتاب کی آیات میں وارد ہوا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اللّٰہ نورالسّموت والارض (خدا تو آسمانوں اور زمین کا نور ہے) ۲ھو الاوّل والاٰخر والظّاھر والباطن (وہی سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے اور (اپنی قدرت سے) سب پر ظاہر اور (نگاہوں سے) پوشیدہ ہے) ۳

والٰھکم الٰہٌ واحد لااله الاّ ھو (تمہارا معبودتو (وہی) یکتا ہے، اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں) ۴کلّ من علیھا فان (وہ سب جو (زمین پر) ہیں فنا ہونے والے ہیں)

ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس به نفسهٗ ج ونحن اقرب الیه من حبل الورید۔(بیشک! ہم ہی نے انسان کوخلق کیا اور ہم اس کے نفس کے وسوسہ سے آگاہ ہیں اور ہم اس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں)۶

فاینما تولّوا فثمّ وجه اللّٰہ (جس طرف چاہو رخ کرلو، وہیں خدا کا سامنا ہے) ۷

یھدی اللّٰہ لنورہٖ من یّشاء (خدا اپنے نور کی طرف جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے) ۸

پیغمبر اکرمؐ کی دعاؤں اور مناجاتوں میں معنی ومفہوم کی بلندی اور اصل عرفان وخالص اسلام کی جھلک دکھائی دیتی ہے بعد از رسولؐ پیشوائے عارفین حضرت علیؑ کی نہج البلاغہ میں موجود دعائیں اور مناجاتیں سب کی سب اسلامی عرفان کے بیان سے پر ہیں۔

برطانیہ کے مشہور ومعروف فلسفی وماہر علوم مشرقیات نیکولسن (Nicholson)اور فرانس کے ماسینیون، جیسے مستشرق نے اسلامی علوم ومعارف کا بھرپور مطالعہ کیا ہیاور یہ لوگ واضح طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ اسلامی عرفان کا اصل سرچشمہ قرآن وسنّت ہے۔

تقرب الٰہی کا اہم وسیلہ ہے۔

قرآنی آیات میں تصوف موجود ہے۔ ابتدائی دور کے صوفیاء کرام کی نظر میں قرآن صرف کلمات خداوندی نہیں تھا بلکہ اس کو تقرب الٰہی کا وسیلہ بھی تسلیم کیا جاتا تھا اور عبادت نیز قرآن کے مختلف حصوں کے گہرے مطالعے کے ذریعے بالخصوص عروج معراج پر مشتمل مرموز آیات کی روشنی میں صوفیاء حضرات یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ اپنی ذات سے پیغمبر کے صوفیانہ حالات کو دنیا والوں کے سامنے پیش کریں۔۹

راہ عرفان :

راہ عرفان ایک واضح وروشن راستہ ہے، جس کی آخری منزل معرفت خداوندی ہے۔ امام عارفین امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: اعرفوا اللّٰه باللّٰه (خدا سے (خود) خدا سے پہچانو۱۰ اور خود خدا کو مخاطب کرکے یہ کہا: یا من دلّ علی ذاتہٖ بذاتہٖ (اے وہ کہ جو خود اپنی ذات (وجود) سے اپنی ذات (وجود) پر دلالت کرتا ہے۔(مفاتیح الجناں، دعائے صباح)

اس منزل پر عارف مرحلۂ اوّل میں راہ فنا پر گامزن ہوتا ہے اور اس تجلّی میں، اگر عنایت ازلی شامل رہی، تو منزل حب اللہ حاصل ہوتی ہے۔ اور اب جو وہ خوف خدا میں ریاضت کے ساتھ، دنیا سے منہ موڑ کر راہ عرفان وتصوف میں آگے بڑھتا ہے تو کسی مقام پر قناعت نہیں کرتا، قدم عشق بڑھاتے ہوئے سیر (عرفانی) کرتا ہے اور اس سفر میں اس کا مبدا عشق حق ہوتا ہے، اور اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انوار تجلیات میں قدم بڑھائے اور یہ سنے''تقدّم'' یہاں تک کہ اسماء اور صفات مقام احدیت میں اس کے دل پر منتظمانہ طور پر تجلّی کرتے ہیں (روشن ہوجاتے ہیں)، اس طرح اس مقام احدیت کلی پر اسم اعظم کا ظہور ہوتا ہے، کہ یہ اسم خدا ہے، اور اسی مقام پر اعرفوا اللہ باللہ یعنی اللہ کو اللہ کی ذات سے پہچاننے کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔۱۱

معرفت وشناخت عرفانی استقامت کے ساتھ فیوض الٰہی تک بدولت سر چشمہ (برکات اور ہدایت) پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ امام سجادؑ نے اپنی مناجات میں فرمایا ہے: بک عرفتک وانت دللتنی علیک ودعوتنی الیک ولولا انت لم ادرماانت (میں نے تجھے خود تیرے واسطے سے پہچانا اور تو نے خود میری راہنمائی اپنی طرف سے کردی اور مجھے اپنی طرف بلایا اور اگر تو نہ ہوتا تو میں

تجھے کبھی نہ پہچانتا) ۱۲؎ اسی طرح امام حسینؑ نے بھی فرمایا ہے: کیف یستدل علیک بمافی وجودہ مفتقر الیک ۱۳؎ (میں تجھ سے کیسے استدلال کروں ، کیونکہ میں خود اپنے وجود کے لئے تیرا محتاج ہوں۔)

عارف جب کمال معرفت تک پہنچ جاتا ہے تو اسکے سر کے اردگرد ہالہ انوار الٰہی قرار پاتا ہے، اور وہ حالت وجدان میں اس سے لمس حاصل کرتا ہے اور کہتا ہے :

فالحقنی بنور عزّک الّابھج فاکون لک عارفاً وعن سواک منحرفاً (پروردگار ! مجھے اپنی عزت درخشاں کے نور سے ملحق کرلے تاکہ میں تیرا عارف ہوجاؤں اور تیرے سوا کسی اور کی طرف نہ لوٹوں) الٰھی ھب لی کمال الانقطاع الیک (الٰہی ! مجھے اپنی جدائی سے حد کمال تک پہونچانا۔ مفاتیح الجناں، مناجات شعبانیہ) کمال انقطاع ، اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان یاد خدا میں ہر چیز کو فراموش کردیتا ہے (اور بس اسی کی یاد میں لگ جاتا ہے)۔ یہ 'نسیان مقدس' ہے۔ اگر انسان ہر ایک چیز کو فراموش کردے اور یاد خدا میں لگ جائے تو دراصل وہ ہر چیز کی فکر کرنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ (خدا) تو تمام چیزوں کا خالق ہے، وہی سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے ھو الاوّل والآخر والظّاھر و الباطن (سورہ الحدید، آیت ۳) عارف اسی وقت جلال حق کا مزہ چکھتا ہے ۱۴؎ اس طرح عرفان دل عارف کو نورانی بنادیتا ہے اور وہ جمال الٰہی کی زیبائی کا مشاہدہ کرتا ہے، اور عالم وجدان میں اس کے سامنے سرتسلیم جھکادیتا ہے اور اس کے (خدا کے)حضور میں مشغول عبادت ہوجاتا ہے۔

عرفان عارف اور خدا کے درمیان حجاب کا بالکل قائل نہیں ہے، وہ تو (عالم وجدان میں) اس کے جمال کی زیبائی کو محسوس کرتا ہے۔ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ عقلانی اور اسی طرح کی کوئی دوسری چیز سالک حقیقی اوراس کے آخری مقصد کے درمیان پردہ وحجاب بن جائے مقصد کمال مطلق کا مقصد بھی یہی ہے۔ ۱۵؎

ایک بار ایک شخص امیر المومنین حضرت علیؑ کے پاس آیا اور اس نے کہا : آپ جس خدا کی عبادت کرتے ہیں ، کیا دوران عبادت آپ نے اسے دیکھا ہے۔؟

امام عارفینؑ نے فرمایا : میں اس رب کی عبادت کیسے کروں گا ، جسے میں نے دیکھا تک نہیں؟

اس نے کہا: آپ اسے کیونکر دیکھتے ہیں؟

امام نے فرمایا۔ لا تراه العیون بمشاهده العیان ولکن تدرکه القلوب بحقایق الایمان (دیکھنے والے دیکھتے وقت آنکھوں سے اس کا مشاہدہ نہیں کرتے ، بلکہ ان کے قلب ایمان کی حقیقت سے اسے دیکھتے ہیں)

مولای متقیان کی یہ عبادت شہود ورویت پر منحی ہے جو عرفانی وایمان کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

جب انسان آیات الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ یہ سب عظمت خدا کی مظہر ہیں۔ اور وہ خود وجود وزندگی ،علم، ارادے، محبت وعشق اور ان تمام صفات اور افعال کو، جو اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں ،دیکھتا ہے کہ سب کے سب کمال زیبائی ، جلال وکمال ، حیات،علم اور قدرت ہیں، سب میں خالق کی قدرت کارفرما ہے ۔ اور یہ انسان (عارف) خود اپنے کو نور کے دریا سے متصل پاتا ہے۔ اور ہر جگہ نور ہی نور دیکھتا ہے، کہ سب کا سب نور خدا ہے۔

سرچشمۂ عرفان وتصوّف :

باوجود ان شبہات کے کہ عرفان،عرفان ہندی یا عرفان مسیحی سے ،مستعار ہے، وہ اپنی اساس میں خالصاً اسلامی ہے۔ اس کا اصل سرچشمہ قرآنی اشارات، حدیث اور سیرت رسولؐ اور ان کے صحابہ(منتجبین اور آئمہ) کا طرز زندگی اوران کی اقوال ہیں ۱۶؎ آموزش ادیان اور دوسرے مکاتب فکر کے اثرات ،خصوصاً تکوین عرفان نظری پر، سے قطع نظرنہیں کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ تاثیر اس حد تک بھی نہیں ہے کہ کہہ دیا جائے کہ عرفان اسلامی انہیں ادیان ومکاتب کی پیدوار وماحاصل ہے۔ ۱۷؎

چنانچہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ (سرچشمہ)عرفان خود انسان کی ذات میں پنہاں ہے، اور اس کا آغاز خود فطرت اور خلقت انسان کے ساتھ ہوا۔ اور ہر وہ کہ جو صاف تر فطرت کا حامل ہوتا ہے، اس میں جلوہ ہائے عرفانی زیادہ کارفرماہوتے ہیں۔ انسان کا دل آئینہ کی طرح ہوتا ہے ، ابتدائے تابش سے اس پر نور الٰہی کا پرتو پڑتا نظر آرہا ہے ۔ اب اگر (آئینہ دل کو الایشوں سے بچا کر رکھا جائے) اور اس پرصیقل ہوتو وہ ، اوربھی زیادہ (پرتو الٰہی کا) حامل ہوجاتا ہے ۔ یہاں تک کہ انوار الٰہی میں غرق ہوجاتا ہے۔

دین کی روسے ہر انسان دنیا میں فطرت توحید پر پیداہوتا ہے ، اور اس میں ولولۂ خداشناسی

اور خدا پرستی نہاں ہوتا ہے، یہ غلط ماحولیاتی عوامل اور تربیتی طریقے ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان کے دل میں اندھیرے کا گذر ہوتا ہے، ورنہ اگر وہ فطرت الٰہی پر قائم رہتا تو حسن باطنی کیا کیا شگوفے کھلاتا۔

امام حسینؑ نے خدا کی نعمتوں کو، جو خود انسان کے وجود میں پائی جاتی ہیں، شمار کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ حتی اذا اکتملت فطرتی واعتدلّت مرتی اوجبت علیّ حجّتک بان الهمتنی معرفتک وروعتی بعجائب حکمتک (جب تو نے ہماری فطرت کمال عطا کیا، اور ہمارا مزاج معتدل قرار دیا (تو) ہم پر تیری حجت واجب قرار پائی، اس طرح تو نے اپنی معرفت کے ضمن میں ہم پر الہام فرمایا اور تو نے عجائب حکمت کو بیان فرمایا (تا کہ ہم تجھے پہچانیں) اور اس معرفت کے ساتھ تیری عبادت کریں۔ (مفاتح الجنان، دعائے عرفہ)

ارشاد رب العزت ہے: یوتی الحکمة مین یّشاء ومن یوتی الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً (خدا جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت عطا کی، اسے بہت سا خیر بھی عطا کیا)[۱۸]

ہدایت اولیہ خداوند کریم کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کے بعد اس ہدایت کے مختلف پہلوؤں میں کارسازی ہدایت یافتہ عاشق کی ہوتی ہے، ورنہ عاشق کی سعی نتیجتاً اپنے مقام تک نہیں پہونچتی ہے چنانچہ دعائے عرفہ (مفاتح الجناں) میں وارد ہوا ہے: یا من هدانی للایمان قبل ان اعرف شکر الامتنان (اے پروردگار! اے وہ کہ جس نے مجھے ہدایت کی ایمان کی، قبل اس کے میں نے نعمتوں پر شکر کرنا سیکھا)۔

عارف کون ہے؟

عرفان سے مرادخدا کی معرفتِ قلبی، خداشناسی اور اس کی عاشقانہ عبادت ہے۔ عرفان وہ مقام بلند وبالا ہے جہاں تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہوتی اور جو بھی معرفت سے بہرہ مند ہوا، اس نے راہ نجات پالیا، وہ صاف وشفّاف دل اور نیک اعمال کا خواہاں ہوا (اور انہیں انجام بھی دیا) یہاں تک کہ وہ مقام قرب تک جاپہونچا۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے: یوم لاینفع مال ولابنون الاّ من اتیٰ اللّٰه بقلبٍ سلیم (وہ

دن کہ جب نہ تو مال ہی کچھ کام آئے گا اور نہ لڑکے بالے، مگر جو شخص خدا کے سامنے (گناہوں سے) پاک دل لئے ہوئے حاضر ہوگا (وہ فائدہ میں رہے گا) ۱۹؎

کیا عارفین کے بزرگ پیشوا امام علیؑ کی عبادت شاہدانہ تھی، کہ عابدانہ، زاہدانہ تھی یا تاجرانہ یا اسی طرز پر کسی اور طرح کی؟ آپ منظر شہود میں ہر چیز پر شاہد کامل تھے، نہ تو خود اپنی صوابدید سے، اور نہ دوسروں کے میلان طبع کی رو سے (بلکہ بس تابع ایمان ومرضی الٰہی)۔ ہر موقع پر جہاں کہیں بھی آپ مشاہدہ فرماتے تھے تو توجہ کے ساتھ۔ اگر ہر موقع پر ان کا مشاہدہ توجہ کے ساتھ نہ ہوتا تو یہ بے توجہی ہوتی ۲۰؎ (لہٰذا علیؑ کی عبادت ویسی ہی تھی، جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا ہے)۔

قلب عارف میں سوائے خدا کے اورکوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ امام عارفین حضرت علیؑ نے اپنی دعامیں ارشادفرمایا ہے: یا غایة آمال العارفین یعنی اے عارفین کے مقصد آرزو کی انتہا (مفاتیح الجناں، دعائے کمیل)

عارف کی وابستگی اور اس کی دلبستگی صرف خدا سے ہوتی ہے، اس کے اس سرور اور خوشی کو حضرت علیؑ نے مناجات میں یوں بیان کیا ہے۔ ''یا سرور العارفین'' (اے عارفوں کے دل کی خوشی۔ مفاتیح الجناں، دعائے جوشن کبیر، شمار ۵۲) عارف ہمیشہ عشق خدا سے سرشار رہتا ہے، اپنے دل وجان سے۔ وہ اس میں کبھی ذرا سی بھی غفلت نہیں برتتا ہے، وہ خدا سے دور نہیں رہتا: یامن لا یبعد عن قلوب العارفین (اے وہ جو عارفوں کے قلوب سے دور نہیں رہتا۔ مفاتح الجناں، دعائے جوشن کبیر شمارہ ۶۳)۔

عارف کا دل نور الٰہی سے پرلبریز بلکہ انوار الٰہیہ میں غرق ہوتا ہے۔ امام سجادؑ نے فرمایا ہے۔ وسبحات وجهه لقلوب عارفيه شانفه (انوار الٰہیہ عارفین کے دلوں کو جلاء بخشتے ہیں اور انہیں روشن ومنور کرتے ہیں)۔

عارف کوسوائے یاد الٰہی کے کسی چیز سے سکون نہیں ملتا، اور نہ وہ کسی چیز سے راضی ہوتا ہے، فقط ذکر خدا اور یاد الٰہی کے ذریعہ ہی اس کو سکون نصیب ہوتا ہے اور وہ راضی ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے الّذین آمنوا وتطمئن قلوبهم بذكرالله الا بذكر الله تطمئن القلوب۔

عارف وہ ہے جو براہ یاد اللہ وحب اللہ حق وعرفان سے ملحق ہوجائے اورمحبّ اللہ کی شناخت حاصل کرے۔ عارف پست صفات بشری پر واضح طور پرقابو پاکر معرفت خدا حاصل کرلیتا ہے، اور

ساتھ ہی خود اپنے میں صفات عالیہ کا احیاء کرتا ہے اور عظمت وبزرگی صرف ذات خدا میں پاتا ہے اور اسے دوسرے سب چھوٹے نظر آتے ہیں: حضرت علیؑ نے جنگ صفین کے دوران ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ کسی نے بصورت مبالغہ آرائی تعریف کی تو آپؑ نے کہا: ان من حق عظم جلال اللّٰه فی نفسه وجل موضعه من قلبه ان یصغر عندهٔ لعظم ذٰلک کل ماسواه (وہ کہ جس کے نزدیک جلالت خدا بااہمیت ہے اور اس کے دل میں اس کا مرتبہ بلند ہے، وہ اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے، خدا اس کے علاوہ ہر چیز کو کمتر شمار کرے۔) ۲۱

عارف فریفتۂ کمال اور عظمت جلال ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود اپنے وجود بے پایاں پر نظر کرتا ہے تو نہ تو اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو بلکہ۔ پہچانتا ہے تو فقط خدا کو۔ وہ پیشگاہ عظمت اور جلال کبریائی میں محو حیرت ہوجاتا ہے۔ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے: فلسفنا نعلم کنه عظمتک الاّ نعلم انّک حی قیّوم (پروردگار! تیری اصل عظمت کو تو میں نہیں پہچانتا مگر یہ جانتا ہوں کہ بیشک تو زندہ اور پائندہ ہستی ہے۔) ۲۲

عارف جب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے: سارا عالم اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، سب ہی چاہے بخوشی، چاہے طوعاً وکرھاً، اس کے سامنے سرنگوں ہیں ... وله اسلم من فی السّمٰوٰت والارض طوعاً وکرهاً والیه یرجعون (ہر وہ کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب نے خوشی خوشی یا زبردستی اس کے آگے سر تسلیم خم کردئے ہیں۔ اور آخر سب اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے) ۲۳

محور عرفان:

محور عرفان خدا کو پہچاننا، اس کی معرفت حاصل کرنا اور اس کی احدیت پر ایمان رکھنا ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا: اوّل الدّین معرفتهٔ وکمال معرفتهٔ التّصدیق به وکمال التّصدیق به توحید ہ (دین کا پہلا (جز) اس کی معرفت ہے اور معرفت کا کمال اس کا یقین کرنا ہے۔ اور یقین کا کمال اس کی وحدانیت ہے۔) ۲۴

عرفان اسلامی میں وجود پائندہ اور پائیدار صرف ذات مقدس خدا ہے اور تمام موجودات اسی سے وابستہ ہیں، اور از خود ان کو استقامت پائداری حاصل نہیں ہے، کیونکہ ہر چیز اس کے (خدا کے)

قبضہ قدرت میں ہے۔قرآن کریم کہتا ہے : اللّٰہ لااله الاّ هو الحیّ القیّوم (خدا کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے، وہ زندہ و پائندہ ہے۔) ۲۵ اور یہ کہ یاعبادی الّذین امنوا انّ ارضی واسعةٌ فایّای فاعبدون (اے میرے صاحب ایمان بندو! میری زمین تو یقیناً کشادہ ہے،تو تم میری ہی عبادت کرو۔) ۲۶

اس طرح تمام موجودات پر حاکم خدا ہے کہ ہمیشگی کے ساتھ برقرار ہے۔قرآن کریم میں وارد ہوا ہے: او لم یکف بربّک انّی علی کل شئی شهیداً (کیا (تمہارے لئے)تمہارے رب کی طرف سے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ ہر شے پر شاہد ہے؟)

اگرکوئی کیفیت تجلی حق کا، جو ملک وملکوت میں ہے، بواسطہ مقدس ذات جو آسمانوں اور زمین میں خالق ومالک ہے، مشاہدہ حضور یہ یامکاشفہ قلبیہ ایمان حقیقی سے کرلے تو جونسبت حق کی خلق سے اورخلق کی حق سے ہے اس پر واہوجائے گی اور احساس ہستی (بھی) اور وہ کیفیت ظہور مشیت الٰہیہ بھی جو اس کے تعیّن وفنا میں ہے۔ اس طرح وہ علی ماهو علیه کا ادراک کرتا ہے۔ اور جان لیتا ہے کہ حق تعالیٰ تمام تر ممکنات اور حاصلات پر محیط ہے عارف ان سب کے ساتھ تمام موجودات کا مشاہدہ علم حضوری سے کرتا ہے ۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے کہا ہے:

مارایت شیئا الّارایت اللّٰه معه وقبله وفیه (میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی مگر اس طرح کہ اس کے ہمراہ (قدرت) خدا ہے،جو اس سے قبل اور اس میں ہے) ۲۷ اس طرح عارف وہ ہے جوحق کو مشاہدہ حضور یہ سے پہچانتا ہے ۔ ۲۸

اوربعض عارفین کہتے ہیں : مارایت شیئا الاّ رایت اللّٰه فیه یعنی نہیں دیکھا ہم نے کسی چیز کوسوائے قدرت خدا کے باطن ایک عالم ہے ، اور عارف عالم میں جس طرف بھی نظر کرتا ہے ، اسے ساراعالم آئینہ حق نظر آتا ہے ، اور اس طرح وہ عالم میں حق کو اشکار دیکھتا ہے۔ ۲۹

خالق ومخلوق

قرآن ہمیں خدا کو ، جس نے کائنات کوخلق کیا ہے، پہچنواتا ہے اور ہمیں ہرطرح سے بتاتا ہے کہ اس کی ذات مقدس ہر جگہ وہر چیز میں کارفرما ہے (اینما تولّوا فثمّ وجه اللّٰه (سورہ بقرہ، آیت ۱۱۵ یعنی جس طرف چاہو رخ کرلو ، وہیں خدا کا سامنا ہے ، یعنی وہ ہر جگہ موجود ہے ونحن

اقرب الیه منکم (اور ہم تم سے زیادہ تم سے نزدیک تر ہیں) ۳۰ھو الاوّل والآخر والظّاھر والباطن (وہی اول ہے اور (وہی) آخر اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن سورہ حدید، آیت ۳ اور ہر حال میں وہ باطن و ظاہر ہے۔ پس قرآنی آیات وتعلیمات کی روشنی میں وحدانیت کا مکمل تعارف حاصل کیا جاسکتا ہے جسے عام طور پر عوام تسلیم کرتے ہیں۔ ۳۱

عرفان اور اسلامی تصوف میں فقر و نیاز مندی مخلوقات واضح وروشن ہے، اور اس کے مقابلہ میں غناء و بے نیازی خالق اشکار ہے درحقیقت تمام خلائق اور ہم سب کے سب وجود مقدس کے محتاج ہیں ۔قرآن مجید میں ارشاد خداوند کریم ہے: یا ایّھا النّاس انتم الفقراء الی اللّٰه واللّٰه ھو الغنی الحمید(لوگو! تم سب کے سب (ہر وقت) خدا کے محتاج ہو اور (صرف) خدا ہی (سب سے) بے نیاز اور سزاوار حمد (وثنا) ہے ۳۲وانّه ھو اغنٰی واقنیٰ (اور وہ وہی ہے جو مالدار بناتا ہے اور سرمایۂ عطا کرتا ہے)۳۳امام حسنؑ نے اس کا مطلب بخوبی واضح طور پر یہ کہہ کر بیان کیا ہے کہ ایک طرف جلال خداوندی، دوسری طرف فقر (تہہ دستی) انسان، ایک طرف تمام تر احسان و (عطائے) نعمت اور دوسری طرف تمام تر احتیاج وتقسیر ہے: انت الّذی انعمت، انت الّذی احسنت ، انت الّذی اجملت، اناالّذی اسات ، انا الّذی اخطات ، انا الّذی ھممت (تو وہ ہے کہ جس نے نعمت عطا کی ہے، تو وہ ہے کہ جس نے نیکی کی، تو وہ ہے کہ جس نے زیبائی وخوش کرداری عطا کی، میں وہ ہوں کہ (جس نے) بدی کی ، میں وہ ہوں کہ (جس نے) خطا کی ، میں وہ ہوں کہ مشغول اہتمام خطا ہوا)۔

اور اس مقام پر حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے: مولائی یامولائی انت العظیم وانا الحقیر وھل یرحم الحقیر الاّ العظیم ، مولائی یا مولائی انت القوی اور انا الضّعیف وھل یرحم الضّعیف الا القوی (میرے مولا! اے میرے مولا! توبزرگ وباعظمت ہے اور میں حقیر ہوں ، اور حقیر پر کون رحم کرے گا، سوائے بزرگ وعظیم کے۔ میرے مولا! اے میرے مولا! تو قوی اور صاحب قوت ہے اور میں کمزور ہوں ، اور کمزور پر کون رحم کرے گا، سوائے قوی اور صاحب قوت کے)۔

مندرجہ بالا بیان آیات قرآنی اور دعائیں دلیل فقر ومحتاجیٔ بندہ بہ خالق وکردگار ہے۔

خدا سے محبت:

عشق اور جذبۂ عشق سارے جہاں میں ایک جاری وساری حقیقت ہے، کہ یہ تمام عناصر اور اجزائے جہاں پر بالادستی کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، یا کم از کم ایک ذاتی خاصیت کے عنوان کی حیثیت سے ۳۴

تقریباً سبھی صوفیاء اور عارفین عشق کو بطور صفت حق، اصل انسانیت، میزان سلامتی عقل، حساسیت اور وسیلۂ تہذیب اخلاق تسلیم کرتے ہیں۔عشق چاہے حقیقی ہو یا مجازی ذریعہ تہذیب اخلاق ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ کوئی بھی فرد عاشق ہونے سے قبل مال دوست، کنجوس، کم ہمت اور ڈرپوک ہوتا ہے، لیکن جب سلطان عشق اس کے ملک وجود میں خیمہ گاڑ دیتا ہے تو وہ بند جیب اور مہر بند اور مخفی مال کو وا کردیتا ہے اور ان تمام چیزوں کو مسلسل راہ معشوق میں نثار کرتا رہتا ہے، یا پھر جان وتن سے راہ عشق میں موت کا استقبال کرتا ہے، وہ اس (معشوق) کی چاہت میں سخت سے سخت بلا بھی آئے تو اس سے وہ ہرگز ہرگز خائف نہیں ہوتا۔ ۳۵

(جذبۂ) محبت وعشق پرہیزگار مومن کے دل میں خدا کی طرف سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کی بزرگی اور عظمت اس کے دل کو پرُ کردیتی ہے۔ اس کے بعد قلب وعارف میں اس کی رضا کی طلب پیدا ہوتی ہے۔محبت الٰہی کا ذکر بطور تمام محبتوں سے اعلٰی اور اولٰی کے ہوا ہے۔ حدیث قدسی میں خدا نے ارشادفرمایاہے: لایزال العبد یتقرّب الیّ بالنوافل، حتّیٰ اذا احببته، فادا احببته کنت سمعه الّذی یسمع به وبصره الّذی یبصره به، ولسانه الّذی ینطق به، یده الّذی یبطش به۔ (بندہ گمراہ نہیں ہوتا اگر وہ نماز ودعائے نافلہ کے ساتھ میرے قریب آئے، یہاں تک کہ جب میں اس کو دوست بنالیتاہوں تو نتیجتاً میں اوراس کی ایسی آنکھ چاہتاہوں کہ وہ میرے ذریعہ دیکھے اور اس کی ایسی زبان اور ہاتھ چاہتاہوں کہ وہ میرے توسط سے بولے اور پکڑے (اور اٹھائے) ۳۶

محبت الٰہی روح عارف کی غذا ہے، اور اس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہوتا ہے، چنانچہ خدا نے موسیٰؑ سے کہا: والقیت علیک محبّة منّی ولتصنع علیٰ عینی میں نے خود ہی تم پر یعنی تمہاری صورت پر محبوبیت ڈال دی ہے اور (دوسرے اس لئے کہ) تم میری نگہبانی میں پرورش کئے

جاؤ۔ ۳۷ سورہ مائدہ میں وارد ہوا ہے کہ یحبّھم ویحبّونہ (خدا) انہیں دوست رکھتا ہے اور یہ خدا کو دوست رکھتے ہیں۔ ۳۸ اس مقام پر خدا سے عشق کا، کہ وہ خدا سے محبت کا نتیجہ ہے، درک ہوتا ہے۔

جیسا کہ 'بحر الحقیقہ' میں وارد ہوا ہے، احمد غزالی نے کہا ہے: میرے دستور دوستی اور رغبت کے تحت میں تجھے چاہتا ہوں اور تو میری چاہت کے سبب، مجھے چاہے۔ میں نے تیری تعریف کی کہ تو مجھے پہچانے اور میں نے تیری ہدایت کی تا کہ تو میری وحدانیت کا گرویدہ ہوجائے اور اس دوستی کو میں نے تجھے ہدیہ کیا تا کہ تو میرا دوست رہے، اب میں تیرا دوست ہوں اور تو میرا۔ ۳۹

خدا سے عشق ومحبت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ انسان از خود یا خود اپنے ارادہ سے اس تک پہونچ جائے باوجود تمام کوشش وطلب کے انسان اگر چاہے بھی کہ ایسا ہوجائے تو بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ دوست دار خدا وہ ہوتا ہے جس کا دوست خدا خود ہوتا ہے۔

بایزید نے کہا ہے کہ میں نے خیال کیا کہ میں بدلے ہوئے بھیس میں اس کے لئے بدشگن ہوں، پھر میں نے یاد کیا کہ میں اسے پہچانتا ہوں اور وہ میرا دوست ہے، اور میں نے اس کی طلب کی۔ ۴۰ اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ اس کے ذکر سے میں آگاہ ہوں، اور میرے لئے اس کی معرفت ومحبت زیادہ مقدّم ہے بمقابلہ اس سے میری محبت واس کی معرفت کے اور (اسی طرح) میرے لئے اسکی طلب زیادہ مقدم ہے) بنسبت میری طرف سے اس کی طلب کے۔ ۴۰

امام سجادؑ نے فرمایا ہے: من ذالّذی ذاق حلاوۃ محبتک فرام منک بدلا (پروردگار!) آخر وہ کون ہے کہ جس نے تیری محبت کی حلاوت کو چکھ لیا ہو، پھر بھی تیرے بدلے کسی اور کو قبول کرے۔) محبان خدا اس کی محبت کی شیرنی کے عوض کوئی دوسری چیز قبول نہیں کرتے، خدا سے پیوست رہتے ہیں (اور) اسی سے عشق کرتے ہیں، اس سے گفتگو کرتے ہیں اور اس کی حمد وثنا کرتے ہیں۔

ابن عربی نے بیان کیا ہے: میرا دین دین اور خدا سے رغبت سے بالاتر نہیں ہے۔ محبت خلاصہ احوال روح نحل وملل ہے۔ ۴۱

محبت ولایتی ہے جو معشوق سے عاشق تک جاپہونچتی ہے اور عطائے باطن اس کا اسے مائل بہ جمال کرتا ہے۔ اور اس حال میں عاشق رضائے معشوق طلب کرتا ہے اوراس کے دیدار کا خواہاں ہوتا ہے، اور کسی اور سے اسے قرار ہی نہیں ملتا ہے اور اس کے ذکر کے ماسوا کسی بات سے اسے آرام

نہیں ملتا ۔ ارشاد رب العزت ہے۔ والّذین آمنوا اشدّ حبّا للّٰہ (وہ جو ایمان لائے، انہیں خدا سے شدید ترین محبت ہوتی ہے۔) ۴۲؎

اس گفتگو کے بعد ابن عربی کا یہ قول بھی ملاحظہ ہو کہ محبت درمیان محبّ ومحبوب حجاب ہے۔ ہر چند کہ محبت میں محبّ فنا ہوجاتا ہے، مگر وصل پالیتا ہے ۔ ۴۳؎

اس جگہ پر محبوب (خدا) ارشاد فرماتا ہے: یاایتها النّفس المطمئنه ارجعی الی ربّک راضیة مّرضیه فادخلی فی عبادی وادخلی جنّتی (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو خدا سے راضی ہے اور خدا تجھ سے راضی (خوش) ہے، پس میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔ ۴۴؎

محبت محبان خدا

محبان خدا کے دل میں جس قدر عشق ومحبت خدا جاگزیں ہوتی ہے، اتنا ہی وہ خلق خدا میں (قدرت) خدا کا نظارہ کرتے ہیں، اور وہ سب کے دوست ہوتے ہیں ۔لیکن اگر وہ عشق سے عاری ہوتے ہیں، تو ان کے نیک اعمال بھی بے وقعت ہوتے ہیں، کیونکہ اس کے بندوں سے محبت دراصل حب اللہ ہے۔ اس طرح ایمان بواسطہ محبت خدا ہے۔ محبّان خدا سے محبت کا شمار ایمان میں ہوتا ہے ۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: المومنون والمومنات بعضهم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویقیمون الصلوٰة ویؤتون الذکوٰة ویطیعون اللّٰه ورسولهٗ ۔ اولئک سیرحمهم اللّٰه... (ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، ان میں سے بعض کے بعض رفیق ہیں۔ لوگوں کو اچھے کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں، اور نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرتے ہیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں، جن پر خدا عنقریب رحم کرے گا۔ ۴۵؎

رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے: ودّ المومن للمومن فی اللّٰه من اعظم شعب الایمان (مومن کی مومن سے خدا واسطہ کی دوستی بزرگ ترین شعبہ ایمان میں سے ہے)۔

اس مقالہ میں جو ذکر اب تک ہوا ہے، اسکا خلاصہ یہ ہے کہ دوستان خدا فقط سرزمین محبت میں ہی نہیں، بلکہ وہ اس کے طول وعرض میں ہر راستہ پر موجود رہتے ہیں ۔ امام سجادؑ نے ارشاد فرمایا

ہے کہ وہ محبان خدا جو خوشنودی خدا کے لئے ایک دوسرے سے دوستی کرتے ہیں روز قیامت وہ مشخص چہروں کے ساتھ بعنوان ''متحابّون فی اللّٰه'' پہچانے جائیں گے۔ ۴۶؎

امام محمد باقرؑ نے کہا: اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ آیا تم خیر پر ہو تو دلیل کے ساتھ نظر کرو، اگر تم اہل اطاعت خدا کے دوست ہو اور اہل معصیت خدا کے دشمن ہو، تو تم خیر پر ہو اور خدا تمہارا دوست ہے، اور اگر اہل اطاعت خدا کے دشمن اور اہل معصیت خدا کے دوست ہو، تو خیر نہیں کہ خدا تمہارا دشمن ہے۔ اسکے بعد فرمایا: والمرء مع احب (ہر ایک خود اپنے دوست کے ہمراہ ہوتا ہے)۔'' ۴۷؎

بندگان خدا کو دوست رکھو کہ وہ باعث رحمت ونعمت ہیں۔ ان سے دوستی پیدا کرو۔ دلی محبت رکھو۔ اس کے محبوب سے کبھی دشمنی نہ کرنا کہ حق تعالیٰ اپنے محبوب کے دشمن کا خود بھی دشمن ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خود اپنے آپ کو رحمت سے جدا کرلو گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ پر خلوص بندے بندگان خدا کے مابین چھپے ہوتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تمہاری بدسلوکی اور دشمنی، ان کی ہتک اور ان پر کسی طرح کی ضرب، ہتک خداوند نہ ہوجائے!

ماحاصل مقالہ:

قارئین کرام! اس مقالہ میں کی گئی بحث وگفتگو کا بلاخوف تردید یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تصوف وعرفان کا تخم قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ عرفان کو سمجھنے کے لئے اصل ماخذ اسلامی کا مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ قرآن، احادیث پیغمبر اسلامؐ اور روایات ائمہؑ میں توجہات، اشارات اور تعلیمات کے منابع موجود ہیں۔ حیات طیبہ رسولؐ اور ان کی ادعیہ، سب کی سب میں، معنویت پر مبنی ہیں۔ پیشوائے عارفین حضرت علیؑ کے خطبات اوران کی مناجات بھی حوالہ جات معرفت وعرفان کے حوالوں سے پر ہیں۔

عرفاء جانتے ہیں کہ ان کے عقائد واعمال بنیادی طور پر اسلام، قرآن وحدیث سے اخذ ہیں اور قرآن، اس کی تعلیم وتربیت اور اقوال معصومینؑ دائمی طور سے اسلامی عرفان وتصوف کے جز لاینفک ہیں۔ انہوں نے قرآن وسیرت رسولؐ خدا کی پیروی کو لازم قرار دیا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عارف سید حیدر آملی بربنائے مختلف احادیث پیغمبر اسلامؐ اور ارشادات آئمہ معصومینؑ کے

تصوف کو عین شریعت قرار دیتے ہیں ۔عرفانی ادب کے مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ آیات قرآنی اور احادیث پیغمبرؐ سے مالامال ہے۔

حوالے:

۱۔ سجادی ،سید ضیاء الدین ،مقدمہ ای بر مبانی عرفان وتصوف ، سازمان مطالعہ وتدوین کتب علوم انسانی دانشگاہھا (سمت) ، ۱۳۷۵ھ ،صفحہ ۷

۲۔ سورہ نور ، آیت ۳۵۔

۳۔ سورہ الحدید ، آیت ۳

۴۔ سورہ بقرہ ، آیت ۱۶۳

۵۔ سورہ رحمٰن ، آیت ۲۷

۶۔ سورہ ق، آیت ۱۶

۷۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۱۵

۸۔ سورہ نور ، آیت ۳۵

۹۔ مطہری ، مرتضٰی، آشنای باعلوم اسلامی (کلام ،عرفان) انتشارات صدرا، تہران صفحات ۹۳۔۹۲

۱۰۔ کلینی ،محمد بن یعقوب ، اصول جلد کتاب التوحید، دار الکتب الاسلامیہ، تہران،

۱۱۔ موسوی خمینی ، امام روح اللہ، شرح چھل حدیث ،موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی ، ۱۳۷۳ھ، صفحہ ۶۳۶

۱۲۔ نقل از ابی حمزہ

۱۳۔ مفاتح الجنان ، دعائے عرفہ

۱۴۔ جوادی آملی ،عبد اللہ ، حماسہ وعرفان ، مرکز نشر اسراء ، قم، ۱۳۸۴ھ، صفحہ ۱۱۷

۱۵۔ جعفری ، محمد تقی ،عرفان اسلامی، موسسۂ تدوین ونشر آثار علامہ جعفری، ۱۳۸۴ھ، صفحہ ۵۳

۱۶۔ زریں کوب، عبد الحسین ، درقلمرو وجدان ، انتشارات سروش، تہران ، ۱۳۶۹ھ، صفحہ ۳۳۴

۱۷۔ یثربی سید یحیٰ ، سیر تکاملی واصول مسائل عرفان وتصوف ، دانشگاہ تبریز ،تبریز ، ۱۳۶۸ھ ،صفحہ ۶۹

۱۸۔ سورہ بقرہ ،آیت ۲۷۲

۱۹۔ سورہ الشعراء، آیات ۸۹۔۹۰

۲۰۔ جوادی آملی، عبد اللہ، حیات عارفانہ امام علیؑ مرکز نشر اسراء، قم، ۱۳۸۳ھ ،صفحہ ۶۳
۲۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ شمار ۲۶۰
۲۲۔ ایضاً، خطبہ شمار ۱۶۰
۲۳۔ سورہ آل عمران، آیت ۸۳
۲۴۔ نہج البلاغہ، خطبہ شمار ۱
۲۵۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۵۵
۲۶۔ سورہ عنکبوت، آیت ۵۶
۲۷۔ شیرازی، صدر الدین محمد، الاسفار الاربعہ، جلد ۱، مکتبہ مصطفوی، قم، صفحہ ۱۱۷، کاشانی، فیض، علم الیقین جلد۱، انتشارات بیدار، قم، ۱۳۵۸ھ، صفحہ ۴۹
۲۸۔ موسوی، خمینی، امام روح اللہ، شرح چہل حدیث، موسسۂ تنظیم ونشر اثار امام خمینی، ۱۳۷۳ھ، ملاحظہ ہوں صفحات ۴۸۲تا۶۲۲
۲۹۔ حاتمی طائی اندلسی، اکبرمحی الدین عبد اللہ مشہور بہ ابن عربی دہ رسالہ، ترجمہ، تصحیح وتعلیقات، نجیب مائل ہروی، انتشارات مولیٰ، تہران، ۱۳۶۷ھ
۳۰۔ سورہ واقعہ، آیت ۸۵
۳۱۔ یثربی، سید یحیٰ، فلسفۂ عرفان تحلیلی از اصول ومبانی ومسائل عرفان، دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۷۰ھ، صفحہ ۱۱۴
۳۲۔ سورہ فاطر، آیت ۱۵
۳۳۔ سورہ نجم، آیت ۴۸
۳۴۔ یثربی، سید یحیٰ فلسفہ عرفان تحلیلی از اصول ومبانی ومسائل عرفان، دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۷۰ھ، صفحہ ۶۲
۳۵۔ حلبی، علی اصغر، مبانی عرفان واحوال عارفین، انتشارات اساطیر، تہران، ۱۳۷۷ھ، صفحات ۲۰۷۔۲۰۹
۳۶۔ کلینی، محمد یعقوب، اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۳۵۲، بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، دار المعرفہ، بیروت، صفحہ ۱۳۱

۳۸۔ سورہ طٰہٰ، آیات ۳۹۔۴۰

۳۹۔ نقل از ریاضی، جلد ا، ۱۳۶۹ھ، صفحہ ۲۳۴

۴۰۔ اصفہانی، حافظ ابی نعیم احمد بن عبد اللہ، حلیۃ الاولیاء، جلد ۱۰، قاہرہ، ۱۹۳۷، صفحہ ۱۰

۴۱۔ ذخائر الاعلاق شرح ترجمان الاشواق، طبع مطبع الانسانیہ، صفحات ۴۰۔۳۹

۴۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۶۵

۴۳۔ ذخائر الاعلاق شرح ترجمان الاشواق، طبع مطبع الانسانیہ، صفحات ۳۷

۴۴۔ سورہ فجر، آیت ۲۸

۴۵۔ سورہ توبہ، آیت ۷۱

۴۶۔ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، جلد ۴، باب الحب فی اللہ، دار الکتب الاسلامیہ، تہران

۴۷۔ ایضاً

منبع ولایت سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ

ڈاکٹر عمر کمال الدین

الا انّ اولیاء اللّٰہ لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون کی تفسیر[۱] **رجال لا تلھیھم تجارۃٌ ولا بیعٌ عن ذکر اللّٰہ واقام والصّلٰوۃ وایتاء الزّکوٰۃ** کی تعبیر[۲] **سیماھم فی وجوھھم مّن اثر السجود** کی تصویر[۳] **والّذین جاھدو فینا لنھدینّھم سبلنا وان اللّٰہ لمع المحسنین** کی تنویر[۴] **تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوّاً فی الارض ولا فساداً** کی عملی تفسیر[۵] جانشین **شاھداً ومبشراً ونذیراً**[۶] **منور بنور سراجاً مّنیراً**[۷] حاجت روائے مسکین ویتیم واسیر[۸] مشکل کشائی مضطر ومظلوم وبیسیر، اخلاص واحتساب، انابت وتضرع ایثار وسخاوت ، ادب واحیا امر ابالمعروف ونہی عن المنکر ،تسلیم ورضا، تفکر وتدبر، تقویٰ وطہارت، خشوع وخضوع وخشیت الٰہی وتعلق مع اللہ، ریاضت ومجاہدہ، صبر وتوکل اور ضبط نفس وخود شکنی کی توقیر، آسمان احسان وعرفان وتصوف وسلوک کے بدر منیر، منبع ولایت ومرکز شجاعت، سرچشمہ علم وحلم سیدنا علی کرم اللہ وجہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے نزدیکی خاندانی ونسبی تعلق تھا۔ مزید برآں بچپن سے دامان سید الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ رہنے کی وجہ سے علوم نبویؐ سے بھرپور استفادہ کی سعادت ازلی حاصل ہوئی اور نور علیٰ نور یہ کہ اس بے نظیر اور عدیم المثال تعلیم وتربیت کے ساتھ آپ میں تحصیل علم وکسب کمال کی فطری صلاحیت اور خداداد ذوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکتب نبوت اور مدرسہ رسالت سے جو فیض آپ نے حاصل کیا، وہ بہت کم دوسرے اصحاب کے حصہ میں آیا[۹] قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ جملہ دینی علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ابو عمر، ابو طفیل کے حوالہ سے، بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت علیؓ کو اس وقت دیکھا جب لوگوں سے خطاب فرمارہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کتاب اللہ کے بارے میں جو چاہو پوچھ لو، قرآن کریم میں کسی بھی آیت کے بارے میں جو چاہو پوچھ لو بخدا قرآن کریم میں کوئی بھی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، ہموار راستے میں چلتے ہوئے نازل ہوئی یا اس وقت کہ جب آپ کسی پہاڑی پر تھے۔

ہاشم نژاد اشرف خویشاں احمدؐ است - ہارون مقام کاشف بنیان احمد است
اعجاز سنج لطف مثال ست مرتضٰی

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ کی جلالت علمی پر سارے صحابہ کا اتفاق تھا۔ رسول اللہؐ کے عم زاد حضرت عبداللہ ابن عباس جو خود خیر الامہ تھے، فرماتے تھے کہ علم کے دس حصوں میں سے خدا نے حضرت علیؑ کو نو حصے عطافرمائے۔ اور دسویں میں بھی آپ شریک تھے۔ [۱۰] زبان نبوتؐ سے بھی آپ کو **انا مدینة العلم وعلیٌ بابها** [۱۱] کی سند عطا ہوئی تھی۔ کلام الٰہی سے آپ کو خاص شغف تھا، اس کے حافظ تھے۔ اس کی تعلیم زبانِ وحی والہام سے حاصل کی تھی، علوم قرآن پر تبحر حاصل تھا، فہم قرآن اور اسکے احکام ومسائل کے استنباط کا خاص ملکہ تھا، تفسیر کی کتابیں اور احادیث کے ابواب تفسیر آپ کی روایتوں سے معمور ہیں۔ذات نبویؐ سے قربت کی بنا پر آپ کو سماع حدیث کا سب سے زیادہ موقع میسر ہوا، پھر وصال نبویؐ کے بعد تیس سال تک مسند تعلیم وارشاد پر جلوہ گر رہے اور تشنگان علوم ومعرفت کی علمی وعرفانی پیاس بجھائی ۔ یہی وجہ ہے کہ حفظ حدیث اور روایت حدیث دونوں لحاظ سے آپ کی ذات اقدس جماعت صحابہ میں نہایت ممتاز تھی۔ آپ کی روایات کی تعداد پانچ سو چھیاسی ہے جو کہ کثیر الروایہ صحابہ کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہے، لیکن یہ آپ کی حددرجہ احتیاط کا نتیجہ ہے۔ آپ کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کلام اللہ اور احادیث نبویؐ میں وسعت علم کے ساتھ آپ اسی درجہ کے ذہین، طباع، حاضر دماغ، حاضر جواب، دقیقہ سنج اور نکتہ رس بھی تھے۔ آپ کی ذہانت وفطانت کے بہت سے واقعات ہیں جن کے نقل کرنے سے اصل موضوع سے بہک جانے کا اندیشہ ہے۔ فقہ میں بھی آپ بلند مرتبہ پر فائز تھے بلکہ جماعت صحابہ میں آپ کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، فقہی کمال کے ایک پہلو یعنی مقدمات کے فیصلہ کے وصف میں آپ کا کوئی مقابل نہ تھا۔ زبان رسالت نے آپکو ''اقضاھم علی'' یعنی جماعت صحابہ میں سب سے بڑے قاضی علیؑ ہیں، کی سند مرحمت فرمائی تھی۔

اسلام میں عرفان وتصوف کی تاریخ رسول اکرمؐ کی ذات مبارک سے شروع ہوئی۔ انہیں کی سرپرستی میں اولین جماعت صوفیہ وعارفین ان کے جانشین حضرت علیؑ کے گردو پیش نظر آتی ہے۔ صوفیہ تصوف کی تعلیم کے سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

كما ارسلنا فيكم رسول منكم يتلوا عليكم اٰيتنا ويزكيكم ويعلّمكم الكتب والحكمة ويعلّمكم مالم تكونوا تعلمون۔ (البقرہ:۱۰۱)

جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاک وپاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ سب کچھ بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔

اسی طرح حدیث جبرئیل میں سرکار دو عالمؐ نے احسان کی یعنی جسے تزکیۂ باطن، عرفان اور تصوف کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، تعریف اس طرح بیان فرمائی ہے:

وقال رسول اللّٰہ صلی الله علیه وآله وسلم الاحسان ان تعبداللّٰہ کانّک تراہ فان لم تکن تراہ فانّہ یراک (حدیث جبریل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اگر چہ تصوف اور صوفی کی اصطلاح سے ہم دوسری صدی ہجری میں واقف ہوئے ہیں، لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس کا مصداق قرن اوّل میں موجود تھا۔ شیخ ہجویری، کشف المحجوب، میں لکھتے ہیں:

''اس دور میں تصوف کا نام تو بے شک نہیں تھا، مگر بطور ایک حقیقت موجود تھا'' ۱۲؎

''...... اور تصوف جس وقت اسلام کے قرن اول میں ظاہر ہوا تو اس کے لئے عظیم شان تھی یعنی وہ ایک عظیم المرتبت چیز تھی اور ابتداً اس سے مقصود تقویم اخلاق، تہذیب نفوس اور طبائع کو دین کا خوگر بنانا اور ان کو اس کی جانب کھینچ کر لانا اور دین وشریعت کو نفس کی طبیعت اور اس کا وجدان بنانا نیز دین کے حکم واسرار سے تدریجاً نفس کو واقف کرانا تھا'' ۱۳؎

جانشین سرکار دو عالمؐ واقف اسرار نبوت اور شارح علوم رسالت حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سردار انبیاء کا مسلک یوں بیان فرماتے ہیں:

''عرفان میرا سرمایہ ہے، ذکرِ الٰہی میرا مونس ہے، حزن میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، خدا کی رضا میری غنیمت ہے، عاجزی میرے لئے وجہ اعزاز ہے، زہد میرا پیشہ ہے، صدق میرا سفارشی ہے، اطاعت میرا بچاؤ ہے، جہاد میرا کردار ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔'' ۱۴؎

امیر المومنین وخلیفہ رسول امینؐ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو حقیقتاً مسلمانوں کے ولی الامر، معلم، مربی، مصلح، امام، احکام شریعت کے لئے علمی نمونہ پیش کرنے والے، اخلاق و دینی امور کی نگرانی اور

احتساب کرنے والے اوران کی سریت واخلاق پر نظر رکھنے والے تھے۔ انہوں نے مسلک رسولؐ کی حرف بہ حرف پیروی کرتے ہوئے اصلاح وتبلیغ نیز رشد وہدایت کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ ذات نبویؐ سے آپ کی وابستگی، علوم شرعیہ سے مکمل آگاہی، محبوب و دلنواز شخصیت اور نگہ بلند، سخن دلنواز جان پر سوز کا پیکر ہونا ایسے عوامل تھے کہ لوگ پروانہ وار اس شمع ہدایت سے فیض حاصل کرنے کو ٹوٹ پڑے تھے۔

عرفان وتصوف یا احسان کا سرچشمہ واقعتاً آپ کی مبارک ذات تھی۔ صوفیہ کے تمام بڑے بڑے سلاسل حضرت حسن بصریؒ (م:۱۱۰ء/۷۲۸ھ) کے واسطے سے آپ ہی پر منتہی ہوتے ہیں گرچہ محدثین کے نزدیک حسن بصریؒ کا حضرت علیؑ سے لقا ثابت نہیں ہے۔ لیکن ارباب تصوف کا اس پر اتفاق ہے شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

''ارباب طریقت کے نزدیک حسن بصریؒ کو طبعتاً حضرت علیؑ سے نسبت ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ انتساب ثابت نہیں ہے لیکن شیخ احمد قشاشی نے اپنی کتاب ''عقد العزیز فی سلاسل اہل التوحید'' میں ایک تشفی بخش بحث کے ذریعہ اہل تصوف کو تائید کی ہے۔''

ایک دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں: ''صوفیہ کا اتفاق ہے کہ حسن بصریؒ نے حضرت علیؑ سے فیض پایا تھا۔''

خلافت سے پہلے تصوف میں آپ کو بہت انہاک تھا پھر خلافت کے بعد اس کی مصروفیتوں کی وجہ سے اس فن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہ ملا'' ۱۶؎

حقیقت یہ ہے کہ خلافت جیسی اہم ذمہ داری کی مشغولیت اور خاص طور پر خلافت کو منہاج نبوت پر باقی رکھنے کے لئے سخت ترین مراحل میں جہاں امن وسکون ناپید، اطمینان وفارغ البالی عنقا اور ہر طرف شورش وہنگامہ برپا تھا، آپ نے جس مجاہدانہ اور مجتہدانہ شان سے حالات کا مقابلہ کیا وہ حقیقتاً **لا فتی الا علی لا سیف الا ذو الفقار** کا مصداق ہے۔ بقول شاعر:

در عرصۂ مجاہدۂ دین مستقیم　　مفتوح باب اوست بہر سائل وسقیم
تیغش ہر استخوان عدو را کند دو نیم　　چون بہر مومن است در جنت نعیم
رفع بلای عسرت و عِصیان کند علیؑ
ذکرِ قدیر است زبانش بہ جستجو　　سر در سجود ربی الاعلیٰ برد فرد
چند انکہ تیغ اوست پی گرد کینہ جو　　گرزش چنانکہ فرق نہد برتن عدد

عزم جہاد وطاعت رحمان کند علیؓ

اس دور پرفتن میں آپ نے جس عالی ہمتی ، صبر واستقامت ، حوصلہ وعزیمت حق گوئی، بے باکی، جوان مردی خندہ جبینی اور بشاشت قلب کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

’’خلافت کی پوری مدت کو ایک مسلسل مجاہدہ، ایک مسلسل کشمکش، ایک مسلسل سفر میں گزارنا ،لیکن نہ تھکنا، نہ مایوس ہونا ، نہ بددل ہونا، نہ شکایت کرنا، نہ راحت کی طلب، نہ محنت کا شکوہ، نہ دوستوں کا گلہ، دشمن کی بدگوئی، مدح وذم سے بے پروا، جان سے بے پروا، انجام سے بے پروا، نہ ماضی کا غم، نہ مستقبل کا اندیشہ، فرض کا ایک احساس مسلسل اور سعی کا ایک سلسلہ غیر منقطع ، دریا کا سا صبر، سورج اور چاند کی سی پابندی، ہواؤں اور بادلوں کی سی فرض شناسی، معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ذوالفقار ان کے ہاتھ میں سرگرم اور بے زبان ہے اسی طرح وہ کسی اور ہستی کے دست قدرت میں سرگرم عمل اور شکوہ وشکایت سے ناآشنا ہیں۔ ایمان وطاعت کا وہ مقام جو صدیقین کو حاصل ہوتا ہے ، لیکن اس کا پہچاننا اور ان نزاکتوں اور مشکلات سے واقف ہونا بڑے صاحب نظر اور صاحب ذوق کا کام ہے۔ا سلئے ان کی زندگی اوران کی عظیم شخصیت کا پہچاننا ایک بڑا امتحان ہے......‘‘ ۱۷

آخر میں آپ کے چند اقوال زرّین بیان کرنے کے بعد میں اپنی بات ختم کردوں گا۔

۱-نعمت چھ چیزیں ہیں، اسلام، قرآن ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،تندرستی، پرستش اور بے پروائی آدمیوں سے۔

۲- جو علم کی طلب میں ہے جنت اس کی طلب میں ہے اور جو کوئی گناہ کی طلب میں ہے دوزخ اس کی طلب میں ہے۔

۳-علم اچھی میراث ہے اور ادب اچھا پیشہ ہے اور تقویٰ اچھا توشہ ہے، اور عبادت اچھی پونجی ہے اور عمل نیک اچھا کھینچنے والا ہے اور نیک خلق اچھا ساتھی ہے اور بردباری اچھا وزیر ہے اور قناعت اچھی تونگری ہے اور توفیق اچھی مدد ہے اور موت اچھا ادب دینے والی ہے۔ ۱۸

۴-لوگوں سے اس طرح ملو کہ اگر مرجاؤ تو تم پر روئیں اور زندہ ہو تو تمہارے مشتاق ہوں ۔۱۹

۵-بہترین دولتمندی یہ ہے کہ تمناؤں کو ترک کردو ۔۲۰

۶-نوافل سے قرب الٰہی نہیں ہوسکتا جب وہ فرائض میں سد راہ ہوں ۔۲۱

۷-خوشا نصیب اس کے جس نے آخرت کو یادرکھا، حساب وکتاب کے لئے عمل کیا، ضرورت پر قناعت کی اور اللہ سے راضی رہا۔

۸-عقل سے بڑھ کر کوئی ثروت نہیں ہے اور جہالت سے بڑھ کر کوئی بے مائیگی نہیں، ادب سے بڑھ کر کوئی میراث نہیں اور مشورہ سے بڑھ کر کوئی چیز معین ومددگار نہیں۔۲۲

۹-جولوگوں کا پیشوا بنے تو اسے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے کو تعلیم دینا چاہئے اور زبان سے درسِ اخلاق دینے سے پہلے اپنی سیرت وکردار سے تعلیم دینا چاہئے اور جو اپنے نفس کی تعلیم وتادیب کرے وہ دوسروں کی تعلیم وتادیب کرنے والے سے زیادہ احترام کا مستحق ہے۔۲۳

۱۰-خوشا نصیب اس کے کہ جس کے نفس نے فروتنی اختیار کی، جس کی کمائی پاک وپاکیزہ اور نیت نیک اور عادت وخصلت پسندیدہ رہی، جس نے اپنی ضرورت سے بچا ہوا مال خدا کی راہ میں صرف کیا، بے کار باتوں سے زبان کو روک لیا، مردم آزاری سے کنارہ کش رہا،سنت اسے ناگوار نہ ہوئی اور بدعت کی طرف منسوب نہ ہوا۔۲۴

سید رضی کہتے ہیں کہ یہ کلام کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے۔ مذکورہ بالا حقائق واقوال نیز آپ اور آپ کی اولاد اخفا ونیز اصحاب نے عرفان وسلوک میں جو کار ہائے نمایاں انجام دئے ہیں ان کی روشنی میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یقیناً آپ سرچشمہ تصوف عرفان اسلامی تھے۔

حوالے:

۱-القرآن، یونس :۶۳۲ (یاد رکھو کہ جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر نہ وغمگین ہوں گے)

۲-ایضاً نور:۳۷ (وہ مرد کہ غافل نہیں ہوتے سودا کرنے اور بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے)۔

۳- ایضاً، فتح ۲۹ (نشانی ان کی ان کے منھ پر ہے سجدہ کے اثر سے)۔

۴-ایضاً عنکبوت: ۶۹ (اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سمجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں اور بے شک اللہ ان کے ساتھ ہے نیکی والوں کے)۔

۵- ایضاً، قصص:۸۳ (یعنی وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے ان لوگوں کو جو نہیں چاہتے تھے اپنی

بڑائی ملک میں اور نہ بگاڑ ڈالنا اور عاقبت بھی ہے ڈرنے والوں کی)۔

۶- ایضاً، احزاب ۴۵ (اے نبیؐ ہم نے تم کو بھیجا بتانے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا کی طرف اشارہ ہے)۔

۷- ایضاً، احزاب ۴۶ (اور چمکتا ہوا چراغ اس بات سے اشارہ ہے کہ اللہ نے آپ کو وہ نور نبوت عطا فرمایا کہ جس کے بعد ساری روشنیاں اس نور اعظم میں خود مدغم ہوگئیں)۔

۸- ایضاً، دہر: ۸ (اور کھلاتے ہیں اسکی محبت میں محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔ اس آیت میں حضرت علیؑ کے فعل کی تعریف کی گئی ہے)

۹-ازالۃ الخفار ۲۶۸، ابن سعد، ج ۲ف ۳ ص۱۰۱، الرمرتضٰی ص ۳۳۳

۱۰- تہذیب الاسماء نودی، ص۳۴۶ (بحوالہ تاریخ اسلام، رزمش معین الدین احمد ص۳۱۹

۱۱- یہ روایت صحاح کی ہے تو بعض محدثین اسے ضعیف مانتے ہیں۔

۱۲- کشف المحجوب، ص ۱۳

۱۳- ابداع (بحوالہ اکابر کا سلوک واحسان، مرتبہ محمد اقبال، ہوشیار پوری، ص۲۱)

۱۴- شفا از قاضی عیاض بحوالہ ندائے ملت، لکھنؤ رسولؐ نمبر ۱۰

۱۵-انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، ص۱۸اور ۳۱

۱۶-ازالۃ الخفاء، ص۲۷۴

۱۷- المرتضٰی

۱۶۔(معیار السلوک ص۹۶-۱۹۳)

۱۸۔(حکم ومواعظ ۹)

۲۰۔ (حکم مواعظ ۳۴)

۲۱۔(حکم ومواعظ ۳۶)

۲۲۔(حکم ومواعظ ۵۴)

۲۳۔ (حکم ومواعظ ۷۳)

۲۴۔(حکم ومواعظ ۱۲۳)

صوفیائے کرام کے سماجی کردار کی نشاندہی

سید جمال الدین

ہر دور میں خاص وعام کو 'نمونہ افراد' یا 'نظیر' کی تلاش رہتی ہے تاکہ ان کی دانش سے وہ استفادہ کرسکیں اور ان کے عمل سے خود بھی کچھ کر گزرنے کے لیے حوصلہ سمیٹ سکیں۔ ماں باپ میں، بڑے بھائی بہن اور گھر کے بزرگوں میں، آس پڑوس میں، استاد میں، احباب میں، دوستوں میں، غرض معاشرے میں جن افراد سے بھی انسان کا سابقہ پڑتا ہے، ان میں وہ ایسی نظیر تلاش کرتا ہے، ایسا نمونہ ڈھونڈتا ہے جسکی تقلید یا پیروی اس کے لئے باعث حصول سعادت ہوسکے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں یہ 'نمونہ' افراد' یا 'نظیر' صوفیائے کرام تھے، یعنی وہ گروہ جس کی طرف سورۂ فاتحہ میں بھی اشارہ ہوا ہے: صراط الّذین انعمت علیھم۔

آخر کیا بات تھی کہ صوفیائے کرام 'نمونہ' افراد' بن گئے۔ لوگ ان کی طرف رجوع ہوتے، ان کی صحبت اختیار کرتے اور فیض پاتے تھے۔ ''تذکرۂ حضرت سید صاحب بانسوی'' میں مصنف مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی نے اس سوال کو سمجھنے کے لیے ہماری رہنمائی ان الفاظ میں کی ہے:

''گروہ صوفیاء میں یہ دستور عام ہے کہ وہ ارشادِ نبوی تخلقوا باخلاق اللّٰہ''

(صفاتِ خداوندی سے اپنے کو آراستہ کرنے کی کوشش کرو) کے مطابق الٰہی صفت رب العالمین (سارے جہاں کا پرورش کرنے والا) کا حتی الوسع اپنے میں ظہور کی، اور اسکا مظہر بننے کی سعی کرتا ہے۔[۱]

مظہر صفات الٰہی بننا آسان نہیں، لیکن تصوف کا راستہ اسی نصب العین کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ صفات الٰہی کی معرفت، ان کا اپنی فکر، مزاج وطبیعت اور عمل میں جذب کرنا اور ان سے فیض رسانی کرنا ہی تصوف ہے۔ صوفی کو جو فیض اللہ کے تقرب سے پہنچتا ہے وہ اسے اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا، اسے عام کرتا ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا:

''یہ بات بے جا ہے کہ جس امر سے خود فائدہ اٹھائے وہ دوسرے کو نہ بتلائے۔[۲]

یہی وہ دانش ہے جس نے صوفیائے کرام کو اللہ کی مخلوق سے جوڑا۔ اللہ سے مشغول اور مخلوق سے وابستہ صوفی کا یہی روحانی سفر ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے کسی ایسے درویش صفت شخص کا قول نقل کیا ہے جس کے بارے میں وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ مردانِ غیب میں تھا یا کوئی اور۔ فرماتے ہیں کہ ایک ملاقات میں اس شخص نے دورانِ گفتگو کہا:

''کس قدر پست حوصلگی ہے کہ خلق سے گوشہ نشینی اختیار کرتے ہوئے میں حق میں مشغول ہوں، عالی ہمتی چاہئے کہ خلق میں بھی رہیں اور خدا میں بھی مشغول ہوں۔ ۳؎

ایسا بھی ہوا کہ اکابر صوفیاء کبھی خلق سے تنگ آجاتے ،لیکن بعد میں انہیں پشیمانی ہوتی۔ اس طرح کے کچھ واقعات حضرت محبوبِ الٰہی اوران کے پیرو مرشد کے ساتھ بھی پیش آئے، جو خود حضرت محبوب الٰہی نے نقل کیے۔ اپنے متعلق فرمایا:

''میں جمعہ کے روز برائے ادائے نماز جمعہ جب مکان سے باہر نکلتا راستے میں خلق میری مزاحم ہوتی اوراسی طرح مسجد سے واپسی کے بعد سخت دقت پیش آتی۔ ایک روز مسجد سے نکل کر آدمیوں سے چھپتا ہوا ایک کوچے کی راہ سے اپنے مسکن کو آرہا تھا۔ گلی میں ایک شخص مجھ سے ملا۔ بعد بغلگیر ہونے کے کہنے لگا آپ لوگوں کی عقیدت سے تنگ آتے ہیں، میں نے اس امر کو قبول کیا۔ یہ سن کر وہ شخص کہنے لگا کہ میرا خسر شیخ الاسلام فرید الدین قدس سرہ العزیز کا مرید تھا۔ جس وقت شیخ الاسلام دہلی میں رہتے تھے اور نماز جمعہ کے واسطے جاتے تھے، ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہتا تھا۔ اگر چہ شیخ الاسلام وقت سے بہت پیشتر جاتے تھے لیکن پھر بھی راستے میں لوگ اس کثرت سے اظہارِ عبودیت کرتے تھے کہ آپ تنگ ہوجاتے۔

ایک روز میرے خسر نے آپ سے معانقہ کیااور آثار تنگی کے آپ کے چہرہ سے ہویدا دیکھ کر کہا کہ یہ نعمتِ خدا ہے اس سے تنگ نہ ہونا چاہئے۔ ۴؎

ایک اور واقعہ حضرت محبوب الٰہی نے اپنے مرشد حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کا خلق سے تنگ آنے ، اپنے اس فعل پر پشیمان ہونے اور خلق سے اپنے کو دوبارہ جوڑنے کے بارے میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بروقت عزیمت سلطان ناصر الدین بجانب ملتان و اوچ اجودھن راستہ میں آئی۔ حضرت شیخ شیوخ العالم ان دنوں اجودھن چلے آئے تھے۔ جملہ لشکر نے آپ کی زیارت کرنی چاہی، شیخ اس انبوہ

کثیر سے حیران ہوگئے اور اپنے مریدوں سے ارشاد فرمایا کہ میرے گرد حلقہ کرلو۔ چنانچہ حلقہ قوی کیا گیا۔ اس وقت ایک فراش سلطانی آیا اور حلقہ کو چیرتا ہوا آپ کے قدموں میں جا پڑا اور پیر چوم لیے۔ شیخ الاسلام کو یہ حرکت بغایت دشوار معلوم ہوئی۔ اس نے آپ کا چہرہ متغیر ہ دیکھ کر کہا: اے فریدالدین کیوں تنگ ہوتے ہو، اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو کہ تم کو اس لائق کیا ہے۔ اس کی زبان سے یہ سنتے ہی آپ نے ایک چیخ ماری اور رونے لگے، اور اس فراش سے بہت معذرت کی۔

اس کے بعد آپ ایک جگہ کھڑے ہوگئے کہ خلق کو پاس آنے میں دقت نہ پڑے۔ دور سے سلام کرلیں اور آستین مبارک ہاتھ سے نکال کر نیچے لٹکا دی تھی۔ اہل لشکر جوق جوق آتے تھے، سلام کرکے آستین مبارک کو بوسہ دیتے اور چلے جاتے ۔ آخر الامر صبح سے وقت نماز مغرب آگیا اور پیراہن آپ کا پارہ پارہ ہوگیا، لیکن انبوہ خلائق کم نہ ہوا۔[۵]

خلق خدا کی خدمت صوفیائے کرام کے یہاں ایک اصول کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ بڑااہتمام کرتے۔ پریشانیاں بھی اٹھانا پڑتیں تب بھی وہ خدمت سے دریغ نہ کرتے۔ حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ نے ایک حکایت نقل کی کہ ان سے حضرت شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس سرہٗ کے ایک عزیز خواجہ عزیز الدین نقل کرتے تھے کہ:

''میں ایک جگہ دعوت پر گیا تھا، جب بعد عصر کھا کر واپس آیا تو حضرت سلطان الاولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا ۔حضرت نے پوچھا کہاں تھا؟ عرض کیا فلاں جگہ دعوت میں گیا تھا، وہاں اکثر اعزہ یہ باتیں کررہے تھے کہ جناب سلطان الاولیاء کی خاطرِ شریف امور دنیاوی سے فارغ ہے، آپ کو کوئی غم اور فکر اس جہاں کا نہیں۔ جناب شیخ قدس سرہ العزیز نے یہ سن کر فرمایا: جس قدر مجھ کو غم واندوہ رہتا ہے، کسی کو اس جہاں میں نہ ہوگا۔ اس واسطے کہ مخلوق خدا جو میرے پاس آتی ہے اور اپنے رنج وتکلیف بیان کرتی ہے، ان سب کا بوجھ میرے دل وجان پر پڑتا ہے اور ہر ایک کے واسطے دل کڑھتا ہے۔[۶]

مخلوق میں سے کوئی ناراض ہوجاتا تھا تو حضرت محبوب الٰہی ہر ممکن کوشش کرتے کہ اسے منالیں۔ ایک بار خواجہ عطا نبیرہٗ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ ،جو لا ابالی مزاج تھے، حضرت شیخ سلطان الاولیاء کی خدمت شریف میں آئے اور دوات وقلم حضرت شیخ کے روبرو رکھ دی اور کہا فلانے امیر کو رقعہ لکھ دو کہ مجھ کو کچھ دے۔ شیخ نے عذر فرمایا: وہ میرے پاس آمد و رفت نہیں رکھتا غیر شخص کی

سفارش کیسے کروں، مگر تم کو جو اس سے توقع ہو بیان کرو کہ میں اپنے پاس سے دے دوں، بولے جو تمہارے دل میں آئے، دے دو، مگر رقعہ سفارش بھی لکھ دو۔ شیخ نے فرمایا خیر باد! یہ طریقہ درویشوں کا نہیں ہے کہ رقعہ لکھا کریں خصوصاً جب کہ میں نے اسے نہ دیکھا ہو، نہ اس نے مجھے دیکھا ہو، اور نہ یہاں آیا ہو! اس نیک بخت نے شیخ کو برا کہنا شروع کیا کہ اے فلانے مرید میرے دادا کا اور غلام ہمارا ہے تو میں تیرا خواجہ زاد ہوں، ایک رقعہ لکھنے کو کہتا ہوں اور تو نہیں لکھتا۔ یہ کہہ کر دوات اٹھا کر زمین پر زور سے ماری اور جانے کو اٹھے۔ حضرت شیخ نے بڑھ کردامن اس کا پکڑ لیا۔ فرمایا ناراض ہوکر مت جاؤ، رضا مند ہوکر جانا۔ ۷

عہدِ اکبر کے ایک صوفی بزرگ تھے، نام تھا شیخ عزیز اللہ، ان کے ہاں صبح و شام محفل سماع رہتی تھی۔ ملا عبد القادر بدایونی ان کے احوال میں لکھتا ہے کہ دوران سماع ان کا یہ عالم رہتا تھا کہ اگر پتھر پر بھی اس عالم میں نگاہ پڑ جائے تو پانی بن جائے ۸ خدمتِ خلق کا بھی بیحد خیال واہتمام کرتے تھے۔ مثلاً بدایونی نے لکھا ہے کہ اگر وہ چلہ میں بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی محتاج شخص خواہ وہ کسی غیر مسلم کے پاس سفارش کے لیے لے جانا چاہتا تو حجرۂ اعتکاف سے نکل آتے اور اس کے گھر دور دراز کی مسافت طے کرکے پیدل ہی چلے جاتے۔ حاجت براری کے بعد لوٹ کر پھر اعتکاف میں بیٹھ جاتے، گویا اس سے ان کا چلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی عبادتوں پر لوگوں کی حاجت روائی کو مقدم سمجھتے تھے۔ اگر کوئی غیر مسلم یا ظالم حاکم ایک بار کہنے پر ان کی سفارش کو قبول نہ کرتا یا جان بوجھ کر گھر سے ملاقات کے لیے نہ نکلتا، تو وہ سارا دن اس کے انتظار میں وہیں بیٹھے رہتے۔ پھر بھی ملاقات نہ ہوتی تو دوسرے دن جانے کے لیے انکار نہ کرتے اور بے تکلف اسطرح چلے جاتے جیسے ان کو کسی طرح کی کدورت نہیں ہوئی۔ ان کے ان افکار کو دیکھ کر وہ شخص شرمندہ ہوجاتا اور ان کے پاؤں پر گر پڑتا اور اس حاجت مند کی حاجت پوری ہوجاتی۔ ۹

خدمت خلق کے لیے کسی شخص میں دو وصف کا یکجا ہونا بہت ضروری ہے: انکساری اور سخاوت۔ صوفیائے کرام کے یہاں یہ دونوں اوصاف بدرجہ اتم موجود رہتے۔ عہد اکبر کے سلسلہ شطاریہ کے ایک بزرگ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ انکساری اور سخاوت کا مکمل نمونہ تھے۔ ملا بدایونی نے ان کی انکساری اور سخاوت کے بیان میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خود اس نے انہیں آگرہ کے بازار میں دور سے دیکھا۔ اس وقت وہ سوار ہوکر جارہے تھے اور ان کے آگے پیچھے دائیں بائیں لوگوں نے اتنا ہجوم

کرر کھا تھا کہ اس بھیڑ میں کسی کا داخل ہونا ممکن نہ تھا۔اس قدر ومنزلت پر ان کے انکسار وتواضع کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو دائیں بائیں گھوم کر اور اس قدر جھک کر سلام کا جواب دے رہے تھے کہ ان کے سر کو لحظہ بھر کے لیے قرار نہ تھا۔ ان کی پشت زین کے تکیے سے ٹکرائی جاتی تھی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ''لباس فقر میں یہ بڑے جاہ وجلال والے تھے،ان کی مدد معاش ایک ہزار تنکا تھی۔ جوکوئی ان سے ملنے آتا تھا وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے۔ کافروں سے بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ اا

بدایونی نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نہایت سخی اور دریادل آدمی تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ چنانچہ کبھی اپنے آپ کو''میں'' نہیں کہا ہمیشہ خود کو''فقیر'' ہی کہا کرتے تھے۔ اس معاملے میں ان کو اتنا کچھ غلو تھا کہ جب کسی کو غلہ دیتے تو اس کے وزن کو ظاہر کرنے کے لیے''من'' کا لفظ ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ کہتے تھے اتنے میم اور نون (من) فلاں آدمی کو دے دو'' ۱۲

خلق خدا کی پذیرائی کے لیے صوفیائے کرام طعام سے تواضع پر بہت زور دیتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ خلق خدا کو کھانا کھلانا بہت اچھی بات ہے۔ ۱۳ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خلق خدا کو کھانا کھلانا کل مذاہب میں پسندیدہ ہے۔ ۱۴

صوفیائے کرام نے کھانا کھلانے اور پانی پلانے کے آداب سکھائے ۔ حضرت محبوب الٰہی نے اس ضمن میں ارشاد فرمایا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ **ساقی القوم آخر همه شربا** یعنی مجلس کے پانی پلانے والے کو لازم ہے کہ سب سے آخر میں پانی پیوے اوراسی طرح کھانا کھلانے والے کو لازم ہے کہ سب سے آخر میں کھانا کھاوے۔ ۱۵ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میزبان کو لازم ہے کہ خود مہمان کے ہاتھ دھلوائے ،مگر پہلے اپنے ہاتھ پہنچے تک دھوئے کہ پاک ہوجاوے اور کھڑا ہوکر ہاتھ دھلائے ، بیٹھ کر نہ دھلائے۔ ۱۶ پانی پلانے میں کیا برکت ہے، اسکو حضرت محبوب الٰہی نے ایک مرتبہ اس طرح سمجھایا کہ سلطان شمس الدین التمش کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالٰی نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جواب دیا کہ اللہ تعالٰی نے مجھے اس کے حوض وطفیل میں حوض سلطانی بخش دیا۔ (حوض سلطانی یا حوض شمسی بنوائے کے)طفیل بخش دیا۔ ۱۷

میزبان ضیافت کا اسی وقت لطف لے سکتا ہے جب وہ کھانا کھانے والے کی اس طرح پذیرائی کرے کہ کھائے مہمان اور مزا میزبان کو محسوس ہو۔ حضرت محبوب الٰہی نے ایک بزرگ کا قول اس ضمن میں اس طرح نقل کیا ہے کہ'' ایک بزرگ کا فرمودہ ہے کہ جو شخص میرے روبرو کھانا کھاتا ہے،

اس کا مزہ اپنے حلق میں پاتا ہوں یا با الفاظ دیگر وہ کھانا میں خود ہی کھاتا ہوں ۔۱۸

کھانا کھانے اور اسکی مضرت ومنفعت کے بارے میں حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ'' بحالت شکم پری کھانا کھانا روانہیں کیونکہ موجب مضرت ہے مگر دو حالت میں کھایا جائے تو روا ہے اول اس حالت میں جب کوئی مہمان آئے اور میزبان شکم سیر ہو بپاس خاطر مہمان کسی قدر کھائے۔ دوم اس حالت میں کہ روزہ افطار کرے اورکھانا پیٹ بھرکر کھائے۔ یہ جان کر کہ بسبب تنگی معاش سحری ممکن نہ ہوگی۔ پس اگر کسی قدر زیادہ کھاجاوے تو بھی روا ہے۔

مہمان داری صوفیائے کرام کے اخلاق کا ایک اہم عنصر ہے اور یہ تعلیم انہیں حدیث سے ملی ہے۔حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے'' جس نے ملاقات کی زندہ آدمی سے اور نہ کھائے اس کے پاس سے کوئی چیز گویا وہ مردہ سے ملاتھا۔۲۰

البتہ صوفیائے کرام خودکم کھانے کے قائل تھے۔حضرت محبوب الٰہی نے ارشادفرمایا کہ مردان حق جوکچھ کھاتے پیتے ہیں برائے قوت عبادت ورضا جوئی حق کھاتے ہیں۔ ۲۱ایک بزرگ کی حکایت بیان کی کہ ان کا ارشاد ہے **بطنک دنیاک** یعنی تیرا پیٹ ہی دنیا ہے۔اگرکم کھائے گا تارک الدنیا ہوگا۔ اگر زیادہ کھائے گا دنیادار ہوگا۔ ۲۲ایک اور حکایت بھی بیان فرمائی کہ'' شیطان کا مقولہ ہے جوشخص پیٹ بھرکرنماز میں مشغول ہوتاہے میں اس سے معانقہ کرتاہوں۔پس جس وقت وہ شخص نمازختم کرچکے اس کے حال سے قیاس کرلینا چاہیے کہ اثر میرااس پر کہاں تک ہے؟ اور بھوکا جب سوتاہے میں اس کے نزدیک سے بھاگ جاتاہوں۔ قیاس کرلینا چاہیے کہ میں اس کی نماز کی حالت میں کس قدر اس سے نفرت کرتاہوں۔ ۲۳طبی اور حفظان صحت کے نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو کم کھانا مفید ہے۔اس طرح کم کھانے کی صوفیائے کرام نے جوتعلیم دی اس کا ایک مثبت دنیاوی پہلوبھی ہے اور روحانی یا دینی بھی ۔ جوکم کھائے گا وہ دنیا میں زیادہ نہیں پڑے گا ، عبادت میں بھی شیطان اس سے دور بھاگے گا۔اس طرح دنیا میں بھی شیطان کا اس کی زندگی میں گزرنہیں ہوگا۔

مادی زندگی کی بنیاد پیسہ ہے ۔صوفی پیسے کے وجود کا انکارنہیں کرتے؟ البتہ وہ اس کے جمع کرنے میں نقصان اورخرچ کردینے میں فائدہ دیکھتے ہیں۔ مال جمع کرنے والوں کے بارے میں گفتگوکرتے ہوئے حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ'' جس قدر ان کومیسر ہوتاہے اس سے زیادہ طلب کرتے ہیں اور سیرنہیں ہوتے ۔۲۴آپ نے یہ بھی ارشادفرمایا کہ حق تعالیٰ عزاسمہٗ نے انسان کو

مختلف الطبع پیدا کیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاس دس روپے ہوں اور اس دس کے بارہ ہوجائیں، اس کو یہ فکر ہوتی ہے کہ وہ روپے خرچ کر ڈالے اور جب تک وہ خرچ نہیں ہوجاتے اس کو آرام نہیں ملتا۔ اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ جس قدر زیادہ جمع ہوجاتا ہے اور مزید طلب کی جستجو میں رہتے ہیں۔ یہ عادت ان کی اختیاری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا ہی پیدا کیا ہے، کوئی شخص اس وقت تک راحت حاصل نہیں کرسکتا جب تک خرچ نہ کرے۔ ۲۵

بدی کے بدلے نیکی صوفیائے کرام کا ایک اہم اصول ہے۔ حضرت محبوب الٰہی کا ارشاد ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تحمل اور بردباری سے کام لیا جائے اور جس قدر جفا وخفا اٹھائے، کبھی اس کا بدلہ لینے کا ارادہ نہ کرے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص تمہارے راستے میں کانٹا ڈالے اور تم بھی اس کی راہ میں کانٹا رکھو، یہ امر جوانمردی سے بعید ہے۔ ۲۶

آداب گفتگو کا صوفیائے کرام کے یہاں بڑا لحاظ تھا کہ ان سے دل ٹوٹتے یا منتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی نے ارشاد فرمایا کہ ''حال اس طرح کہنا اور کلام اس طرح کرنا چاہیے کہ گردن کی رگ نہ ہلے اور نہ آواز میں تیزی پیدا ہو۔'' ۲۷

صوفیاء کی تنبیہ کے انداز میں بھی ایک خصوصیت ہوتی تھی، جس کی وجہ سے وہ جو نصیحت فرماتے، اس میں اثر پذیری ہوتی تھی۔ کالپی کے ایک بزرگ شیخ برہان جو مہدوی طریقے پر ''پاس انفاس'' میں رہتے تھے۔ ان کے اس طرح کے انداز نصیحت کو بدایونی نے یوں نقل کیا ہے کہ ایک دن وہ مہر علی سلدوز کے ساتھ حضرت شیخ برہان کی خدمت حاضر ہوا۔ یہ مہر علی سلدوز جو درویش دوستی کی صفت رکھنے کے باوجود پورا ترکی تھا اور مردم آزاری، ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا۔ شیخ سے ملاقات کے لیے روانہ ہونے سے قبل بھی اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی اور ان کو مغلظانہ گالیاں دی تھیں۔ جب وہ بدایونی کے ساتھ شیخ برہان کی خدمت میں پہنچا، تو شیخ نے سب سے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ حدیث تھی کہ ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں'' یہ حدیث پڑھ کر حضرت شیخ نے اس کے نکات کی بڑی عالمانہ ودل کش تشریح کی۔ مہر علی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ کھڑا ہوگیا اور اپنے کئے پر نادم وشرمندہ ہو کر توبہ کرنے لگا۔ شیخ سے دعا وفاتحہ کی درخواست کی، کچھ نذرانہ بھی پیش کیا جو شیخ نے قبول نہ کیا۔ ۲۸

مشائخ اچھی صحبت پر بہت زور دیتے ہیں کیونکہ یہی انسان کو انسان بناتی ہے اور اس کی عدمیت

سے وہ انسان نہیں رہتا۔ حضرت محبوب الٰہی نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ مشائخ کا دستور ہے کہ جب وہ کسی شخص کے حال سے مطلع وخبر دار ہونا چاہتے ہیں تو اس طرح دریافت فرماتے رہتے ہیں کہ تمہاری صحبت کس سے رہتی ہے اس سے اس کا حال معلوم ہوجاتا ہے۔ ۲۹

مشائخ کی صحبت کا فیض جسے نصیب ہوتا تھا اس کی زندگی میں زبردست تغیر آجاتا تھا۔ ملا بدایونی جو اپنے کو درباری اور مادی زندگی میں ملوث ہونے کی وجہ سے برا بھلا کہتا رہتا تھا، اپنے بھائی شیخ محمد مرحوم کے بارے میں لکھتا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین انبیٹھی وال نے اسے اپنی بیعت سے نوازا تھا۔ چنانچہ وہ حضرت کی تھوڑی سی توجہ سے بڑا عبادت گزار اور فرشتہ خصلت بن گیا تھا۔ اس کا ایک لمحہ بھی فضول باتوں میں ضائع نہیں ہوتا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ وہ میری طرح بیکار مشغلوں میں الجھا ہوا نہیں رہا۔ ۳۰

مشائخ سے وابستگی کے فوائد کو ضیاء برنی نے عہد علائی کے بزرگوں کے احوال میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے بارے میں لکھتا ہے کہ انہوں نے ''بیعت عام کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ گنہگار لوگ ان کے سامنے اپنے گناہوں کا اقبال کرتے اور ان سے توبہ کرتے اور وہ ان کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیتے۔ خواص وعوام، مالدار ومفلس، امیر وفقیر، عالم وجاہل، شریف و رذیل، شہری ودہقانی، غازی ومجاہد، آزاد وغلام ان سب سے وہ توبہ کراتے اور ان کو طاقیہ (ایک خاص قسم کی ٹوپی) اور مسواک صفائی کے لیے دیتے۔ ان لوگوں میں سے کثیر تعداد جو خود کو شیخ کے مریدوں میں شمار کرتی تھی، بہت سے ان کاموں سے پرہیز کرنے لگتی تھی جو کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ اگر شیخ کی خانقاہ میں حاضر ہونے والوں میں سے کسی سے کوئی لغزش ہوجاتی تو اسکو تجدید بیعت کرنی پڑتی اور شیخ از سرنو اس سے اقبال گناہ اور توبہ کراتے۔ شیخ کے مرید ہونے کی شرم لوگوں کو بہت گناہوں (منکرات) سے ظاہر اور مخفی طور پر باز رکھتی، چنانچہ عام لوگ یا دوسروں کی تقلید میں یا خود اپنے اعتقاد کی بنیاد پر عبادت اور بندگی کی طرف راغب ہوگئے تھے اور مرد اور عورتیں، بوڑھے اور جوان، سوداگر اور عام لوگ، غلام اور نوکر اور کم عمر بچے، سب نماز پڑھنے لگے تھے۔ ۳۱

شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کے دور میں اگر دنیا میں کوئی دکھی، پریشان حال، مظلوم، متفکر، غمگین، بے روزگار کہیں بے جھجک جاسکتا اور دل کی مراد پاسکتا تھا تو ان مشائخ کے آستانے تھے۔ یہاں سے ان کے لیے سفارشیں کی جاتیں، تعویذ دیے جاتے، اور ورد نوافل بتائے جاتے، جن سے

بلا دور ہو، مسافر سفر میں محفوظ رہیں، بیماروں کے حال معلوم کیے جاتے، ان کے لیے نسخے دواو دعا کے بتائے جاتے، حتیٰ کہ سماع کو بھی بعض امراض کا علاج بتایا گیا۔ ایسے اعمال بتائے جاتے جن سے ظالم حکمراں سے چھٹکارا مل جاتا۔ شیخ کی نظر پاکر صاحب وجاہت غلام آزاد کردیتے۔ نہ وہ شہرت کے لیے عبادت کرتے اور نہ ہی اپنے حال کو ظاہر کرتے۔ نیک عمل کی ہدایت کرتے ۔ خود دنیا سے دور رہتے، لیکن دنیا والوں کے دکھ درد میں شریک رہتے۔ اللہ ذات میں منہمک ومشغول رہتے ہوئے اس کی مخلوق کو خوش رکھنا یہ صوفیائے کرام کا سماجی رول تھا، اسی لیے وہ سماج کے ہر عام وخاص کے لیے ایک نمونہ ونظیر بن گئے تھے۔ ان کی تقلید ہوتی تھی۔ اپنے کو ان کا جیسا بنانے کی فکر رہتی تھی۔ مختلف طبقوں، پیشوں، علاقوں سے لوگ ان کے پاس آتے اور ہدایت پاتے۔ وہ گوشہ نشین رہ سکتے تھے، مخلوق سے دور ویرانے میں بھی رہ سکتے تھے لیکن ان میں سے اکثر نے مخلوق کے درمیان رہ کر اللہ کے ذکر کے ساتھ مشغول رہنے اور عبادت کے ساتھ خدمت کے کام کو جاری رکھنے کو فوقیت دی۔ حضرت محبوب الٰہی نے اپنے مرید وخلیفہ حضرت شیخ نصیرا لدین چراغ دہلویؒ کو مخلوق سے تنگ آنے کے بعد ویرانے میں جانے کی اجازت نہیں دی، بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ مخلوق میں رہ کر ان کی طرف سے ہونے والی زیادتی کو برداشت کرو۔ مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی ان میں کشش محسوس کرتے۔ وہ بعض جوگیوں کے اقوال بھی پسند فرماتے۔ تبدیلی مذہب ان کا مشن نہیں تھا، لیکن وہ اسلام کا ایسا نمونہ ضرور تھے کہ غیر مسلم اسلام پسند ہوجاتے تھے خواہ وہ مشرف بہ اسلام ہوں یا نہیں۔ حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ جوگیوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، انہیں تو ان کے ناچ گانوں میں کنہیا اور گوپیوں کا دیدار ہوجاتا۔ اورنگ زیب کے عہد کے ''اودھ باشی'' برج نواسی سیدشاہ برکت اللہؒ نے تو یہ بھی فرما دیا کہ ''دبیل اور مسیت میں دیپ ایک ہی بھائے۔''

سماج کی تشکیل میں اعلیٰ قدروں کی آمیزش سے صوفیائے کرام نے بڑا کام کیا، صبر وتحمل، توکل، قناعت، توبہ، سخاوت کی قدریں اس عہد کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھیں جس میں دولت پر چند افراد یا مخصوص گروہوں کا قبضہ تھا اور اکثریت کو ہر تکلف سے محروم رکھا جاتا تھا۔ یہی نہیں ان قدروں کے اختیار کرنے والے اپنے کردار کی وجہ سے امیر ہوگئے اور شرافت وانسانیت میں اپنی امارت کے لیے آج بھی مشہور ہیں۔

حواشی

(۱) تذکرہ سید صاحب بانسویؒ ، سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کے سوانح حیات اور احوال ومقامات، کراچی، ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۵۳

(۲) امیر علا سنجری، فوائد الفواد، اردو ترجمہ، شمس بریلوی، دہلی، ۱۹۸۴ء، صفحہ ۲۷۴

(۳) ایضا، صفحہ ۲۵

(۴) ایضا، صفحات ۲۴۵، ۲۵۳

(۵) ایضا، صفحہ ۲۵۴

(۶) حمید قلندر، خیرالمجالس، (اردو ترجمہ) ناشر واحد بک ڈپو، جونا مارکیٹ، کراچی، صفحہ ۹۶

(۷) ایضا، صفحہ ۹۷

(۸) ملا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، اردو ترجمہ محمود احمد فاروقی، کراچی، ۱۹۶۲ء، جلد سوم، صفحہ ۵۶۷

(۹) ایضا

(۱۰) ایضا صفحہ ۵۶۵

(۱۱) ایضا

(۱۲) ایضا

(۱۳) فوائد الفواد

(۱۴) ایضاً، صفحہ ۸۷

(۱۵) ایضاً

(۱۶) ایضاً صفحات ۲۲۱-۲۲۰

(۱۷) ایضاً

(۱۸) ایضاً، صفحہ ۱۶۳

(۱۹) ایضاً، صفحہ ۹۳

(۲۰) ایضاً، صفحہ ۱۴۳

(۲۱) ایضاً، صفحہ ۱۱۲

(۲۲) ایضاً،صفحہ ۱۵۶

(۲۳)ایضاً

(۲۴) ایضاً،صفحہ ۱۲۳

(۲۵) ایضاً،صفحہ ۱۲۴-۱۲۳

(۲۶) ایضاً،صفحہ ۱۷۲

(۲۷) ایضاً

(۲۸) منتخب التواریخ،صفحہ ۵۶۶

(۲۹) فوائدالفوائد،صفحہ ۸۴

(۳۰) منتخب التواریخ،صفحہ ۵۷۴

(۳۱) ضیاء برنی، تاریخ فیروز شاہی ، اردو ترجمہ سید معین الحق الدین، لاہور، ۱۹۸۳ء ،صفحات ۵۰۰-۵۰۱

تاریخ فرشتہ میں مذکور مشائخ کے احوال

ڈاکٹر نکہت فاطمہ

محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی تبلیغ وترویج کا آغاز ہوا۔ سلاطین دہلی کے سبھی خاندانوں اور مغل خاندان نے فارسی زبان وادب کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے علماء فضلاء، شعراء اور ادباء کی سرپرستی کی، اور نظم ونثر کی ہر صنف نے ترقی کی۔ بادشاہوں نے اپنے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے اپنے دور کی تاریخیں لکھوانے میں بے انتہا دلچسپی لی۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں جو اس دور کے مروجہ علوم اور ان کی مختلف شاخوں سے متعلق ہیں۔ اس دور میں فارسی میں لکھنے والوں نے جس موضوع پر خاص توجہ دی وہ تاریخ نگاری ہے۔ تقریباً سات سو سالہ ہندوستان کی سیاسی، ادبی اور سماجی تاریخ اگر کسی زبان میں مبسوط طور پر ملتی ہے تو وہ فارسی زبان میں ہی ہے۔

محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ گلشن ابراہیمی موسوم بہ تاریخ فرشتہ ہندوستان میں قلمبند کی جانے والی اہم تاریخی کتب میں سے ایک ہے۔ محمد قاسم فرشتہ کے حالات زندگی تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے، حالانکہ اس نے اپنی تاریخ میں بہت سے گمنام لوگوں کا ذکر کیا ہے، لیکن اس نے خود اپنے بارے میں زیادہ نہیں لکھا البتہ کہیں کہیں ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے اس کے حالات زندگی پر مختصر روشنی پڑتی ہے۔ فرشتہ کا پورا نام محمد قاسم ہندوشاہ استرابادی اور لقب فرشتہ، والد کا نام مولانا غلام علی ہندوشاہ تھا۔ تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ مورّخ صرف اتنا لکھتا ہے کہ آغاز جوانی میں وہ احمد نگر میں مقیم تھا۔[۱]

۹۹۸ھ/۱۸۵۶ء میں اس نے احمد نگر سے بیجا پور کی راہ لی اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (حکومت: ۹۸۸ـ۱۰۳۷ھ/ ۱۵۸۵ـ۱۶۲۷ء) کے دربار میں رسائی حاصل کرکے اس کے ملازمین میں شامل ہوگیا۔[۲] بادشاہ نے فرشتہ کو اپنے دور کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا۔ بادشاہ کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے، اس نے متقدمین مورخین کی تواریخ کا مطالعہ کیا۔ اس بات کا اظہار اس نے تاریخ فرشتہ کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔[۳] فرشتہ نے ان مآخذ کا بھی ذکر کیا ہے جو اس کے مطالعہ میں رہے اور جن سے اس نے تاریخ فرشتہ لکھتے وقت استفادہ کیا۔ بیانات کی تائید میں ان میں سے بعض کے

حوالے بھی دئے ہیں مثلاً ترجمہ عینی، زین الاخبار ، تاج المآثر ، طبقات ناصری، ملحقات شیخ عین الدین بیجاپوری، تاریخ فیروز شاہی، فتوحات فیروز شاہی، واقعات بابری، واقعات ہمایونی ، تاریخ بناکتی، تاریخ مبارک شاہی ، بہمن نامہ شیخ آذری ، سراج التواریخ بہمنی، تحفۃ السلاطین بہمنی ، تاریخ الفی، روضۃ الاصفا، حسیب السیر ، تاریخ حاجی محمد قندھاری، طبقات محمود شاہی گجراتی، مآثر محمود شاہی گجراتی ، تاریخ بہادر شاہ گجراتی، تاریخ مظفر شاہی گجراتی ، تاریخ نظام الدین احمد بخشی، تاریخ بنگالہ، تاریخ سندھ ، تاریخ کشمیر، فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر العارفین وغیرہ ۔

ان مآخذ اور اپنے تجربات وذاتی مشاہدات کی روشنی میں اور سنی سنائی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے فرشتہ نے اپنے دور کے حالات ، واقعات اور دوسرے بادشاہوں کے کارنامے اور مشائخ کے حالات قلمبند کرکے ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء میں بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ اس نے اپنی تاریخ کا عنوان ''گلشن ابراہیمی'' اسی بادشاہ کے نام کی مناسبت سے رکھا، جو بعد میں تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہوئی ۔

فرشتہ نے تاریخ فرشتہ ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ میں اپنے بادشاہ کو معنون کی۔ لیکن اسی میں درج مذکورہ سال کے بعض واقعات اور حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخ مذکورہ سال کے بعد بھی اپنی اس تاریخی کتاب پرنظر ثانی کرتا رہا اور اس سال کے بعد کے واقعات بھی شامل کرتا رہا۔ اس نے سب سے آخری واقعہ سال ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳-۱۶۲۴ء کا بیان کیا ہے ۔ چونکہ فرشتہ کی تاریخ وفات بھی پردہ میں ہے، اس لیے اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳- ۱۶۲۴ء تک زندہ تھا۔

محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ کی تصنیف تاریخ فرشتہ یا گلشن ابراہیمی یا نورس نامہ دو جلدوں میں ہے اور دیباچہ ، مقدمہ، بارہ مقالات یا ابواب اور ایک خاتمہ پرمشتمل ہے۔ مورخ نے پورے ملک ہندوستان کی اپنے دور تک کی ایک مفصل تاریخ لکھی، جو کہ قدیم ہندستان کی تاریخ ، ہندوؤں کے عقائد، مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے اکبر شاہ کی وفات تک کے حالات کے علاوہ علاقائی سلطنتوں مثلاً گجرات، مالوہ، خاندیش ، بنگال ، سندھ ، ملتان ، کشمیر، مالابار اوراس کے علاوہ ہندوستان کے مشائخ کے حالات پرمشتمل ہے۔

تاریخ فرشتہ ہندوستان کے دور وسطی کی تاریخ اورخصوصاً دکن کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے

ایک اہم تاریخی مآخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ غالبًا پہلی کتاب ہے جس میں مشائخ کا ذکر ایک الگ باب میں کیا گیا ہے۔ نظام الدین احمد بخشی نے طبقات اکبری میں علماء، حکماء، شعرا اور عرفا کا ذکر کیا ہے، مگر وہ پیشتر دورۂ اکبری سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تاریخ فرشتہ کا بار ہواں مقالہ ہندوستان کے مشائخ کا تذکرہ ہے۔ اس مقالہ میں مورّخ نے طوالت کے باعث صرف چشتیہ اور سہروردیہ فرقہ کے مشائخ کے حالات لکھے ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس نے یہ احوال اپنے ناقص علم کی بنیاد پر لکھے ہیں۔ اگر اس کی عمر نے وفا کی اور ہندوستان کے اولیاء سے متعلق تذکرے اسے دستیاب ہوئے تو وہ ان بزرگوں کے تفصیلی حالات دوبارہ لکھے گا اور اسے اپنی تاریخ کے ضمیمہ میں شامل کرے گا۔ ۱۳ اس کے علاوہ مورخ نے مختلف مقالات میں علاقائی سلطنتوں کا ذکر کرنے کے دوران ان ادوار کے مشہور عرفا کا بھی ضمناً ذکر کیا ہے۔ تاریخ فرشتہ ان چند اہم اور تاریخی مآخذ میں شامل ہے جن سے ہمیں قدیم دور سے خود مؤلف کے زمانے تک ہندستان کے متعدد معروف مشائخ کے احوال مل جاتے ہیں۔ فرشتہ نے تاریخ میں تقریباً ۳۶ مشائخ کے احوال وآثار اور تعلیمات پیش کیے ہیں۔ یہ مشائخ مختلف سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس مقالے میں تاریخ فرشتہ کی روشنی میں کچھ مشائخ کے احوال مختصراً پیش کیے جارہے ہیں:

خواجہ معین الدین حسن سنجری:

فرشتہ نے سب سے پہلے ہندوستان میں چشتی دبستان تصوف کے بانی خواجہ معین الدین محمد حسن سنجری کے احوال اور ان کی تعلیمات پر بحث کی ہے۔ خواجہ کی پیدائش سجستان میں اور پرورش خراسان میں ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ کی ملاقات ایک مجذوب ابراہیم قندوزی سے ہوئی۔ اس ملاقات سے آپ کے اندر ایک نور روشن ہوا۔ اور گھر وجائداد سے دل اچاٹ ہوگیا۔ اس کے بعد آپ ایک عرصہ تک سمرقند وبخارا میں رہے۔ قرآن کریم حفظ کیا اور ظاہری علوم پڑھے۔ وہاں سے عراق بغداد، ہمدان، تبریز، فرخان، استرابادشہروں کا سفر کیا اور دوران سفر جہاں ایک طرف آپ نے وہاں کے بزرگان دین مثلاً شیخ عثمان ہارونی، شیخ یوسف ہمدانی، شیخ ابوسعید تبریزی اور شیخ ناصرالدین استرابادی سے ملاقات کی، وہیں دوسری طرف اوحدالدین کرمانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی نے آپ سے کسب فیض کیا۔ اصفہان میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے آپ سے ارادت کا شرف

حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ ہرات اور پھر بلخ روانہ ہوئے۔ وہاں جب آپ کی شہرت کا غلبہ حد سے بڑھ گیا، تب آپ مولانا ضیاء الدین کو خرقہ خلافت عطا کرکے غزنین سے دہلی اور پھر ۵۶۱ھ / ۱۱۶۵۔۱۱۶۶ء میں اجمیر پہنچے۔ ان دنوں وہان کفار کا غلبہ تھا۔ اور سید حسین مشہدی خنگ سوار، جو کہ شیعہ مذہب کا پیروکار اور صلاح وتقویٰ میں آراستہ وپیراستہ تھا، ان دنوں اجمیر کے داروغہ کے عہدہ پر فائز تھا۔ وہ اور اجمیر کے کفار خواجہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ خواجہ چشتی شمس الدین التتمش کے دور میں دوبار اپنے مرید خواجہ قطب الدین کاکی سے ملاقات کے لئے دہلی گئے اور دوسری بار دہلی سے واپسی پر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ نکاح کے سات سال بعد ستانوے برس کی عمر میں ۶ رجب ۶۳۳ھ/ ۱۶مارچ ۱۲۳۶ء میں وفات پائی۔ بقول فرشتہ آپ کی وفات کے بعد ہر عہد کے بادشاہ آپ کے روضہ پر نذور بھیجتے تھے۔ خصوصاً جلال الدین محمد اکبر آپ سے بے انتہا عقیدت رکھتا تھا اور اکثر اجمیر پیدل جاکر آپ کے مزار کی زیارت کرتا تھا۔ ۵

خواجہ قطب الدین بختیار اوشی المعروف بہ کاکی:

آپ کی ولادت ماوراء النہر کے قصبہ اوش میں ہوئی۔ والد کی وفات کے بعد والدہ نے آپ کی پرورش کی اور تعلیم وتربیت کے لئے مکتب بھیجا۔ آپ نے شریعت وطریقت کے آداب حاصل کئے اور دینی معاملات میں آراستہ وپیراستہ ہوئے۔ اصفہان میں آپ خواجہ معین الدین چشتی کے مرید ہوئے۔ اس کے بعد آپ بغداد گئے اور وہاں کے عرفاء مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اوحدالدین کرمانی سے فیض حاصل کیا۔ اپنے پیر خواجہ معین الدین سے ملاقات کرنے کے لئے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ راستہ میں ملتان میں کچھ روز حضرت بہاؤ الدین زکریا کی خدمت میں رہے اور وہیں شیخ فرید الدین گنج شکر آپ کے مرید ہوئے۔ دہلی پہنچ کر آپ نے کیلوکھری میں سکونت اختیار کی۔ نہ صرف بادشاہ وقت، شمس الدین التتمش، اس دور کے مشائخ شیخ الاسلام شیخ جمال الدین بسطامی، شیخ حمید الدین ناگوری بھی بلکہ دہلی کا ہر عام وخاص خواجہ کا ارادتمند ہوگیا۔ التتمش ہفتہ میں دوبار آپ کی زیارت کے لئے جاتا اور فیضیاب ہوتا تھا۔ ۶ خواجہ نے عمر کے آخری حصہ میں قرآن مجید حفظ کیا۔ آخری زمانے میں ازدواجی زندگی بھی اختیار کی اور دو بیٹے شیخ احمد اور شیخ محمد پیدا ہوئے۔ ایک روز آپ شیخ علی سجستانی کی خانقاہ میں محفل سماع میں شریک تھے۔ سماع میں یہ شعر سنا:

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگر است

آپ کو شعر پر حال، تغیر اور تحیر پیدا ہوا۔ تین دن آپ وجد کی حالت میں رہے اور اسی حال میں شیخ فرید الدین گنج شکر کو خرقہ عطا کرنے کی وصیت کے بعد ۱۴ ربیع الاوّل ۶۳۴ھ/ ۱۵ نومبر ۱۲۳۶ھ میں خالق حقیقی سے جاملے۔ ۷

قاضی حمید الدین ناگوری:

آپ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ارادتمندوں میں سے تھے۔ شمس الدین التتمش کے عہد حکومت میں ہندستان تشریف لائے۔ آپ سماع پسند فرماتے تھے اور آپ کی محفلوں میں روزانہ محفل سماع منعقد ہوتی تھی۔ التتمش کے دور کے علماء نے ان پر اعتراض کیا۔ سلطان نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا اور علماء نے ان سے بحث ومباحثہ کیا اور پوچھا کہ سماع حلال ہے یا حرام؟ قاضی صاحب نے فرمایا: اہل قال پر حرام ہے اور اہل حال پر حلال۔ پھر آپ نے سلطان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک رات بغداد میں اہل حال سماع میں مشغول تھے اور آپ آقا کے حکم کے موجب اس رات اہل مجلس کی خدمت میں کمر بستہ ہاتھ میں شمع پکڑے کھڑے تھے۔ ان درویشوں کی نظر آپ پر پڑی اور آپ ان کی نظروں کے فیض سے اس مرتبہ تک پہنچ گئے۔ سلطان کو وہ واقعہ یاد آیا اور وہ متاثر ہوا۔ قاضی صاحب کو اپنے قریب بٹھایا اور اس کے بعد خود بھی سماع کی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ ۸

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر:

آپ خواجہ کاکی کے خلیفہ ہیں۔ آپ کے والد کابل سے ملتان آئے اور قصبہ کھوتوال میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور ۵۸۴ھ/ ۱۱۸۸-۱۱۸۹ء میں شیخ فریدالدین کی ولادت ہوئی۔ شیخ نے اپنے دور کے ملتان کے مشہور علماء سے تعلیم حاصل کی اور قرآن مجید حفظ کیا۔ ملتان میں آپ خواجہ کاکی کی ارادت سے مشرف ہوئے۔ خواجہ نے انہیں ظاہری علوم میں مشغول رہنے اور دہلی آنے کا حکم دیا۔ دہلی آنے کے بعد خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب آپ کی شہرت زیادہ ہونے لگی تو آپ خواجہ کاکی سے رخصت لے کر ہانسی چلے گئے اور وہاں سکونت اختیار کرلی۔ وہاں بھی جب آپ کی شہرت اور لوگوں کا ہجوم زیادہ ہوگیا تب شیخ جمال الدین

ہانسوی کوخرقہ عطا کرکے دیپال پور کے قصبہ اجودہن میں جو کہ اب پٹن شیخ فرید کے نام سے مشہور ہے، مقیم ہوگئے۔ ۹؎ تاریخ فرشتہ کے مطابق شیخ کی وفات پچانوے برس کی عمر میں ۷۶۰/ ۱۳۵۹ء میں ہوئی۔ ۱۰؎

شیخ نظام الدین اولیاءؒ:

شیخ نظام الدین اولیاء شیخ فرید الدین گنج شکر کے خلیفہ ہیں۔ آپ کے والد غزنیں سے ہندوستان آئے اور بدایوں میں قیام کیا جہاں آپ کی پیدائش ہوئی۔ بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر والدہ نے آپ کی پرورش کی۔ بعد میں آپ دہلی تشریف لائے اور علمائے وقت سے کسب فیض کیا۔ تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ ایک غیبی آواز نے آپ کوغیاث پور میں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا ۱۱؎ تاریخ فرشتہ میں شیخ کے کئی مریدوں کا ذکر ہے مثلاً شیخ برہان الدین غریب، شیخ نصیرالدین محمود اودھی، شیخ اخی سراج، مؤلف سیر الاولیاء، سید محمد کرمانی مشہور بہ میر خورد، مؤلف فوائد، الفواد حسن سجزی، امیر خسرو، مولانا شمس الدین یحیٰی وغیرہ۔ شیخ نظام الدین اولیاء سے نہ صرف عام لوگ بلکہ افراد اور بادشاہ وقت بھی ارادت رکھتے تھے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ علاؤ الدین حسن گانگو بہمنی بھی سلطان المشائخ کا معتقد تھا۔ صاحب اقتدار ہونے سے قبل ایک روز علاؤ الدین حسن بہمنی حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں ان کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ اس سے پہلے محمد بن تغلق، جو ان دنوں شہزادہ تھا، شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر واپس گیا تھا۔ علاء الدین حسن ابھی دروازہ پر ہی تھے کہ شیخ نے ایک ملازم کو اسے اندر لانے کے لئے بھیجا اور فرمایا: ''سلطانی وسلطانی آمد'' یہ پڑھ سلطان المشائخ نے علاء الدین پر خاص التفات فرمایا اور ایک روٹی جو اپنے افطار کے لئے رکھی تھی انگلی پر رکھ کر علاء الدین کو اس بشارت کے ساتھ دی۔'' این چتر شاہی است کہ پس از مدتی دراز ومحنت دیر باز در دکن روزی نصیب تو خواہد شد۔'' ۱۲؎ حضرت محبوب الٰہی نے وفات سے قبل شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کوخرقہ عطا کیا۔ آپ کی وفات پچانوے برس کی عمر میں ۷۲۵ھ ہوئی۔ آپ غیاث پور میں، جو کہ اب نئی دہلی میں نظام الدین کے نام سے مشہور ہے، مدفون ہیں۔

شیخ نصیر الدین المشہور بہ چراغ دہلی:

آپ شیخ نظام الدین اولیاء کے اعظم خلیفہ ہیں۔ آپ علوم ظاہری وباطنی کا مجموعہ تھے۔ شیخ

نظام الدین اولیاء کے دوست واحباب آپ کو'' گنج معانی'' کہتے تھے ۔ اپنے شیخ کی وفات کے بعد آپ ان کے سجادہ نشین ہوئے اور اہل دہلی کے رشدو ہدایات میں مشغول ہوئے۔ شیخ کے چراغ دہلی لقب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مکہ معظّمہ میں حضرت شیخ عبد اللہ یافعی کی زبان مبارک سے نکلا کہ دہلی کے مشائخ میں اب صرف شیخ نصیر الدین ہی باقی بچے ہیں اور دہلی کے چراغ کی مانند ہیں۔ تب سے شیخ نصیر الدین ، چراغ دہلی، کے لقب سے مشہور ہوئے ۱۳؎ شیخ کے مریدوں میں مخدوم جہانیان سید جلا ل الدین حسین بخاری ، سید محمد گیسودراز، شیخ اخی سراج، شیخ حسام الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شیخ چراغ دہلی کی وفات ۷۵۷/ ۱۳۵۶ء میں ہوئی۔

شیخ اخی سراج پروانہ:

شیخ اخی سراج حضرت محبوب الٰہی کے مشہور خلفاء میں سے ہیں۔آپ کو حضرت محبوب الٰہی نے اپنے سلسلہ کی ترویج کے لئے بنگال روانہ کیا گیاتھا۔ بقول فرشتہ حضرت نظام الدین اولیاء کی وفات کے بعد آپ جب دہلی آئے تو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ارادتمند ہوکر اعلیٰ درجات حاصل کیے اور ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔مشہور ہے کہ جب شیخ نصیر الدین اودھی نے انہیں بنگال رخصت ہونے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ وہاں شیخ علاء الدین قل موجود ہیں اور وہاں کے لوگ ان سے رجوع کرتے ہیں۔ میرے وہاں ہونے کا کیا اثر ہوگا؟ تب شیخ نے ہندی زبان میں فرمایا:'' تم اوپر وی تل''۔ اوراس طرح شیخ اخی سراج کو برتری کی بشارت دے کر بنگال رخصت کیا۔ ۱۴؎

شاہ منتخب الدین المعروف بہ زرزری زربخش:

آپ شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں پہنچے اور ان کے مرید ہوگئے ۔ چونکہ علوم متداولہ اور اخلاق حسنہ میں باکمال تھے، شیخ کے منظور نظر ہوئے اور اعلیٰ مراتب حاصل کیے۔حضرت نظام الدین اولیاء نے شاہ منتخب الدین کو خلافت نامہ، مصلہ عصا اورخلعت کے ساتھ دکن کی خلافت عطا کی۔ آپ کے زرزری زربخش نام سے مشہور ہونے کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نے دکن کی خلافت عطا کرتے وقت اپنے سات سو مرید بھی آپ کے ساتھ کردئے۔آپ ان کے خرچ کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوئے تو حضرت نظام الدین اولیاء نے کہا کہ ان سب

کا خرچ تہجد کے وقت غیب سے پہنچے گا۔اور ایسا ہی ہوا۔ ہر شب ایک زرین ڈبہ غیب سے آتا اور شاہ اسے فروخت کرکے درویشوں میں تقسیم کردیتے۔ ۱۵

شیخ برہان الدین غریب:

آپ بھی شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید اور خلیفہ ہین۔ شاہ منتخب الدین زرزری زربخش کی وفات کے بعد شیخ نظام الدین اولیاء نے آپ کو دکن کی خلافت عنایت کی۔ شیخ برہان الدین کی وفات دولت آباد میں ہوئی۔ آپ وہیں مدفون ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد شیخ زین الدین آپ کے جانشین ہوئے۔ ۱۶ خاندیس کے حکمراں نصیر خان فاروقی نے شیخ برہان الدین کے نام پر 'برہان پور' شہر آباد کیا۔

شیخ نظام الدین ابو المؤید:

یہ سلطان غیاث الدین بلبن اور شمس الدین التتمش کے عہد کے مشہور بزرگوں میں سے تھے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ہم عصر اور مرید تھے۔

شیخ سلیم چشتی:

شیخ سلیم چشتی شیخ فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد سپاہی تھے اور سیکری میں قیام پذیر تھے۔ آپ کی پیدائش بھی سیکری میں ہوئی۔ متداولہ علوم پر عبور حاصل کیااور مختلف ممالک کی سیاحت کی۔ ہندوستان واپس آکر سیکری میں عبادت اور ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ شیر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور جلال الدین اکبر شیخ سلیم سے خاص ارادت رکھتے تھے۔ بقول فرشتہ، شیخ سلیم نے شہزادہ سلیم کی پیدائش اور لمبی عمر کی بشارت دی تھی۔ ۱۷ تاریخ فرشتہ میں آپ کی وفات ۹۷۰ھ/ ۱۵۶۲۔۱۵۶۳ء درج ہے۔ ۱۸

شیخ بہاؤالدین زکریا:

آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اور غیاث الدین بلبن اور التتمش کے عہد کے مشہور مشائخ میں سے ہیں۔ آپ کے دادا کا نام کمال الدین علی شاہ قریشی اور والد کا نام وجیہ الدین تھا۔ آپ کی پیدائش ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲۔۱۱۸۳ء میں ہوئی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد شیخ زکریا

خراسان تشریف لے گئے اور وہاں مختلف بزرگان دین سے کسب فیض کیا۔تقریباً پندرہ سال تدریس میں مشغول رہے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد پانچ سال مدینہ منورہ میں رہے۔ اس کے بعد بغداد میں شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں پہنچ کر ان سے خرقہ حاصل کیا۔ شیخ الشیوخ کے حکم کے موجب شیخ زکریا ملتان تشریف لے گئے اور وہاں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ۱۹ آپ کے مریدوں میں سید جلال بخاری، شیخ فخرالدین عراقی اور امیر حسین قابل ذکر ہیں۔فرشتہ کے مطابق آپ کی وفات ۶۶۶ھ/ ۶۷-۱۳۶۷ ۱۲۶۸ء میں ہوئی۔ ۲۰

شیخ فخرالدین عراقی:

آپ شیخ بہاؤ الدین زکریا کے مرید تھے۔ ہمدان کے مدرسہ میں تعلیم سے فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں درس دیتے تھے۔ شیخ کی وفات کے بعد حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں سے روم گئے۔آپ کی مشہور تصنیف 'لمات' ہے۔فرشتہ نے آپ کے اشعار نقل کیے ہیں:

نخستین بادہ کا نذر جام کردند — زچشم مست ساقی وام کردند
برای صید مرغ جان عاشق — ززلف ماہ رویان دام کردند
بعالم ھر کجا رنج و ملامت — بہم (بہم) کردند عشقش نام کردند
زبھر نقل ملتان ازلب و چشم — مہیا شکر و بادام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش — عراقی را چرا بدنام کردند ۲۱

شیخ فخرالدین عراقی کی وفات ہشتم ذی قعدہ ۷۸۸ھ/ ۱۳۸۶ء ۲۲ میں ہوئی۔ اور ان کا مزار دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی کے مزرار کے پاس ہے۔ ۲۳

شیخ امیر حسین:

آپ شیخ بہاؤ الدین زکریا کے مرید تھے۔ اپنے والد کے ہمراہ تجارت کی غرض سے ملتان آئے۔اس وقت مرید نہیں ہوئے تھے۔علمی مدارج میں باکمال تھے۔ والد کی وفات کے بعد دنیا ترک کردی۔ جو کچھ بھی تھا سب فقراء میں تقسیم کرکے ملتان آگئے اور شیخ کے مرید ہوکر تین سال ان کی خدمت کرکے صاحب کمال ہوئے۔ آپ کی تصانیف مثلاً نزہت الارواح، زاد المسافرین اور کنز

الرموز وغیرہ کی اصلاح شیخ بہاؤ الدین زکریا نے کی۔ کنز الرموز میں شیخ اور ان کے فرزند صدر الدین عارف کی مدح میں اشعار کہے:

شیخ ہفت اقلیم قطب اولیاء — واصل حضرت ندیم کبریا
مفخر ملت بہار شرع دین — جان پاکش منبع صدق ویقین
از وجود او بہ نزد دوستان — جنت الماوی شدہ ہندوستان
منکہ رو از نیک و از بد تافتم — این سعادت از قبولش یافتم
رخت ہستی چون برون برد ازمیان — کرد پرواز ہما بر آشیان
آن بلند آوازۂ عالم پناہ — سر در عصر افتخار صدر گاہ
صدر دین و دولت آن مقبول حق — نہ فلک بر خون جودش یک طبق

امیر حسین کی وفات ٦ شوال ۷۱۸ھ/ ۲۰ نومبر ۱۳۱۴ء میں ہوئی۔ ۲۴

سید جلال الدین بخاری:

آپ بخارا سے بھکر، پھر بھکر سے ملتان آئے اور حضرت بہاء الدین زکریا سے بیعت کر کے خرقہ حاصل کیا۔ اس کے بعد ملتان سے اچہ تشریف لے گئے، جہاں آپ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور تین بیٹے سید احمد کبیر، سید بہاؤ الدین اور سید محمد پیدا ہوئے۔ آپ کا مزار اچہ میں ہے۔ ۲۵

شیخ حسن افغان:

شیخ حسن افغان بھی شیخ بہاؤ الدین زکریا کے مرید تھے۔ شیخ زکریا اکثر اپنی زبان مبارک سے فرماتے تھے کہ اگر قیامت کے دن خدا کی طرف سے یہ آواز آئی کہ تم ہمارے دربار میں کیا لائے ہو تو کہوں گا کہ حسن افغان کو لایا ہوں ۲٦

شیخ صدر الدین عارف:

آپ شیخ بہاؤ الدین زکریا کے فرزند تھے۔ والد کی وفات کے بعد ساری میراث فقراء میں تقسیم کر کے رشدو ہدایت کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے اور بہت سارے اولیاء آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جن میں شیخ جمال خنداق، شیخ احمد

معشوق ،مولانا علاء الدین نجندی، شیخ رکن الدین ابو الفتح کے نام قابل ذکر ہیں۔آپ کی وفات کے بعدخرقہ خلافت آپ کےفرزند شیخ رکن الدین ابوالفتح کو ملا۔ ۲۷

شیخ رکن الدین ابو الفتح:

آپ ظاہری اور باطنی علوم میں کامل اورکشف وکرامات میں مشہور تھے۔فرشتہ نے آپ کی عظمت اور بزرگی کا اعتراف کیا ہے۔آپ جب شکم مادر میں پرورش پا رہے تھےتبھی آپ کے دادا شیخ بہاؤ الدین زکریا پرآپ کی بزرگی اورعظمت ظاہر ہوگئی تھی۔ ۲۸ آپ ملتان میں طالبان حق کی راہنمائی کرتے تھے۔ دہلی میں بھی شیخ رکن الدین کے مریدوں کی کثیر تعداد تھی۔حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال کی خبرسن کرآپ دہلی تشریف لائے۔انہیں ایام میں غیاث الدین تغلق کی بنگالہ کی مہم سے واپسی پرمحمد بن تغلق نے افغان پور میں بنائے گئے ایک محل میں ضیافت کا اہتمام کیا،جس میں شیخ رکن الدین بھی موجود تھے۔کھانے کے دوران شیخ نے بادشاہ کومحل سے باہر آنے کے لئے کہا، جس پر بادشاہ غیاث الدین نے کہا کہ وہ کھانے سے فارغ ہوکرمحل سے باہرآئے گا۔شیخ چلے گئے اور اسی وقت محل کی چھت گرنے سے بادشاہ جاں بحق ہوگیا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کومحل کی چھت گرنے کا الہام ہوگیا تھا۔مخدوم جہانیان سے جلال بخاری اور شیخ عثمان سیاح شیخ رکن الدین ابوالفتح کےمریدوں میں سے تھے۔۲۹

شیخ احمدمعشوق:

آپ شیخ صدر الدین عارف کے مریدوخلیفہ تھے۔تجارت کی غرض سے قندھار سے ملتان تشریف لائے ہیں۔شیخ صدرالدین سےآپ کی ملاقات ہوئی اورآپ ان کےمرید ہوگئے۔ ۳۰

مولانا شیخ حسام الدین:

آپ بھی شیخ صدر الدین عارف کےمریدوں میں سے تھے ۔آپ کو بدایوں میں رہنے کا حکم ملاتھا۔چنانچہ آپ آخر وقت تک وہیں رہےاور وہیں آپ کا مزار ہے۔ ۳۱

مخدوم جہانیان سید جلال الدین حسین بخاری:

آپ کے والد کانام سید احمد کبیر اور دادا کا نام سید جلال الدین بخاری تھا۔آپ کا لقب

مخدوم جہانیان ہے ۔آپ شیخ رکن الدین ابو الفتح کے مرید اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ ہوئے۔ چونکہ سیاحت بہت زیادہ کی تھی اسی لئے ' جہان گشت' کے نام سے مشہور ہیں۔فرشتہ نے آپ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا ذکرنہیں کیا ہے۔صرف اتنا لکھا ہے کہ ستتر (۷۷) سال کی عمر میں آپ بیمار ہوئے۔ روز بروز کمزور ہونے لگے اور عیدالاضحیٰ کی نماز کی ادائیگی کے بعد خالق حقیقی سے جاملے۔ ۳۲؎ آپ کا مزار اچہ میں ہے۔

شیخ عثمان سیاح:

آپ شیخ رکن الدین ابو الفتح کے مرید تھے۔شیخ عثمان نے ایک روز کیلوکھری میں دریائے جمنا کے کنارے شیخ رکن الدین کو دیکھا اور ان کے مرید ہوگئے۔مرید ہونے کے بعد شیخ عثمان نے دنیا ترک کردی۔ پھر آپ اپنے پسر کے ہمراہ ملتان گئے۔ وہاں سے آپ مکہ معظّمہ پہنچے۔ حج کرنے کے بعد دوبارہ ملتان آئے، جہاں شیخ رکن الدین نے آپ کو اپنا خاص لباس عطا کرکے دہلی میں حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ دہلی شیخ عثمان سیاح حضرت نظام الدین اولالیاء کی خدمت میں رہتے تھے اور سماع ووجد پسند کرتے تھے۔ ۳۳؎

سید محمد گیسودراز:

آپ شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی کے خلیفہ اور مرید تھے۔شیخ کے وصال کے بعد آپ دکن تشریف لے گئے اور وہاں کے تمام لوگ آپ کے مطیع وحلقہ بگوش ہوگئے۔آپ کا مزار حسن آباد، گلبرگہ، میں ہے۔

شیخ علائی:

آپ سلیم شاہ سوری کے عہد کے بزرگان دین میں سے تھے۔آپ کے والد کا نام حسن تھا۔ وہ شیخ دلیم چشتی کے مریدوں میں سے تھے۔اور قصبہ بیانہ میں شیخ سلیم چشتی کے سجادہ نشین تھے۔ والد کی وفات کے بعد شیخ علائی جو کہ علم وفضل میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اپنے والد کے قائم مقام ہوئے اور طالبان حق کی رشدو ہدایت میں مشغول ہوگئے۔ ۳۴؎

شاہ طاہر:

شاہ طاہر افریقہ کے اسمٰعیلیہ بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے۔ دینداری، تقویٰ اور علم میں بے نظیر تھے۔ بے شمار مشائخ کی صحبت میں رہ کر کسب فیض کیا۔ شاہ طاہر ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱۔۱۵۲۳ء میں احمد نگر تشریف لائے۔ سلطان برہان نظام شاہ نے ان کا استقبال کیا اور شاہانہ عنایتوں سے سرفراز کر کے درس وتدریس کے فرائض سپرد کیے۔ شاہ طاہر نے برہان نظام شاہ کو شیعہ مذہب کی طرف مائل کیا۔ ان کے زیر اثر نہ صرف بادشاہ بلکہ شاہی خاندان کے دیگر افراد اور اراکین سلطنت نے بھی شیعہ مذہب قبول کرلیا۔ شاہ طاہر کی وفات ۹۵۶ھ/ ۱۵۴۹ء میں ہوئی۔ احمد نگر میں تدفین عمل میں آئی، لیکن بعد میں ان کا جسد خاکی کربلائے معلیٰ بھیج دیا گیا، جہاں انہیں حضرت امام حسینؑ کے مزار کے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر سپرد خاک کر دیا گیا۔[۳۵]

حواشی:

۱۔تاریخ فرشتہ، ج ۱،س ۳

۲۔ایضاً، ج ۱،ص ۴۔

۳۔ایضاً

۴۔ایضاً، ج ۲،ص ۳۷۴

۵۔ایضاً، ج ۲،ص ۳۷۷

۶۔ایضاً، ج ۲،ص۳۷۹۔۳۸۰

۷۔ایضاً، ج ۲،ص۳۸۲،سیر الاولیاء،ص ۶۶ اور اخبار الاخیار،ص ۶۵ میں تاریخ وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ/ ۲۶نومبر ۱۲۳۵ء درج ہے۔

۸۔تاریخ ایضاً، ج۱،ص ۶۷

۹۔ایضاً، ج ۱،ص ۲۸۴

۱۰۔ایضاً، ج ۲،ص۳۹۰

۱۱۔ایضاً، ج ۲،ص ۳۹۳

۱۲۔ایضاً، ج ۱،ص ۲۷۴

۱۳۔ایضاً، ج ۲،ص۳۹۹

۱۴۔ایضاً، ج ۲،ص۳۹۹۔۴۰۰

۱۵۔تاریخ فرشتہ، ج ۲،ص ۴۰۰

۱۶۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۰۰۔۴۰۱

۱۷۔ایضاً، ج ۲،ص ۲۵۸

۱۸۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۰۴،اخبار الاخیار،ص ۲۷۷ اور طبقات اکبری،ص ۳۹۳ میں تاریخ وفات ۹۷۹ھ/ ۱۵۷۱۔۱۵۷۲ء درج ہے۔

۱۹۔ایضاً، ج ۲ ص ۴۰۴۔ ۴۰۵

۲۰۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۰۹۔ اخبار الاخیار،ص ۲۶۔۲۷ میں ۶۶۲ھ/ ۱۲۶۲۔۱۲۶۳ء درج ہے۔

۲۱۔ ایضاً، ج ۲،ص ۴۰۵۔۴۰۶

۲۲۔شیخ فخرالدین عراقی کی تاریخ وفات تاریخ گذیدہ ،ص ۷۸۳ھ/ ۱۳۸۴۔۱۳۸۵ء،نفحات الانس، ص ۵۴۵ میں ۷۸۸/ ۱۳۸۶۔۱۳۸۷ء اور تذکرۃ الشعراء ص ۱۶۲ میں ۲۰۹/ ۱۳۰۹۔۱۳۱۰ء نقل کی گئی ہے۔

۲۳۔تاریخ فرشتہ، ج ۲،ص ۴۹۶

۲۴۔ایضاً تذکرۃ الشعراء،ص ۱۶۸ میں ۱۶ شوال ۷۱۹ھ/ ۳۰ نومبر ۱۳۱۹ء درج ہے۔

۲۵۔ایضاً، ج ۲ ص ۴۱۵

۲۶۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۱۳

۲۷۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۱۱

۲۸۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۱۱

۲۹۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۱۲

۳۰۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۱۳

۳۱۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۱۴

۳۲۔ایضاً، ج ۲،ص ۴۱۷۔ بقول صاحب اخبار الاخیار(ص ۱۴۰) آپ کی ولادت شب برات ۷۰۷ھ/ جنوری ۱۳۰۸ء اور وفات عبد الاضحیٰ ۷۸۵ھ/ جنوری ۱۳۸۴ء میں اٹھتر (۷۸) سال کی عمر میں ہوئی۔ص ۱۴۰۔

۳۳۔تاریخ فرشتہ، ج ۲،ص ۴۱۴

۳۴۔ایضاً، ج ۲،ص ۲۳۲

۳۵۔ایضاً ،ج ۲،ص۱۱۸

مآخذ:

۱۔عبدالحق محدث دہلوی،اخبار الاخیار فی اسرار الابرار،مطبع مجتبائی، دہلی،۱۳۰۹ھ

۲۔حمد اللہ مستوفی ، تاریخ گذیدہ، بہ اہتمام دکتر عبدالحسین نوایی، مؤسسہ انتشارات امیر کبیر تہران، چاپ سوم، ۱۳۶۶

۳۔محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ ،تاریخ فرشتہ ،نولکشور، کانپور، ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۴ء

۴۔ دولت شاہ سمرقندی ، تذکرۃ الشعراء ،مقدمہ محمد رمضانی، انتشارات پدید خاور، چاپ دوم، ۱۳۶۶ھ

۵۔ سید امیر خورد کرمانی،سیر الاولیاء، بہ کوشش واہتمام محمد ارشد قریشی، مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان،مؤسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ہجری ۱۳۹۸ء

۶۔مولانا نظام الدین احمد بن محمد مقیم الہروی، طبقات اکبری ،نولکشور ، ۱۲۹۳/ ۱۸۷۵ء

۷۔ امیر حسن علاء سجزی، فوائد الفواد،تصحیح ومقدمہ وحواشی وفہارس محمد لطیف ملک، لاہور،طبع اوّل، ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء

۸۔عبد الرحمٰن جامی،نفحات الانس،نولکشور،لکھنؤ ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء

مثنوی مولانا روم میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر

ڈاکٹر سید کلیم اصغر
شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قرآن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم وبابرکت ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی عرب وعجم کی چپقلش کسی نہ کسی صورت میں نمایاں رہی ہے گوکہ اہل عرب ایرانیوں کو عجمی'' گونگا'' تصور کرتے رہے۔ لیکن حقیقت یہی تھی کہ ایرانیوں کی لشکری طاقت نے بھی ہمیشہ عربوں کو زیر رکھا اور تہذیب وتمدن میں بھی ایرانیوں کو عربوں پر برتری رہی یہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ ایرانیوں کے پاس اپنی ایک قدیمی سیاسی، سماجی تہذیبی اور ادبی روایت موجود رہی ہے، جس کی جیتی جاگتی تصویر شاہنامہ فردوسی ہے گوکہ اُس دور کی بھی عربی شاعری اپنی مثال آپ ہے۔ اسکے باوجود اگر قبل از اسلام کا فارسی ادب باقی رہ جاتا تو وہ بھی اپنی لاثانی اہمیت کا حامل ہوتا۔ جس کی زندہ مثال اوستا، گاتھا اور کتبوں پر باقی ایرانی ادب کے شہ پارے ہیں۔

پرودگار عالم نے خطہ عرب میں ہمارے پیغمبر جناب محمد مصطفیٰؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا اور واضح الفاظ میں عربوں کی قدیمی روایت کو نظرانداز کرکے انہیں جاہل قرار دیا جیسا کہ قرآن کریم کے سورہ جمعہ میں ارشاد ہوا ہے۔ هو الّذی بعث فی الامیین رسولاً مّنهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفی ضلل مبين۔" (وہی تو ہے جس نے جاہلوں میں ان ہی میں کا ایک رسول (محمدؐ) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتے ہیں اگرچہ اس کے پہلے تو یہ لوگ صریحی گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے۔)''[۱]

مکہ میں ہمارے رسولؐ کی آمد اور قرآن شریف کے نزول نے اس خطہ کو دنیا کے تمام خطوں پر جس میں ایران بھی شامل ہے فوقیت اور برتری بخش دی۔ ساتھ ہی یہ پیغام دیا کہ اب عجم پر عرب کو اور عرب کو عجم پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے، سب خدا کے بندے ہیں۔ مسلمان اور مومن ہونے کے ساتھ ساتھ سب بھائی بھائی ہیں جیسا کہ قرآن مجید کے سورہ الحجرات میں ملتا ہے: انما

المؤمنون اخوة:(بے شک مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں۔)۲؎

ان احکام وہدایات کے باوجود دونوں خطوں میں احساس برتری وکم تری کی سرد جنگ باقی رہی ۔ غالبًا یہی وجہ تھی کہ مولانا نے قرآنی افکار و واقعات کو اس طرح پرونے کی کوشش کی کہ اس مثنوی کو کسی نہ کسی معنیٰ کے اعتبار سے قرآن سے تشبیہ دی جاسکے۔مولانا حالی نے تو شاہنامہ فردوسی کو بھی قرآن عجم کہا ،مگر ان کا قول اتنا مشہور نہ ہوسکا جتنا کہ مولانا جامی کے اس دعوے یا شعر کو شہرت حاصل ہوئی کہ آج یہ زبان زد خاص وعام ہوگیا:

مثنوی معنوی مولوی ہست قرآن در زبان پہلوی

قرآنی واقعات میں پیغمبروں ،مشرکوں ،منافقوں یہاں تک کہ شیطان کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے ۔لیکن یہاں صرف ایک ایسے پیغمبرؑ کے بارے میں بحث کی جارہی ہے کہ جس کی حکومت خدا کی تمام خدائی پر محیط تھی۔کسی پیغمبر کی یہ ظاہراً پہلی اور آخری حکومت ہے جو انسانوں ، حیوانوں یہاں تک جنات بھی ان کے فرمان کے تابع تھے۔مولانا روم جناب سلیمانؑ کے واقعات کو اصل مآخذ کے طور پر نظم کرکے اس سے قرآنی اور تاریخی نتائج نکالتے ہیں۔ یہاں مثنوی کے ایسے اشعار کو زیر بحث لایا جارہا ہے جن کی مناسبت کلام خدا، حدیث رسول اور تاریخی شہادت پر مبنی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ جناب سلیمانؑ کی فرمانروائی تمام خدائی پر تھی لیکن ایک خطہ ایسا بھی تھا جس کی خبر ہدہد کے ذریعہ ان تک پہونچی۔قرآن مجید نے حضرت سلیمانؑ اور ہد ہد کے واقعہ کو سورہ نمل کی آیات میں اس طرح پیش کیا ہے جب سلیمان نے اپنے لشکر کی طرف غور سے دیکھا تو ہد ہد غائب تھا پس حضرت سلیمانؑ نے فرمایا:

”وتفقّد الطّير فقال مالی لآ اری الهدهد ، ام كان من الغآئبين ۔ لاعذّبنّه عذاباً شديدا اولاذبحنه اولياتينی بسلطان مبين ۔ فكمث غير بعيد فقال احطت بمالم تحط به وجئتك من سبام بنبإٍ يقين۔ انی وجدت امراة تملكهم واوتيت من كل شئٍ ولها عرش عظيم ۔ وجدتها وقومها يسجدون للشمس من دون اللّٰه وزين لهم الشيطان اعمالهم فصدهم عن السبيل فهم لايهتدون۔“

(اورسلیمانؑ نے پرندوں (کے لشکر) کی حاضری لی تو کہنے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو (اس جگہ پر) نہیں دیکھتا یا (واقعی میں) وہ غائب ہے۔اگر ایسا ہے تو میں اسے سخت سزادوں گا یا

(نہیں تو) اسے ذبح ہی کرڈالوں گا یا وہ (اپنی بے گناہی کی) کوئی صاف دلیل میرے پاس پیش کرے۔غرض حضرت سلیمانؑ نے تھوڑی ہی دیر توقف کیا تھا کہ (ہد ہد آ گیا) تو اس نے عرض کی مجھے وہ بات معلوم ہوئی ہے جو اب تک حضور کو بھی معلوم نہیں ہے۔ اور میں آپ کے پاس شہر سبا سے ایک تحقیقی خبر لے کر آیا ہوں میں نے ایک عورت کو دیکھا جو وہاں کے لوگوں پر سلطنت کرتی ہے او راسے (دنیا کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے اور اس کا ایک بڑا تخت ہے ، میں نے خود ملکہ کو دیکھا اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے کرتوتوں کو (ان کی نظر میں اچھا کردکھایا ہے۔ اور ان کو راہ راست سے روک رکھا ہے'' [۳۳] اسی لئے مولانا نے ''ہد ہد'' کو اپنی مثنوی میں ایک خاص اہمیت کا حامل بنا کر پیش کیا اور ایک حکایت کا عنوان ہی اسی کے نام سے منسوب کرڈالا۔''قصہ ہدہد وسلیمان دربیان آنکہ چون قضا آید چشم ہای روشن بستہ شود۔'' یہ حکایت ہدہد سے منسوب کردی۔ اس عنوان کے تحت ۱۱۹ شعروں میں ہد ہد کی زیرکی اور دور اندیشی کے ساتھ ساتھ زمین کی پرتوں کے جائزے لینے والی نگاہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

یہ حکایت جو مولانا نے دفتر اول میں تحریر کی ہے اس طرح شروع ہوتی ہے۔

چون سلیمان را سراپردہ زدند — پیش او مرغان بخدمت آمدند
ہم زبان و محرم خود یافتند — پیش اویک یک بجان بشتافتند
جملہ مرغان ترک کردہ چیک چیک — باسلیمان گشتہ افصح من اخیک
ہم زبانی خویشی و پیوندیست — مرد بانا محرمان چون بندیست
ای بسا ہندو وترک ہم زبان — ای بسا دو ترک چون بیگانگان
پس زبان محرمی خود دیگر است — ہم دلی از ہم زبانی بھتر ست
غیر نطق و غیر ایمان و سجل — صد ہزار ان ترجمان خیزد زدل
جملہ مرغان ہر یکی اسرار خود — از ہنر وزد دانش و از کار خود
باسلیمان یک بیک وا مینمود — از برای عرضہ خود را میستود
از تکبرنی، و از ہستی خویش — بھر آن تارہ دہد او را بیش
چون بباید بردہ را از خواجۂ — عرضہ دارد از ہنر دیباجۂ
چونک دارد از خریدارِیش ننگ — خود کند بیمار وشل وکرو لنگ

نوبت هدهد رسید و پیشه اش — وان بیان صنعت و اندیشه اش

گفت ای شه یک هنر کان کهتر است — باز گویم گفت، کوته بهتر است

بنگرم از اوج باچشم یقین — من ببینم آب در قعر زمین

تاکجا است و چه عمقش، چه رنگ — از چه می جو شد زخاکی یا زسنگ

ای سلیمان بهرِ لشکر گاه را — درسفر می دار این آگاه را

پس سلیمان گفت ای نیکو رفیق — در بیابانهای بی آب عمیق

گفت بد گوتا کد امست آن هنر — گفت من آنگه که باشم اوج بر

خاک زن در دیدهٔ حس بین خویش — دیدهٔ حس دشمن عقلست وکیش

دیدهٔ حس را خدا اعماش خواند — بت پرستش گفت وضد ماش خواند

زانک او کف دید و دریا ندید — زانک حالی دید و فردا را ندید [۴]

(ترجمہ: جب سلیمانؑ کا خیمہ لگا، تمام پرندے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کو اپنا ہم زبان اور محرم پایا اور ایک ایک کرکے دل وجان سے آپ کی طرف دوڑے ۔ تمام پرندوں نے چیں چھوڑ کر حضرت سلیمانؑ سے بات کرنا شروع کی اور ان ہی کی زبان میں حضرت سلیمانؑ نے پرندوں سے بات کی ۔ ایک دوسرے کا ہم زبان ہونا انسان کو نزدیک لاتا ہے اور اگر ہم زبان نہیں ہوتو ایسا لگتا ہے کہ جیسے نامحرموں کے ساتھ قیدی ہو۔ چاہے دو الگ الگ ملک وقوم کے لوگ اگر ہم زبان ہوں تو اپنے لگتے ہیں، اگرچہ ایک ہی مذہب وقوم کے لوگ ہم زبان نہیں ہوں تو اجنبی لگتے ہیں۔ اسی لئے محرمیت کی زبان دوسری زبان ہے۔ ہم دل ہونا ہم زبانی سے بہتر ہے۔ بغیر بولے اور بغیر اشارے اور بنا تحریر کے دل سے لاکھوں ترجمان پیدا ہوجاتے ہیں۔ تمام پرندوں میں سے ہر ایک نے اپنے راز، ہنر اور اپنے کام حضرت سلیمانؑ سے کہنے شروع کئے اور اپنی اپنی تعریف کرنی شروع کی۔ خود اپنے آپ کو نمایاں کرنا تکبر کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ تمام لوگ حضرت سلیمانؑ تک پہونچنا چاہتے تھے۔ جب ہد ہد کا نمبر آیا تو اس کی کاریگری اور تدبیر کا بیان ہوا، تو اس نے کہا: اے شاہ! میں بھی ایک چھوٹا ہنر جانتا ہوں اور اس کو مختصراً بیان کرتا ہوں، حضرت سلیمانؑ نے کہا، بتاؤ وہ ہنر کیا ہے۔ تو اس نے کہا: جس وقت میں بلندی پر ہوتا ہوں، بلندی سے یقین کی آنکھ سے دیکھتا ہوں، تو زمین کی گہرائی میں پانی تک کو دیکھ لیتا ہوں کہ کہاں ہے کتنی گہرائی میں ہے اور کس رنگ کا ہے۔ اور

کس چیز سے ابل رہا ہے مٹی میں سے یا پتھر سے۔ پھر ہد ہد نے کہا اے سلیمانؑ مجھ ناچیز کو ساتھ رکھو۔حضرت سلیمانؑ نے کہا تم ہمارے ساتھی بن جاؤ تاکہ ان بیابانوں میں جہاں پانی میسر نہیں ہے۔ اچھے دوست ثابت ہو۔

اس حکایت سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آجاتی ہیں ایک تو یہ کہ ہدہد ایک علامت بن کر سامنے آیا ہے، جو کسی دوسرے حیوان یا پرندے کو نصیب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حکایت میں ہد ہد کی دوربین نگاہ کی طرف اشارہ ہے کہ ہد ہد زمین کے اندر کی چیزوں تک کی معلومات رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا لوگوں کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ زمین کی پرتو پر بھی نظر رکھنا چاہئے۔ جس کے اندر ایک گرانمایہ سرمایہ چھپا ہوا ہے اور آج یہ سرمایہ پٹرول ، سونا، چاندی اورکوئلہ وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوکر انسانی زندگی کا اہم جز بن چکا ہے:

لیکن مولانا رومی نے ہد ہد کے قصہ کو دفتر پنجم کے'' قصہ محبوس شدن آن آہو بچہ در آخر خزان'' کے تحت تین شعروں میں نظم کیا ہے۔

تا سلیمان گفت کان ھدھد اگر ۔۔۔ عجز را عذری نگوید معتبر!!!!
بکشمش یا خود دھم او را عذاب ۔۔۔ یک عذاب سخت بیرون از حساب
ہان کدا مست ان عذاب ای معتمد ۔۔۔ در قفس بودن بغیر جنس خود ۵

(ترجمہ: حضرت سلیمانؑ نے فرمایا: اگر ہدہد نے کوئی معقول عذر نہیں بتایا تو میں اس کو قتل کردوں گا یا اس کو بہت سخت عذاب دوں گا ایسی سزا کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جان لو وہ عذاب یعنی وہ سزا کیا ہے کہ اس کو پنجرہ میں بغیر اس کے ساتھی کے تنہا رکھا جائے گا۔)

تاریخ اسلام نے ہد ہد کے واقعہ کو اور خاص طور پر سے حضرت سلیمانؑ کا خط بلقیس تک پہونچانے کو اس طرح نقل کیا ہے:

''ہد ہد کے یہ کہنے پر کہ میں ملکہ سبا بلقیس اور اس کے تخت کی خبر لایا ہوں حضرت سلیمان نے فرمایا'' سننظر اصدقت امکنت من الکاظمین" اچھا ابھی معلوم ہوجائے گا تو سچ بول رہا ہے یا جھوٹ (قرآن مجید)۔ سن میں ایک خط لکھ کر تجھے دئے دیتاہوں،تو اسے لے جا کر ان کے پاس ڈال دے اور ان کی نگاہوں سے چھپ کر دیکھ کہ وہ لوگ اس خط کے بارے میں کیا گفتگو کرتے ہیں؟ہدہد نے عرض کی حضور باسر وچشم تعمیل حکم کروں گا، جس سے میری صداقت ظاہر ہوجائے گی ۔

ہدہد وہ خط اپنی منقار میں لے کر اڑا اور شہر سبا پہنچ گیا وہاں پہنچ کر اس نے موقع کی تلاش کی اور حضرت سلیمانؑ کے خط کو اس کے دست خاص میں پہنچادیا۔'' ٦

لیکن مولانا رومی نے اسی واقعہ کو دفتر دوم میں '' عکس تعظیم پیغام سلیمان علیہ السلام در دل بلقیس از صورت هد هد'' کے عنوان سے بڑے خوبصورت انداز میں اس طرح نظم کیا ہے:

رحمت صد تو بر آن بلقیس باد — کہ خدایش، عقل صد مژدہ بداد
ہدہد نامہ بیاورد و نشان — از سلیمان چند حرفی بابیان
خواند او آن نکتھای باشمول — با حقارت ننگرید اندر رسول
چشم ہدہد دید و جان عنقاش دید — حس چو کف دید و دل دریاش دید
عقل باحس زین طلسمات دو رنگ — چون محمد با ابو جھلان بجنگ
کافران دیدند احمد را بشر — چون ندیدند از وی آن شقُّ القمر
خاک زن در دیدۂ حس بین خویش — دیدۂ حس دشمن عقلست و کیش
دیدۂ حس را خدا اعماش خواند — بت پرستش گفت و ضد ماش خواند
زانک او کف دید و دریا ندید — زانک حالی دید و فردا را ندید ۷

(ترجمہ: اس بلقیس پر سوگنی رحمت ہو کہ اس کو خدا نے عقل مندی کی انتہا تک پہونچادیا ہے۔ ایک ہدہد حضرت سلیمانؑ کی جانب سے وضاحتی نامہ لیکر حاضر ہوا، اس نے نامہ کے جامع نکات پڑھے اور سلیمان کے قاصد ہدہد کو عزت دی یعنی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ آنکھ نے تو ہدہد دیکھا لیکن جان نے اس کو عنقا دیکھا، حس نے اس کو جھاگ دیکھا اور دل نے اس کو دریا دیکھا۔ ان دورنگی طلسمات کی وجہ سے عقل حس کے ساتھ جنگ میں رہتی ہے جیسے محمدؐ ابوجہلوں کے ساتھ، کافروں نے احمدؐ کو صرف بشر دیکھا۔ جبکہ ان سے شق القمر کا معجزہ نہیں دیکھا، گیا۔ اپنی حسی آنکھ پر خاک ڈال حسی آنکھ، عقل ومذہب کی دشمن ہے حسی آنکھ کو خدا نے اندھا کہا ہے، اس کو بت پرستی کہا ہے اور دشمن قرار دیا ہے، کیونکہ اس نے جھاگ دیکھے اور دریا کو نہ دیکھا کیونکہ اس نے موجودہ حالت دیکھی اور انجام نہ دیکھا۔

مولانا روم نے اپنے ان اشعار میں بلقیس کی ذہانت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خداوند عالم نے اس کو سینکڑوں مردوں جیسی عقل عطا کی تھی اور بلقیس نے جو فیصلہ کیا وہ عقل سے کیا اور اس کے

ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بلقیس نے ہدہد کو کتنی عزت بخشی۔ ظاہری آنکھ میں وہ ہدہد تھا مگر چونکہ وہ حضرت سلیمانؑ کا قاصد تھا لہٰذا باطنی نگاہ نے اس کو عنقا سمجھا۔ اور ایک اہم نکتہ کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جیسا کہ اس شعر میں بیان کیا گیا ہے:

کافران دیدند احمد را بشر　　　چون ندید از روئے آن شقُّ القمر

اس شعر میں بتایا گیا ہے کہ کافران آنحضرتؐ کی ظاہری بشریت کو دیکھتے تھے اور روحانی عظمت کو جس، کا کرشمہ شق القمر کا معجزہ ہے، نہیں دیکھتے تھے۔

مولانا رومی اس شعر میں اس طرف اشارہ کررہے ہیں کہ پیغمبرؐ کو اپنا جیسا بشر نہیں کہو کیونکہ پیغمبر اس شخصیت کا نام ہے کہ جس کے اشارہ پر چاند دوٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ بظاہر تو ہم جیسے ہیں لیکن ہم ان کی روحانیت کا اندازہ نہیں لگاسکتے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا کی طرف سے معجزات عطا کیے گئے تھے۔ لہٰذا کبھی بھی پیغمبر ہم جیسے نہیں ہوسکتے۔ قرآن کریم اور تاریخ دونوں الگ الگ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بلقیس نے پیغام ملنے کے بعد حضرت سلیمانؑ کو ہدیہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ بلقیس اس بات کو جاننا چاہتی تھیں کہ آیا سلیمانؑ صرف بادشاہ وقت ہیں یا نبی بھی ہیں۔ وہ رموز نبوت ورسالت سے اچھی طرح واقف تھیں اس لئے یہ سمجھتی تھیں کہ اگر وہ صرف بادشاہ ہیں تو ہم ان کا مقابلہ کرسکیں گے اور اگر نبی ہیں تو ان کا مقابلہ ناممکن ہے۔ ان کا خیال یہ تھا اگر ہدیہ قبول کرلیں گے تو جان جاؤں گی وہ صرف بادشاہ ہیں۔ اور اگر رد کردیں گے تو یقین کرلوں گی کہ وہ نبی بھی ہیں۔ الغرض بلقیس نے ہدیہ کا انتظام کیا۔ بہت سے حوروغلمان جیسے لڑکے لڑکیاں بہترین جواہرات کی زین اور بہترین گھوڑوں پر سوار کرکے روانہ کئے گئے جن کے لباس بدلے ہوئے تھے۔ اور پانچ سو سونے کی اینٹیں روانہ کی گئیں۔ اور ایک جواہرات کا بنا ہوا صندوق تیار کیا گیا جس میں ایک موتی تھا جو بہت صاف ستھرا تھا۔ یہ سب تحفے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بلقیس کی طرف سے روانہ کئے گئے اور بلقیس اس چیز کا شدت سے انتظار کررہی تھیں کہ ہدیہ قبول ہوتا ہے یا نہیں اگر حضرت سلیمانؑ صرف دنیاوی بادشاہ ہوتے تو اس ہوا وہوس کے جال میں گرفتار ہوکر ان تحائف کو قبول کرلیتے لیکن سلیمانؑ نے ہدیہ واپس کردیا اور بتادیا ہم دنیاوی بادشاہ نہیں ہیں جو ہوا وہوس کے چکر میں آجائیں گے۔ ہم تو اس کی طرف سے آئے ہیں ہم کو مال وزر کی کوئی پرواہ نہیں ہے مال وزر تو خود ہمارے غلام ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی نے بہت ہی دلکش

انداز میں اس داستان کو دفتر چہارم میں اس طرح نظم کیا ہے:

هدیه بلقیس چل استر بدست   بار آنها جمله خشت زر بدست
چون بصحرای سلیمانی رسید   فرش آنرا جمله زر پخته دید
بر سر زر تا چهل منزل براند   تا که زر را در نظر آبی نماند
بارها گفتند زر را وا بریم   سوی مخزن ماچه بیگارا اندریم
عرصهٔ کش خاک زر ده دهیت   زربهدیه بردن آنجا ابلهیست
ای ببرده عقل هدیه تااله   عقل آنجا کمتر است از خاک راه
چون کساد هدیه آنجا شد پدید   شرمسار بشان همی واپس کشید
باز گفتند از کساد و ار روا   چیست برمابنده فرمانیم ما
گر زر و گر خاک ما را بردنیست   امر فرمان ده بجا آورد نیست
گر بفرمایند که واپس برید   هم بفرمان تحفه را باز آورید
خندش آمد چون سلیمان آن بدید   کز شما من کی طلب کردم ثرید
من نمیگویم مرا هدید دهید   بلک گفتم لایق هدیه شوید
که مرا از غیب نادر هدیه ها ست   که بشر آنرا نیار دنیز خواست
میپرستید اختری کو زو کند   روبار آرید کو اختر کند
می پرستید آفتاب چرخ را   خوار کرده جان عالی نرخ را
آفتاب از امر حق طباخ ماست   ابلهی باشد که گویم او خداست
آفتابست گر بگیرد چون کنی   آن سیاهی زو تو چون بیرون کنی ۸

(ترجمہ: بلقیس کا ہدیہ چالیس اونٹوں پر مشتمل تھا اور ان چالیس اونٹوں پر سونے کی اینٹیں لدی ہوئی تھیں۔ جب یہ لوگ ہدیہ بلقیس لیکر حضرت سلیمانؑ کے علاقہ میں داخل ہوئے تو وہاں سارا فرش سونے کا دیکھا اور چالیس منزل تک وہ سونے پر چلتا رہا اور یہاں تک کہ ہدیہ لانے والے کی نظر میں سونے کی کوئی وقعت نہیں رہی ۔ ان سے باربار کہا گیا تم اپنا ہدیہ واپس لے جاؤ، ہم کو خزانے کی طرف دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ وہ علاقہ جس کی زمین خالص سونے کی ہو، وہاں تحفہ میں سونا لے جانا بیوقوفی ہے۔ اے عقل کا ہدیہ اللہ کی جانب لیجانے والے، وہاں عقل راستہ کی مٹی سے کم

ہے۔ اور جب تحفہ کا گھٹیا پن وہاں کھل گیا، تو وہ شرمساری کی وجہ سے واپس ہوگئے ۔ جہاں اتنا سونا ہو کہ چلیں بھی تو سونے پر، وہاں سونے کی کیا وقعت ہے پھر ان لوگوں نے کہا ہمیں گھٹیا پن اور بڑھیا پن سے کیا مطلب ہم تو حاکم کے حکم کے تابع ہیں چاہے سونا ہو، چاہے مٹی ہو۔ ہم کو تو حاکم کا حکم بجالانا ہے۔ اگر وہ حکم دیں کہ اس کو واپس لے آؤ تو حکم ہی سے تحفہ واپس لے جائیں گے۔ حکم اور فرمان ہم کو سننا ضروری ہے اور وہاں تک جہاں تک کا حکم دیا گیا ہے ہدیہ لے جانا چاہئے۔ ہدیہ لے کر شاہ جہاں یعنی حضرت سلیمانؑ کے تخت کی طرف تیزی سے روانہ ہوئے۔ جب پیغمبر سلیمانؑ نے اس کو دیکھا تو ہنسی آگئی اور کہا میں نے تم سے صرف ایمان طلب کیا ہے ۔میں نے تم سے کب کہا ہے کہ تم مجھ کو ہدیہ دو میں نے تو یہ کہا ہے کہ تم ہدیہ کے لائق بن جاؤ، یعنی صاحب ایمان ہوجاؤ۔میرے پاس تو غیب سے انوکھے ہدیہ ہیں کہ انسان اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔تم ستاروں کو پوجتے ہو، کیونکہ وہ سونا بناتا ہے،تم اس کی طرف رخ کروجو ستاروں کا خالق ہے۔تم آسمان کو پوجتے ہو اورتم نے اپنی کوعزیز وگرانقدر جان کو ذلیل کردیا۔ سورج کو پوجنے سے کیا فائدہ؟ سورج تو خدا کے حکم سے ہمارا باورچی ہے۔ اور ہم اس کو خدا کہیں تو یہ ہماری حماقت ہے۔ اگر تیرا سورج گہن میں آگیا تو کیا کرے گا، پھر تو اس کا دھبّہ کیسے ہٹائے گا۔)

اس داستان میں مولانا رومی نے بہت سے اہم نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ بلقیس سلیمانؑ کو دنیاوی بادشاہ سمجھ رہی تھی لیکن جب ہدیہ پیغمبر سلیمانؑ کے پاس پہونچا اور سلیمانؑ نے لینے سے انکار کردیا تو اندازہ ہوگیا یہ دنیاوی بادشاہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو پیغمبر خدا ہیں۔لیکن اس داستان میں مولانا نے بڑے ہی دلکش انداز میں بلقیس اور ان کے لوگوں کو دعوت اسلام دی ہے۔ ایک شعر میں مولانا فرماتے ہیں :

من نمی گویم مرا ہدیہ دہید بلک گفتم لایق ہدیہ شوید

(یعنی مولانا کہہ رہے ہیں حضرت سلیمانؑ بتانا چاہتے ہیں کہ میں نے تم سے کب ہدیہ طلب کیا ہے۔ ہدیہ تو دنیاوی لوگ مانگتے ہیں، میں تو تم کو دعوت ایمان دے رہا ہوں کہ تم صاحب ایمان ہوجاؤ یہی ایمان تمہیں ہدیہ دینے کے لائق بنائے گا۔مجھ کو تو غیب سے ایسے ہدیہ ملتے ہیں، جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا پھر حضرت سلیمانؑ کہتے ہیں، ارے تم ستاروں کو کیوں پوجتے ہو، آفتاب کو کیوں سجدہ کرتے ہو،تم تو اس ذات کو سجدہ کرو جس نے ستارہ بنایا اورتم سورج کو

سجدہ کر کے کیوں اتنی عزیز جان کو پریشان کررہے ہو آفتاب کیا ہے، یہ آفتاب تو حکم خدا سے ہمارا باورچی ہے۔ باورچی یعنی گرمی پہونچانے والا ارے اس سورج کو سجدہ کرنا اس کو خدا کہنا کتنی بڑی حماقت ہے ۔تم کونہیں معلوم سورج کو گہن لگ جاتا ہے اور اگر گہن لگ گیا تو اس کا دھبہ چھٹانا مشکل ہے۔ لہٰذا ہوش سے کام لو اور خدائے واحد کے سامنے سجدہ کرو۔ یہ ہیں بندگان خدا واقعاً یہ مولانا رومی کا کمال ہے کہ جنہوں نے اتنے حسین اندازن میں قرآنی اور تاریخی واقعات کو پرو دیا ہے کہ جس کوسمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ در اصل اس حوالے سے وہ مخلوق خدا کے دل سے دنیاوی ہوا و ہوس کو دور رہنے کےتئیں آمادہ کرنا چاہتے ہیں اور خدا کےعشق میں سرشار ہوکر اس کے دین کو عام کرنا چاہتے ہیں، تاکہ خدا کی معرفت ہر انسان کو حاصل ہوسکے۔

غرض کہ حضرت سلیمانؑ کی تبلیغ کا بلقیس پر اس حد تک اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہوکر خدا کے خاص بندوں کے ذیل میں شامل ہوگئی۔

مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں حضرت سلیمانؑ کی عظمت کو بتاتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ پیغمبر سلیمانؑ ایک ننھی سی چیونٹی (جن کو ظاہراً چھوٹا ہونے کے سبب نگاہ میں نہیں لایا جاتا) کی بھی کتنی عزت کرتے تھے اور اس کی زبان کو سمجھتے تھے۔ اس کو مولانا اپنی مثنوی کے دفتر چہارم میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

پس سلیمان از دلش آگاہ شد کز دل او تا دل او راہ شد
آنکسی کہ بانگ موران بشنود ہم فغان سر دوران بشنود
آنک گوید راز قالت نملۃ ہم بداند راز این طاق کہن ۹

(ترجمہ: حضرت سلیمانؑ اسکے دل کے راز سے واقف ہوگئے کیونکہ ان کے دل سے ان کے دل تک راستہ تھا۔ جوشخص چیونٹی کی آواز دور سے سن لے اور زمانے کے فریادی راز سے واقف ہوں وہ نبی ہی ہوسکتا ہے۔

قرآن کریم نے اس واقعہ کوسورہ نمل میں باتفصیل بیان کیا ہے: قالت نملة يايّها النّمل ادخلوا مساكنم لا يحطمنّكم سليمان وجنودهٗ وهم لايشعرون ، فتبسّم ضاحكاًمّن قولها۔'' (یہاں تک کہ جب (ایک دن) چیونٹیوں کے میدان میں آنکلے تو)۱۰ایک چیونٹی بولی اے چیونٹیو ! اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ، ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمہیں روند ڈالے اور انہیں

اس کی خبر بھی نہ ہو، تو سلیمان اس کی اس بات سے مسکرا کے ہنس پڑے ۔[۳] یہ واقعہ جس کو قرآن مجید نے نقل کیا ہے اور مولانا رومی نے اس کو اپنے اشعار میں سمویا ہے، ہمارے تئیں درس آموز ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں پیغمبر سلیمانؑ کی سماعت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ تقریباً ایک فرسخ دوری پر تھے اور آپ نے چیونٹی کی آواز سن لی۔ دنیا میں آج تک کوئی ایسا آلہ نہیں بنا، جس سے آدمی چیونٹی کی آواز سن سکے اور اگر سن بھی لے تو یہ نہیں سمجھ سکتا کہ چیونٹی کیا کہہ رہی ہے یہ قوت صرف خدا نے حضرت سلیمانؑ کو عطا کی تھی۔ اس واقعہ میں دوسری عبرت آمیز چیز، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ چیونٹی جیسی چھوٹی مخلوق جس کو عام طور سے نظر میں نہیں لایا جاتا، ان کا سردار اپنے لشکر کی حفاظت کے تئیں کتنا فکر مند ہے کہ اپنے لشکر سے کہتا ہے کہ تم اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں کچل دے۔ اور سردار کو ایسا ہی ہونا چاہئے، لیکن آج کے دنیاوی سرداروں اور سیاسی راہنماؤں کو دیکھئے کہ وہ پبلک کے ووٹوں پر راج کرتے ہیں اور ان کی محافظت کے بجائے ان کو قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ کاش ہم ننھی چیونٹی سے عبرت حاصل کریں۔ اسی لئے مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو ہم لوگوں کے لئے عبرت آمیز ہے۔ اگر ہم مثنوی مولانا روم کا عمیق مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ مولانا نے قرآن اور حدیث ہی کے مطابق واقعات مثنوی میں بیان کر کے مخلوق خدا کو جگانے اور بیدار کرنے، اور ایک دوسرے کی حفاظت کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے، کاش کہ ایسا ہوجائے تو دنیا امن وامان سے زندگی بسر کرے۔ اور یہی پیغام مولانا روم کا ہے۔ اس لئے یونسکو نے سال ۲۰۰۷ کو مولانا روم کا سال قرار دیا ہے، کیونکہ آج ان کے نظریات پیش کرنے کی سخت ضرورت ہے، تاکہ دنیا میں امن وامان قائم ہوسکے اور لوگ سکون سے زندگی بسر کرسکیں۔

مآخذ:

۱۔قرآن مجید، سورہ جمعہ، آیت ۲، ترجمہ حافظ مولانا سید فرمان علی، نظامی پریس، لکھنؤ

۲۔ایضاً سورہ حجرات، آیت ۱۰۔

۳۔ایضاً سورہ نمل، آیات ۲۰ سے ۲۴ تک

۴۔مثنوی معنوی، تصحیح رینولد الین نکلیسون، لیدن، ھلالند، ۱۹۲۵، ۱۹۳۳

۵۔ایضاً دفتر پنجم،ص ۸۳۳
۶۔سید نجم الحسن کراروی، تاریخ اسلام، جلد اول، نظامی پریس،لکھنؤ ، مارچ ۲۰۰۵ء،صفحہ ۵۴۹
۷۔ مثنوی معنوی، دفتر چہارم ،ص ۲۵۴
۸ایضاً،ص ۶۵۴
۹۔ایضاً ،ص ۶۶۹۔
۱۰۔قرآن مجید وسورہ نمل آیت ۱۸، ۱۹

عرفان وتصوف -انحراف یا اعتدال؟

مہدی باقر معراج

قدامت کے لحاظ سے تصوف کو قبل اسلام بھی تلاش کیا جاسکتا ہے مگر ظاہر ہے کسی چیز کی کہنگی اور تقدم اس کے سو فیصد درست ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مابعد اسلام نے جہاں زندگی کے تمام طریقہ کار کو متاثر کیا وہاں یہ صاحبان طریقت بھی شریعت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لہٰذا بعضوں نے ''صوفی ازم'' کے ظواہر وعوارض پر اکتفا کی اور عملاً طریقت کے تقاضوں کو شریعت کے احکام پر ترجیح دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس کی تمام تر جذابیت اور نتیجہ خیز یوں کے علماء، دانشوروں اور صاحبان نظر کے بیچ ''صوفی ازم'' ایک باقاعدہ موضوع بحث بن گیا۔

درحالیکہ اگر شرح صدر اور وسعت نظر کے ساتھ جایزہ لیا جائے، تو ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ تصوف اگر ماسوائے اسلام کوئی اصطلاح وتصور ہے تو زیر بحث آنا ہی نہیں چاہئے اور اگر یہ شامل اسلام ہے تو اس کا منصفانہ تجزیہ ضروری ہے، جیسا کہ خود صوفیائے بھی اس پر گفتگو کی ہے۔

ظاہر ہے کہ دین اسلام نے انسان کو مسلمان، مومن اور پھر منزل کمال پر اسے متقی دیکھنا چاہا ہے۔ اگر تصوف۔ ماسوائے اسلام، ایمان اور تقویٰ ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اگر ایک صوفی اچھا مسلمان، مرد مومن اور اعلیٰ درجہ کا متقی ہے، تو یہ اس کا امتیاز بھی ہے اس کی انفرادیت بھی۔

در اصل یہ ڈگر اتنی خطرناک ہے کہ جس میں منزل ملنے کا یقین بھی ہے اور راستہ گم ہونے کا خدشہ بھی۔ جو گم گشتۂ راہ ہوجاتے ہیں، وہ نہ صرف فکری انحراف بلکہ عملی بدذوقی کا بھی شکار ہوجاتے ہیں، احساس شکست وشرمندگی انہیں ایسی ظاہر داری اور عوارض کو اوڑھ لینے پر مجبور کردیتی ہے جو انہیں دیگر بندگان خدا سے اس طرح علیحدہ کردیتی کہ ان کی عام زندگی اور طریقۂ زندگی سے کوئی واسطہ اور سروکار ہی نہ رہ جائے۔ چنانچہ اس کے لئے انہیں منفرد اور مختلف ملبوسات سے لیکر درویشانہ اور فقیرانہ حلیہ اپنانے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں اپنے اہل وعیال، گھر بار، پاس پڑوس، عزیز ورشتہ دار، سماج اور معاشرہ سب کچھ تیاگ کے کسی قبر ومزار کے گوشہ وکنار کا سہارا لینا پڑتا ہے، درحالیکہ اسلام نے جو انسان کو مہذب وباوقار طریقۂ حیات دینا چاہتا ہے کبھی بھی اس طرح کی

غیر فطری اور غیر معتدل زندگی جینے پر مجبور نہیں کیا، چنانچہ اگر ہم اسلامی تاریخ تصوف کے سب سے بڑے صوفی حضرت علیؑ کی طرز زندگی کا مطالعہ کریں تو ہم پائیں گے کہ آپ نے دوران خلافت بھی اتنی سادہ اور عام زندگی گذاری کہ ایک بڑھیا نے آپ کو عام عربی سمجھ کر اپنا بوجھ اٹھانے میں مدد کا مطالبہ کیا تو آپ نے اسے اپنے سر پر رکھ کر اس کے گھر تک پہونچا دیا۔ اس نے شکریہ ادا کرتے وقت آپ کا نام جاننا چاہا تو آپ نے فرمایا ''میں علی ابن ابی طالبؑ ہوں۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور وارثین اسلام نے حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کو کتنی اہمیت دی ہے، اور اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ سادگی اور انکساری کی مہار ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

پس تصوف کا عام تصور اور صوفی کی عام تصویر جو ہمارے ذہنوں میں ہے، وہ مکتب رسول وآل رسولؐ سے قطعاً معارض اور مغایر ہے۔ اسلام نے انسان دوستی کو آدم بیزاری پر اور سلجھی ہوئی معاشرتی زندگی کو تذبذب اور گوشہ نشینی پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اس نے کبھی بھی خشک پارسائی اور کو روا نہیں رکھا۔ علاوہ ازیں مقبروں پر بیٹھ کر اپنا قد اونچا کرنے والوں اور صاحب قبر کی للّٰہیت کا خراج وصول کرنے والوں کو اسلام قطعاً سراہنے کو تیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معصومین علیہم السلام نے ایسے نام نہاد درویش اور صوفی نما افراد سے دھوکہ نہ کھانے کے لئے ہوشیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے پیغمبرؐ اکرم کا قول پیش ہے۔ رسول اسلامؐ جناب ابوذر سے فرماتے ہیں: میری امت میں ایسے لوگ بھی دکھائی دیں گے، جن کا لباس غیر اسلامی اور غیر مروج ہوگا اور وہ لوگ اس کو اپنی منزلت وعظمت کا سبب سمجھیں گے۔ صادق آل محمدؑ فرماتے ہیں'' وہ یعنی صوفی نما اور بناوٹی درویش حضرات ہمارے دشمن ہیں اور جو ان سے اظہار عقیدت کرے، وہ ہم میں سے نہیں''۔ امام محمد تقیؑ کے ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا تھا کہ چند صوفی نما افراد کی جماعت مسجد میں داخل ہوئی اور کنارے بیٹھ کر مصروف ذکر وفکر ہوگئی، تو امامؑ نے فرمایا ان لوگوں کے قرب میں نہ جانا۔''[۱]

علاوہ ازیں علماء کی طویل فہرست ہے، جو مروجہ صوفی ازم سے شاکی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ میرزا جواد آقا ملکی جو خود بہت بڑے عارف تھے انہوں نے اپنی کتاب ''المراقبات'' میں تحریر کیا ہے کہ ''ترک مراسم شرعی (عبادات) جو نام نہاد صوفیاء کے یہاں عام طور پر دیکھا جاسکتا ہے، فکری انحراف اور عملی گمرہی ہے، اور ایسی گمرہی ہے جو دوسروں کو بھی گمراہ کرسکتی ہے۔''[۲]

آیت اللہ شہاب الدین مرعشی نجفی فرماتے ہیں: '' نام نہاد صوفیاء اسلام پر عظیم مصیبتوں میں

سے ایک مصیبت ہیں، انہوں نے اسلام کے فطری اور عقلی احکام پر عمل نہیں کیا۔''۳؎

آیت اللہ انصاری جو خود بھی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے، عام طور پر صوفی سمجھے جانے والے افراد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان کے طرز حیات کا تجزیہ کیا تو اسلام کے مغایر پایا''۔ آپ نے اپنے فرزند سے ان لوگوں سے دور رہنے کو کہا، جو اصلاً درویش نہیں ہیں مگر ان کا ظاہر درویشانہ ہے۔ آپ نے ایسے لوگوں کو جو تلاش معاش اور کسب حلال کی زحمتیں نہیں برداشت کرتے، سماج کے لئے بوجھ جانا اور فرمایا کہ اسی لئے احادیث میں اس قسم کے صوفیاء مورد لعن قرار دئے گئے ہیں۔ اگر آپ سے کوئی سیر وسلوک کے رمز جاننا چاہتا تھا تو آپ فرماتے تھے'' پہلے اپنے آپ کو احکام الٰہیہ کا پابند بنالو پھر تقرب الٰہی کے اس عرفانی طریقہ کو اپنانا۔''۴؎

آیت اللہ محمد تقی بہجت جو غیر معمولی عرفانی شخصیت کے حامل ہیں فرماتے ہیں: '' اہم شرعی فرائض پر عمل کرنا انسان پر عرفان واقعی کی راہیں کھول دیتا ہے اور اس منزل پر پہونچا دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے' میں نے اس رب کی عبادت نہیں کی جس کو میں نے نہیں دیکھا'' ۵؎ یعنی اصل سالک کے سلوک کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنی چشم بصیرت سے خدا کو ہر وقت اپنے ساتھ محسوس کرے۔ ''عرفان واقعیٔ کا التزام یہ ہے کہ وہ آدمی کو شرعی دستور حیات کا پابند بنادے اور وہ انسان کی مذہبی زندگی کے دونوں مرحلوں، عقیدہ اور عمل ، میں دکھائی دے، تبھی یہ ثمر بخش ہوتا ہے ۔ خانقاہوں اور صوفیاء کی مجلسوں میں شریعت کو صرف عقبٰی کی کامیابی کا ذریعہ سمجھنا صحیح نہیں ہے''۔۶؎

مذکورہ تمام علامات کے باجود اگر کوئی یہ تصور کرے کہ یہی تو صوفی کا عین شرف ہے، جو انہیں عام مسلمانوں سے ممتاز کرتا ہے کیونکہ وہ ایسی ریاضت کرتے ہیں کہ اپنے وجود سے بھی بے نیاز ہوجاتے ہیں اور ان کا فکری تعمق ہی اوران کی نماز اور فاقہ کشی ہی ان کا روزہ ہوجاتی ہے،تو اسے یہ یقین کرلینا چاہیئے کہ یہ رسولؐ وآل رسولؐ کا اتباع ہرگز نہیں ہے۔

البتہ وہ بندگان خدا جو دین کے تئیں فلسفیانہ نقطۂ نظر اور دینی پاکبازی کے ساتھ خدا جوئی کی راہ میں سلوک کرتے ہیں، وہ نہ فکری انحراف کے شکار ہوتے ہیں اور نہ عملی بدحالی کے، نہ ہی وہ عوارض پر بہت دھیان دیتے ہیں اور نہ ہی ظاہر داری پر، بلکہ وہ ہر حال میں ایک انسان کامل کی طرح، جو ہر رخ و ہر زاویے سے زندگی کو برتنا جانتا ہو اور عقیدہ واحکام شرعیہ پر حتی الامکان عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال رکھتا ہو، نہ تو وہ گوشہ نشینی کا مرتکب ہو اور نہ اہل خانہ

سے لاتعلقی کا۔ وہ پڑوس کا دھیان بھی رکھتا ہو اور بزرگوں کا لحاظ بھی ، وہ تلاش معاش بھی کرتا ہو اور کسب حلال بھی۔ مزید برآں ایک مضبوط معاشرہ کی تشکیل میں اس کا عملی حصہ ہو تو ایسے افراد واقعی صوفی یا عارف کہلانے کے مستحق ہیں۔

تصوف واقعی ، در اصل فنا فی اللہ ہونے کی اس جستجوئے پیہم کا نام ہے جو انسان میں ہر وقت قرب الٰہی کا احساس تازہ رکھے اور اس کی زندگی رضائے معبود حقیقی کے سانچے میں ڈھال دے۔ پھر وہ صرف نمازی نہیں ہوتا بلکہ اسے نمازوں سے عشق اور روزوں سے انس ہوجاتا ہے ، وہ امر بالمعروف کو اپنا شعار اور نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے دیتا ہے۔

ہوسکتا ہے کوئی یہ سوچے کہ ہر عام مسلمان سے اسلام کا یہی مطالبہ ہے تو پھر ایک صوفی و عارف باللہ ہی میں کیا خاص بات ہے، جو ایک عام مسلمان میں نہیں ہے؟ اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ یقیناً مطالبہ سب سے یہی ہے، مگر بات عمل میں سبقت گیری ، ملاحظہ کاری اور درجات ایمان ومعرفت کی ہے، جس میں بہرحال عرفان صوفیاء اور اولیاء اللہ عام مسلمانوں سے چند درجہ آگے ہے۔

تصوف واقعی اس ایمانی وجدان وعرفانی رجحان کا نام ہے، جسے پاکر انسان ترک گناہ میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ غزالی نے تصوف اسلامی کی تعریف یوں کی ہے : خود کو خدا کے لئے وقف کردینا ماسویٰ اللہ سب کو چھوٹا تصور کرنا تصوف ہے۔

بایزید بسطامی نے اپنے دوستوں میں سے ایک دوست سے کہا ''اگر تم کسی کو ایسا کرامتوں والا بھی پاؤ کہ وہ ہوا میں پرواز کرسکتا ہو، پھر بھی اس پر فریفتہ نہ ہو، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ اوامر ونواہی اور حدود شریعت کی کتنی رعایت کرتا ہے؟

ذوالنون مصری کے بقول حقیقی معنی میں مقرب بارگاہ خداوندی وہ ہے جو صحیح معنی میں افعال ، اخلاق ، اوامر ونواہی میں سنت پیغمبرؐ کا پیرو ہو۔

مذکورہ گفتگو کے پیش نظر اتنا تو طے ہوجاتا ہے کہ تصوف واقعی اسلامی اور ایمانی منزلوں اور عملی مرحلوں کو طے کرنے کے بعد میسر آتا ہے بشرطیکہ ہم اسلامی نظام حیات کے سارے شعبوں کے تقاضوں پر کھرے اتریں۔ ظاہر ہے کہ اسلام ظاہر وباطن ، تزکیۂ نفس اور واجبات ومحرمات کی رعایت کا وہ معتدل نظام ہے، جس میں محض ترک دنیا، ترک معاشرت، ترک ذات اور خرقہ پوشی کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی بلکہ قرآن وحدیث ،عمل رسول مقبولؐ ، شیوہ صالحین اور روش انبیاء وائمہ میں تقویٰ

سب سے اہم حکم ہے اورتقویٰ ترک تعلقات کا نام نہیں، بلکہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کے حسین امتزاج کوتقویٰ کہتے ہیں۔ اگر تصوف اپنے معنوی اور عملی تقاضوں کے ساتھ تقویٰ کے مترادف ہے، تو بلاشبہ ہر متقی صوفی ہے۔

تصوف ایک عمل ہے جو ریاضت اور مرشد کی ہدایتوں سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں کشف وشہود کی منزلیں بھی ہیں۔ ہاں ! اگر اسلام وشریعت کے علاوہ اس کا کوئی اپنا مستقل مکتب فکر اور طرز عمل ہے تو اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ صفائے باطن، زہداور تقویٰ کی ایک نکھری ہوئی شکل کا نام ہے، جس میں عمل، عقیدہ کا آئینہ دار ہو تو ایسا تصوف عین اسلام ہے۔

تصوف ایک عملی سیاست بھی ہے اور انداز تبلیغ بھی، جس کے ذریعے انسان مخالف ماحول میں رہ کر بھی صرف محبتیں تقسیم کرتا ہے اور اسلام کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس کا طرز حیات اتنا دلکش ہوتا ہے کہ ہر قسم کا مذہبی ومسلکی عداوت وعصبیت اس تک آتے آتے دم توڑ دیتی ہیں اور پھر خدا اس کی زبان میں وہ چاشنی بھر دیتا ہے کہ کوئی بھی اس کی گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

مرحوم شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری نے اپنی کتاب مجالس المومنین میں غالبًا اسی ہمہ گیریت، ہر دلعزیزی اور آفاقیت کی بنیاد پر بہت سے مومنین کو صوفیا اور اولیاء اللہ کی صف میں شمار کیا ہے۔

رہی اس کی افادیت کی بات، تو یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کم از کم ہمارے ملک واطراف میں صوفیاء کے ذریعے پھولا پھلا اور پروان چڑھا،جنھوں نے بغیر کسی اقتدار واسلحہ، فوج ولشکر کشی انسانی برادری کی ایک بڑی تعداد کے قلوب کو مسخر کیا اور ان میں اسلام وایمان کی داغ بیل ڈالی۔

علامہ مجلسی کے بقول سلمان ابوذر اور عمار اس راہ وروش کے صف اوّل کے مسافر ہیں اور سورۂ کہف کی ۲۸ ویں آیت کے مصداق بھی ہیں۔

خواجہ نصیر الدین طوسی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی چاہتا ہے کہ ایمان کے مقامات میں بلندی حاصل کرے تو اسے چاہئے کہ نفس امارہ پر کنٹرول اور سخت ریاضت کرے تاکہ رحمت خدا کے دروازے اس پر واہو جائیں، مگر یہ وہ قبا نہیں ہے جو ہر قد وقامت کے آدمی پر زیب دے۔

علامہ مطہری: اہل عرفان ہمیشہ عارف کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں یا صوفی کی حیثیت سے۔ عرفان واقعی کا اسلام سے تضاد کا مسئلہ وہ اٹھاتے ہیں، جو اسلام یا عرفان سے کچھ دوسرے معنیٰ نکالتے ہیں۔ ۷

اسی طرح علامہ مطہری نے یہ بھی فرمایا ہے: ''روح وفکر کے امراض اور پریشانیوں کے لئے مرشد ومربی کی ضرورت صوفیہ کا شیوہ رہا ہے اس سلسلے میں ملا سلطان علی کا رسالہ ''ولایت نامہ'' اور ''بستان السیاحہ'' ملا زین العابدین شیرازی کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔''۸

علاوہ ازیں، اس سلسلے میں امام خمینی کے درج ذیل اشعار سے ان کے نقطہ نظر کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

دست آن شیخ ببوسید کہ تکفیرم کرد
محتسب را بنوازید کہ زنجیرم کرد
دل درویش بہ دست آر کہ از سرالست
پردہ برداشتہ آگاہ زتقدیرم کرد؟

مزید برآں امام خمینی نے دادگاہ انقلاب کے امان نامہ میں حضرت علی رضا کو سلطان الفقرا کے لقب سے خطاب کیا ہے، جوخود آپ کی عارفانہ اورمتصوفانہ شخصیت کی عکاسی وغمازی کرتا ہے۔۹

مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عرفان وتصوف کا راستہ بہت پر پیچ و دشوار گزر تو ہے لیکن اس میں موجود جاذبیت ودلکشی سے انکار ناگزیر ہے یہ ایسے باریک راستے کی طرح ہے جس کے ایک طرف شکوک وشبہات ، تذبذب، گمرہی ہے، مگر دوسری طرف ایمان ومعرفت اورتقرب وتقدس ہے اور وہ بھی ایسا تقدس جو اپنے آس پاس اثرات مرتب کرے اور تشنگان ہدایت کو اپنی رہنمائی سے سیراب کرے۔یہی مقصد بعثت پیغمبرؐ بھی تھا۔

حوالہ جات:

۱۔سفینۃ البحار، ج ۲، باب صوف
۲۔المراقبات ، جواد بن شفیع ملکی تبریزی ،ص ۵۳۲-۵۳۱
۳۔مرعشی نجفی تعلیق برکتاب احقاق الحق وازھاق الباطل۔
۴۔درکوی بے نشان ہا،ص ۵۷، ۶۳-۶۰ (مصطفی کرمی نثراد) وموسسہ شمس الشموس،ص ۳۰۲، ۳۰۴،۳۱۱، ۳۱۳،۳۲۹۔
۵۔ارشاد حضرت امیر المومنین کی طرف اشارہ ،جس میں آپ نے فرمایا،''میں نے اس خدا کی عبادت نہیں کی جسے میں نے نہیں دیکھا'' یعنی عقل کی آنکھوں سے دیکھا۔

۶۔ سید محسن محمودی، مسائل جدید، ج ۳،ص، ۱۰۱و ۱۹۳
۷۔آشنائی با علوم انسانی ،ص ۳ و ۱۸۶
۸۔جلوہ ہای معلّمی استاد،ص ۲۴
۹۔ دکتر ج۔ا۔تنہائی، جامعہ شناسی نظری اسلام ،

امت اسلامیہ کے نام آیت اللہ خامنہ ای کا پیغام

حج بیت اللہ الحرام درحقیقت وہ عظیم فریضۂ الٰہی ہے جس کو جملہ اسلامی عبادتوں کا مجموعہ کہا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ہر سال ندای ربانی کے جواب میں ''اللھم لبیک'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے عالمی مسلمانوں کی بڑی تعداد خانۂ امن الٰہی کے ارد گرد جمع ہوجاتی ہے اور طواف ونماز میں مشغول ہر حاجی کی ایک ہی تمنا ہوتی ہے کہ خدای وحدہٗ لاشریک اس کے اعمال واقوال سے راضی ہوجائے۔ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد ایرانی حجاج کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا ہے اور ہر سال پہلے امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد آیت اللہ خامنہ ای کی طرف سے اس عالمی اسلامی کانگریس میں شریک تمام حجاج کے نام تاریخ ساز پیغامات جاری کئے گئے ہیں جن کی افادیت سے انکار ناگزیر ہے۔ پیغام میں موجود وعرفانی نکات اور اس کی عظمت وافادیت کے پیش نظر آیت اللہ خامنہ ای کے تازہ ترین پیغام کا اردو ترجمہ حاضر خدمت ہے۔ ادارہ

بسم الله الرحمن الرحيم

سب سے پہلے میں بارگاہ عالیہ خداوندی میں مخلصانہ استدعا کرتا ہوں کہ وہ آپ لوگوں کی ہمت وجستجو کو اپنی برکتوں سے مالا مال کردے اور انشاء اللہ قربۃ الی اللہ وخلوص نیتی کے ساتھ انجام دی جانے والی اس کوشش کے وہی نتائج برآمد ہوں جو آپ کے دل میں ایک قیمتی خواہش کی طرح موجود ہیں اور وہ خواہش ایک ایسے حقیقی واسلامی حج کی تکمیل کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو حضرت خاتم الانبیاؐ کی روح مطہر کی خوشنودی کا باعث ہو۔

فریضہ حج درحقیقت ایک اہم موقع ہے جو خداوند عالم نے ہم لوگوں کو عطا کیا ہے۔ یہ عام مسلمان کے لئے بھی ایک اہم موقع ہے اور عظیم امت اسلامیہ کے لئے بھی ایک اہم اور یادگاری موقع ہے۔ فقط یہی نہیں بلکہ یہ اسلامی جمہوری نظام کے لئے بھی اہم موقع جس نے عالمی فضا میں اسلام اور شریعت اسلامی کی حاکمیت کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ ہم لوگوں کو اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے۔

حج ہر انسان کے لئے معنویت کی لامحدود فضا میں داخل ہونے کا بہترین موقع ہے یعنی ہم اپنی روز مرہ کی زندگی کے جھمیلوں اور اس سے وابستہ مسائل اور آلودگیوں سے خود کو باہر نکالتے ہیں اور اختیاری ریاضت، تقرب خداوندی اور معنویت وپاکیزگی کی فضا میں گامزن ہوجاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ اس روحانی فضا میں قدم رکھتے ہی آپ زندگی کے معمول میں آنے والی جائز ومباح اور حلال چیزوں کو اپنے لئے حرام مان لیتے ہیں۔

جی ہاں ! احرام کا مطلب ہی اپنے لئے ان چیزوں کوحرام کرلینا ہے جو عام حالات اور معمول حیات میں رائج اور جائز ہواکرتی ہیں جبکہ ان میں سے بعض زیادہ تر ہماری غفلت کا باعث ہیں اور ان میں سے بعض ہمارے زوال کا سرمایہ بھی ہیں۔

احرام کی حالت میں ظاہری و مادی فخر ومباہات کے تمام وسائل ہم سے چھین لئے جاتے ہیں ۔سب سے پہلے فاخرہ لباس ، مقام ومرتبہ اور ظاہری شان وشوکت سے جڑی ہوئی چیزوں سے علیحدگی اختیار کرنی پڑتی ہے اور تمام حجاج کرام ایک جیسا لباس پہن کر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوتے ہیں اس کے بعد حکم ہوتا ہے کہ آئینہ کی طرف نہ دیکھئے ! کیونکہ آئینہ خود خواہی اور خود فریبی کا مظہر ہے ۔ دیکھئے حالت احرام میں خوشبو استعمال نہ کیجئے کیونکہ یہ ذاتی جلوہ نمائی کا وسیلہ ہے۔ بارش اور تیز دھوپ سے بچنے کے لئے چھت کے سایہ میں نہ جائیے پیادہ روی کے دوران، جو آرام طلبی اور عیش پسندی کا مظہر ہے، اگر کسی جگہ بدبو کا احساس ہوتو اپنی ناک ہرگز بند نہ کیجئے اور اسی طرح حالت احرام میں دوسری ایسی تمام چیزوں کو حرام جانیے جو آرام وآسائش اور شہوت نفس کا سرمایہ ہیں۔ اس مدت کے دوران جنسی شہوات کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے ۔ حالت احرام میں ان سبھی چیزوں سے کناہ رکشی اور دوری اختیار کرنی ہے جوفخر ومباہات اور امتیاز وفضیلت پسندی کا باعث ہیں۔

اس کے بعد بیت اللہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونا اور اس عظمت وشکوہ کا ، جس میں سادگی کے علاوہ کسی قسم کی سجاوٹ کا گزر نہیں ہے، صرف آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کرنا بلکہ اس کو اپنے ہاتھوں سے لمس بھی کرنا ہے۔ اس عظمت اور شان وشوکت میں زرو جواہر اور مادی وسائل وامکانات کا گزر نہیں ہے اور عام آدمیوں کے سامنے اس کی مکمل وضاحت بھی مقدور نہیں ہے ۔ اب اس حرم امن الٰہی کے ارد گرد طواف کرنے والوں کے عظیم سیلاب میں شامل ہونا ہے اور ایک مرکز کے چاروں طرف چکر لگانا ہے اور اپنی زبان کو کلمات ذکر و دعا میں مشغول رکھنا ہے ۔ گریہ وزاری اور خضوع وخشوع کے عالم میں اپنے خالق و مالک سے ہمکلام ہونا ہے ۔ اس کے فوراً بعد صفاومروہ کے درمیان سعی کرنا ہے۔ پھر میدان عرفات اور مشعر میں قیام کرنا ہے اور اس کے بعد منا کے فرائض انجام دینے ہیں۔ یہی حج ہے ۔

بعض عہدیداروں اور میرے دوستوں نے اپنی گفتگو کے دوران اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ میں نے حاجیوں کو ہرممکن آرام وآسائش اور سہولت فراہم کرنے کی سفارش کی ہے۔ جی ہاں ! میں نے کہا ہے لیکن اس آرام وآسائش سے تن پروری مقصود نہیں ہے۔ میں گذشتہ چند برسوں کے

دوران سفر حج کا اہتمام کرنے والے تمام دوستوں سے بھی اس بات کی تاکید کرتاہوں کہ اس آرام وآسائش سے مراد اس فراغت کا حصول ہے جس کے سایہ میں انسان مکمل اطمینا ن کے ساتھ تقرب الٰہی کی خاطر خود کو تمام دلچسپیوں سے منقطع اور علیحدہ کرلے۔ آپ لوگ ایسا کام کیجئے کہ لوگوں کو اطمینان حاصل ہوجائے۔ ان کے دل میں کسی طرح کا کوئی وسوسہ نہ پیداہونے پائے اور نہایت پر امن ماحول میں یہ لوگ اس فریضۂ حج کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دےسکیں۔ واضح رہے کہ سہولت و آرام کی فراہمی وآسائش سے میری مراد یہ ہے ۔ میں نے حیوانی آرام وآسائش یعنی عمدہ غذا، رہائشی ٹھاٹ باٹ اور بہتر وبیشتر کھانے کی بات کبھی نہیں کہی ہے ۔ یہ میرے سلیقہ سے بعید ہے کہ میں حج بیت اللہ کے دوران ان چیزوں کی طرف دھیان دوں۔

واضح رہے کہ حج ایک تفریحی سفرنہیں ہے بلکہ یہ ایک معنوی اور روحانی سفر ہے ۔اپنے جسم و اپنی جان دونوں کے ہمراہ اللہ کی طرف سفر کرنا ہے۔ اہل سلوک کی نظر میں سفرالی اللہ جسمانی سفرنہیں ہے بلکہ فقط قلبی اور روحانی سفر ہےلیکن یہاں ہم سبھی حاجیوں کے لئے سفرالی اللہ کا مطلب ہےجسم اور روح دونوں ساتھ رہیں۔ اب اگرہم اپنے جسم کو اس جگہ تک لے جائیں اور اپنے دل کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں تو یہ سفرمکمل نہیں ہوتا۔ یا خدانخواستہ بعض لوگ اس نعمت کی تکرار کی وجہ سے باربارسفر حج کی توفیق حاصل کرلیتے ہیں اور باربار خانۂ خدا کی زیارت کے سفر سے مشرف ہونے لگتے ہیں ۔ممکن ہے کہ باربارسفر حج ان لوگوں کی بے توجہی کا سبب بن جائے اور ان لوگوں کی نظر میں حج کی اہمیت گھٹ جائے اور یہ لوگ اپنی ذات کو اس اندرونی انقلاب سے ہم آہنگ نہ کرسکیں اور حج کے سایہ میں اپنی ذات میں پیداہونے والے انقلاب کومحسوس نہ کرسکیں ۔ یہ بات ہرگز مناسب نہیں ہے۔

شیخ محمد بہاری نے جن پر خداوند عالم کی رحمت نازل ہواور جن کی فضیلت کے اعتراف میں اسی زمانہ میں ایک عظیم اجتماع منعقد ہونے والا ہے، اپنی ایک کتاب میں تحریرفرمایا ہے کہ دعا وذکر اور شاید نماز جب بے توجہی کے ساتھ دہرائی جاتی ہےتو وہ قساوت کوجنم دیتی ہے ! ہم نماز پڑھ رہے ہیں اور وہ قساوت وبیرحمی پیداکررہی ہے۔آخر ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ حالت نماز میں ہمارا قلب ہمارے ساتھ موجودنہیں ہے اور ہم بارگاہ خداوندی کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ پس یہ نماز یا توجہ کے ساتھ ہے او رجو رقت ،قربت ، لطافت اور صفاوپاکیزگی کا سرمایہ ہے یا نماز بے توجہ ہے جو بقول شیخ محمد قساوت قلب اور بے رحمی پیداکرتی ہے۔

حج کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ ان اعمال کو بھرپور توجہ اور حضور قلب کے ساتھ انجام دینا چاہئے'' ایاماً معدودات''[۱] ''معلومات''[۲] مجموعی اعتبار سے حج اور عمرہ کے ایام چند دنوں سے زیادہ تو نہیں ہیں۔ حج کی یہ چند روزہ مہلت ایک مشق اور ایک تجرباتی تعلیم ہے یعنی انسان اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اس طرح بھی زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی اس طرح بسر کریں جیسے حالت احرام میں بسر کی جاتی ہے بلکہ خداوند عالم نے آپ کے لئے جس رزق کو جائز وحلال قرار دیا ہے اس سے آپ کو فائدہ اٹھانا چاہئے لیکن اس کے ساتھ دل بستگی اور اس کے لئے بے تابی اختیار کرنا اور اسے زندگی کا مقصد بنالینا قطعی مناسب نہیں جیسا کہ آج ہم دیکھ رہیں اور ہم لوگوں نے مادی شہوتوں اور لذتوں کو اور موجودہ نامناسب خواہشات کو ہی زندگی سمجھ رکھا ہے۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے ہم لوگوں کو حقیقت کا علم ہونا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ زندگی کے ایک حصہ کو اور دن ورات میں سے چند گھنٹوں کو اور نصف شب کے کچھ حصے کو اس کام کے لئے وقف کردینا ہے تاکہ ان اوقات میں ہر چیز سے علیحدگی کے ساتھ تقرب خداوندی اور صفاو پاکیزگی کی حالت میں زندگی بسر کی جاسکے۔ آپ لوگ اس مقدس جگہ پر اس عمل کی مشق کرتے ہیں اور اس کام کو اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں۔ حاجی یہ سیکھ لیتا ہے کہ یہ عمل انجام دیا جاسکتا ہے دیکھئے یہ کیسی عظیم مہلت اور کتنا اہم موقع ہے۔

تنظیم حج کے آپ سبھی ذمہ دار لوگوں کو ایسا اہتمام کرنا چاہئے کہ آپ کے ساتھ مراسم حج میں شریک لوگوں کا یہ انبوہِ عظیم، جس میں آپ کے ساتھ آنے والے حجاج، مقامی حجاج اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے زائرین خانۂ خدا آگاہ ہوجائیں اور ان میں ایسا حوصلہ پیدا ہوجائے کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تنظیم حج سے وابستہ افراد چاہے وہ کارواں سالار حضرات ہوں یا مختلف قافلوں سے جڑے ہوئے علماء اور ثقافتی وغیر ثقافتی امور کے سربراہ اور ڈائرکٹر حضرات، سبھی لوگوں کو یہ یہ دھیان رکھنا ہے کہ خداوند عالم نے ہم لوگوں کو یہ عظیم موقع فراہم کیا ہے۔ اس احساس کو پوری طرح ابھارنا اور باقی رکھنا ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے ہم لوگوں کو یہ موقع عطا کیا گیا ہے۔ یہ موقع ہمیشہ اور سب لوگوں کو حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ ایسے بیشمار افراد موجود ہیں جو ایک دن کے لئے اس جگہ آنے کی آرزو رکھتے ہیں جہاں آپ لوگ ایک طویل مدت بسر کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کی یہ آرزو پوری نہیں ہو پاتی۔ دنیا میں حج کے مشتاق اور متمنی لوگوں کی بہت بڑی تعداد

موجود ہے لیکن آپ لوگوں کو یہ موقع حاصل ہوگیا ہے لہٰذا آپ اس موقع کو غنیمت جانیے ۔ یہ موقع نہایت اہم اور انفرادی حیثیت کا حامل ہے اور اسی کی بنیاد پر کارواں سالار اور دیگر ذمہ دار لوگوں کے فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ یہ پہلا موقع ومرحلہ ہے۔

دوسرا مرحلہ امت اسلامیہ سے وابستہ ہے۔ واضح رہے کہ امت اسلامیہ میں قومیت ،نسلی جماعت، جغرافیائی مناطق،تہذیب وتمدن ، فرہنگ وثقافت اور سلیقہ وعادت کے اعتبار سے غیر معمولی کثرت پائی جاتی ہے لہٰذا اس امت کے درمیان شگاف اور جدائی وعلیحدگی کا وجود فطری ہے۔ کیونکہ خداوند عالم نے اسلام کو کسی خاص نسل، ایک مخصوص تہذیب وتمدن اور دنیا کے کسی مخصوص ملک کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیائے بشریت کے لئے خلق کیا ہے ۔ دنیا کے تمام لوگ اگر چہ رنگ وزبان ، عادت وسلیقہ اور تاریخی وجغرافیائی ماحول کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعی مختلف ومتفاوت ہیں جس کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ امت اسلامیہ میں اختلاف کی بنیاد موجود ہے لیکن یہ اختلاف ظاہر نہ ہونا چاہیے اور اسے عملی شکل قطعی اختیار نہ کرنا چاہئے ۔ حج امت اسلامیہ کے لئے وہ عظیم موقع ہے کہ فطری ، بناوٹی اور مسلط کردہ جدائیوں کے بعد بھی وہ اپنی ترمیم کی راہ ہموار کرلے۔

امت اسلامیہ کیلئے حج ایک اہم اور عظیم موقع ہے ۔لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہر سال مراسم حج میں شرکت کا شرف حاصل کرتی ہے ۔آپ ان میں سے کوئی بھی دس برس منتخب کرلیجئے اور یہ دیکھئے کہ ان دس برسوں کے دوران افریقہ، ایشیاء، یوروپ ودنیا کے دیگر علاقوں سے کتنے لاکھ مردوعورت ، جاہل و عالم اور مختلف استعداد وسلیقہ رکھنے والے لوگ مراسم حج میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر اسلامی اتحاد پر مشتمل'' ولاتفرقوا'' کی آواز حاجیوں کی اس بڑی جماعت کے ذہن میں اپنی جگہ بنالے تو آپ دیکھئے کہ کتنا عظیم واقعہ رونما ہوتا ہے ۔ اس ایک آواز کے نتیجے میں تفرقہ واختلاف کے جملہ اسباب وعوامل کا رنگ خود بخود پھیکا اور کمرنگ ہوجائے گا حج کے اس عظیم عالمی اجتماع میں شریک مسلمانوں میں سے ایک شیعہ ہے، ایک سنی ہے ۔ پھر شیعوں اور سنیوں کے درمیان بھی مختلف فرقہ،مختلف فقہ کی پیروی،مختلف مذاہب اور مختلف عادتوں کے لوگ موجود ہیں جس کا فطری انجام اختلاف وجدائی کی شکل میں رونما ہوتا ہے لیکن حج کا یہ مقدس الٰہی فریضہ ان تمام لوگوں کو ایک مرکزِ اتحاد پر جمع کردیتا ہے اور ان لوگوں کو باہمی قربت اور آپسی میل جول کی دولت سے مالامال کردیتا ہے۔

اس موقع پر ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتاہوں ۔ اگرکوئی شخص حج جیسے وسیلہ

وحدت و اتحاد کے ذریعہ امت اسلامیہ کے درمیان اختلاف اور تفرقہ کا ذریعہ تلاش کرے تو اس سے زیادہ بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے ۔ میرا یہ خطاب تمام لوگوں سے ہے۔ میں فقط اس تکفیری سلفی شخص سے مخاطب نہیں ہوں جو مدینہ میں کھڑے ہوکر آپ لوگوں کے مقدسات کی شان میں گستاخانہ کلمات ادا کرتا ہے اور طرح طرح کی گالیاں دیتا ہے بلکہ میں سردست آپ سبھی لوگوں سے مخاطب ہوں ۔ کاروان حج کے امیروں اور عالموں سے میرا مطالبہ ہے کہ وہ ان حالات پر کڑی نظر رکھیں اور حج جیسے عظیم وسیلۂ وحدت واتحاد سے تفرقہ واختلاف کا وسیلہ تیار نہ ہونے دیں اور دلوں میں ایک دوسرے کے سلسلے میں بغض وکینہ نہ رکھیں میں ان چیزوں کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتا جو مسلمانوں کے درمیان تفرقہ واختلاف اور جدائی وعلیحدگی کا باعث ہیں آپ لوگ خود ہی غوروفکر کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کونسی چیز ہے جو ایک شیعہ مسلمان کے دل میں غیر شیعہ مسلمانوں کے لئے کینہ پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف وہ کونسی چیز ہے جو ایک سنی مسلمان کو شیعہ مسلمانوں کے سلسلے میں بغض رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان اسباب وعوامل کی نشاندہی کے بعد انہیں نکال باہر کرنا چاہئے۔ حج جیسے وسیلۂ ترمیم ، وسیلۂ اتحاد اور دلوں کے درمیان یکسانیت ویگانگت کے وسیلے کو بغض وعناد پیدا کرنے کا ذریعہ ہرگز قرار نہ دینا چاہئے۔ تنہا اس مسئلہ کی بات نہیں ہے بلکہ اس طرح تمام مسائل کی شناخت کے لئے غیر معمولی ذہانت وہوشیاری سے کام لینے کی ضرورت ہے یہ کوئی معمولی اور مزاق کی بات نہیں ہے۔

تیسرا مرحلہ درحقیقت جمہوری اسلامی کے لئے ایک عظیم موقع ہے۔ جمہوری اسلامی مظلوم ہے اور میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ گذشتہ کئی برسوں سے میں کہتا چلا آرہا ہوں ۔جمہوری اسلامی ایک ایسا نظام ہے جس میں تمام معنوی ارکان اقتدار موجود ہیں لیکن یہ مظلوم مقتدر ہے ۔ ان میں باہم کوئی اختلافات نہیں پائے جاتے۔ آخر یہ کس وجہ سے مظلوم ہے؟ درحقیقت اس کے مظلوم ہونے کی مختلف دلیلیں ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ جمہوری اسلامی کے دشمنوں نے طرح طرح کی جھوٹی اور بے بنیاد باتوں کو اسلامی جمہوریہ سے وابستہ کررکھا ہے تاکہ عظیم عالمی اسلامی معاشرہ میں اسلامی جمہوری افکار وعقائد کو فروغ ومقبولیت حاصل نہ ہوسکے۔ ان میں فکری اور اعتقادی جھوٹ کے ساتھ ہی ساتھ جماعتی ، سیاسی اور عملی جھوٹ بھی شامل ہیں۔ مثلاً اسلامی جمہوری نظام والے یہ کرتے ہیں ، وہ کرتے ہیں۔ ایسا کہتے ہیں ویسا کہتے ہیں ۔گذشتہ تیس برسوں سے اسلام دشمن عناصر ہمارے خلاف مختلف قسم کے جھوٹے اور بے بنیاد پروپگنڈوں کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ آپ لوگ خادم حجاج کرام

ہیں اور آپ لوگوں کے قلوب اسلامی جمہوری نظام سے پوری طرح مالامال ہیں اور اسلامی جمہوری نظام پر آپ اٹوٹ ایمان واعتقاد رکھتے ہیں۔ مراسم حج کے دوران ایسے مسلمان بھائیوں کے سلسلے میں آپ کا بنیادی فریضہ کیا ہے جو اس جھوٹے پروپگنڈوں کے بھنور میں گرفتار ہیں؟۔ اس سلسلے میں آپ کا فریضہ یہ ہے کہ آپ معارف اسلامی اور اسلامی جمہوری نظام کے معارف کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی اکثریت ضرور ہے لیکن ہمارا اسلامی جمہوری نظام سنی اور شیعہ دونوں کے لئے یکساں حیثیت رکھتا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انقلاب کے دوران اور انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد اور جنگ تحمیلی کے دوران فقط ایرانی سنی مسلمان بھائیوں نے ہی نہیں بلکہ عالمی اسلامی برادری نے بھی، جس میں سنی بھائیوں کی اکثریت ہے، ہماری بھر پور حمایت کی ہے اور ہمارا دفاع کیا ہے۔ اسلامی جمہوری حکومت کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف نبردآزمائی کے دوران ان میں سے بعض لوگوں کو قتل بھی کردیا گیا۔ پس یہ ہے اسلامی جمہوری نظام اور اس کا حقیقی تعارف۔

اسلامی ممالک میں، چاہے وہ افریقہ میں واقع ہوں، چاہے ایشیاء میں ہوں، چاہے دنیا کے کسی بھی علاقے میں یہاں تک کہ ہم سے سب سے زیادہ عداوت رکھنے والے ملک امریکہ کے قلب میں جو مسلمان آباد ہیں وہ شیعہ تو نہیں ہیں لیکن ان لوگوں کا دل اسلامی جمہوریہ ایران کی محبت، امام خمینی کی محبت اور اس ٹھوس عزم وارادہ والی عظیم ملت اسلامیہ ایران کی محبت سے لبریز ہے۔ چونکہ یہ جمہوریت حقیقی اسلامی جمہوریت ہے اسی وجہ سے یہ لوگ اس کی تحریف میں سرگرم ہیں، اس کو تبدیل کررہے ہیں اور اسلامی فرقوں کے ساتھ عداوت ودشمنی کی مہر اسلامی جمہوریہ ٔایران کے سینے پر لگارہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمان سراسر جھوٹ پر مبنی ان کی اس بات کی پیروی کریں۔ دنیا کے ہر گوشے میں زندگی بسر کرنے والے ہمارے مسلمان بھائیواور ہماری مسلمان بہنو! اچھی طرح جان لیجئے کہ یہ ملک آپ لوگوں کا ہے اور یہ بھی باور کرلیجئے کہ یہاں وہی کام انجام پایا ہے جس کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں ہے۔ دنیا میں کون ایسا مسلمان ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ قرآن کی حاکمیت قائم ہو۔ یہاں قرآن کی حاکمیت وبالادستی قائم ہے اور یہاں شریعت محمدی کی حکمرانی ہے۔ آج اسلامی دنیا میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں میں کون ہے جس کا دل اسلامی ملکوں پر کفار کے اثر ورسوخ وتسلط کی وجہ سے خون خون نہ ہو؟۔ ان لوگوں کا دل خون ہے اور غیر معمولی رنج وغم کی

حالت میں زندگی بسرکررہے ہیں لیکن اپنے منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلامی جمہوریہ عالمی آزادی کا وہ عظیم منبر ہے جہاں سے ان شکستہ قلب لوگوں کے گلے میں پھنسی ہوئی دردانگیز باتوں کا ببانگ دہل اعلان کیا جارہا ہے۔

مستکبرین یعنی استکباری واستعماری عناصر اسی وجہ سے اسلامی جمہوریہ ایران کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔ ہمارے خلاف امریکہ کی دشمنی کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم ملت اسلامیہ عالم کے دل کی بات کہتے ہیں ۔ دنیا کی مسلمان قومیں انہی چند فاسد حکومتوں تک محدود نہیں ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان امریکی دباؤ، امریکی مداخلت، امریکی تکبر اور امریکی وغیر امریکی سامراجی استکبار سے پوری طرح اوب چکی ہیں ۔ ان کا دل رنج ومصائب سے بھرا ہوا ہے لیکن کچھ کہہ نہیں پاتی ہیں ۔ یہ باتیں سرزمین ایران میں حکومت سے لے کرعوام الناس تک ہرسطح پر مکمل وضاحت کے ساتھ اعلانیہ بیان کی جارہی ہیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے سلسلے میں یہ وہ حقائق ہیں جن کو واضح لفظوں میں پیش کیا جانا چاہئے۔ ان باتوں کو بیان کیجئے تاکہ ملت اسلامیہ عالم اور عالمی مسلمان ان حقائق سے آگاہ ہوں اور تمام حقائق سے باخبر رہیں البتہ یہ بات صرف ایک مخصوص طبقہ یعنی اسلامی ممالک کی یونیورسٹی کے طالب علموں تک ہی محدود نہ رہنی چاہیے بلکہ ان حقائق کو عام مسلمانوں تک پہنچایا جانا چاہیے۔ یہ اسلامی جمہوری نظام کے لئے بہترین مواقع ہیں۔

البتہ میں اس عقیدہ کا حامل نہیں ہوں کہ ہم باہری اعتبار سے ٹھیک رہیں اور اندر اندر کچھ بھی ہوتا رہے۔نہیں بلکہ میرا اعتقاد وایمان یہ ہے کہ پہلے ہم لوگ اپنی داخلی اصلاح کریں چاہے، وہ ہمارے قلب کی اصلاح ہو یا ہمارے ملک کے اندرونی امور کی اصلاح ۔

ہم لوگوں کو اپنے ملک کے داخلی امور کی اصلاح خود ہی کرنی چاہئے ۔ ہماری قوم مومن اور حوصلہ منداورعزم وادارہ والی قوم ہے ۔ یہ ایک ہمہ تن آمادہ قوم اور ملت صادق ہے لیکن بعض جگہوں پر مختلف بڑے سیاسی وغیرسیاسی رہنماؤں کے نام سے بعض افراد اپنی نامناسب حرکتوں کے ذریعہ معاشرہ کے ماحول میں گڑبڑی پیداکررہے ہیں معاشرہ کے ماحول کو خلوص وصداقت سے دور کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور لوگوں کو ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کررہے ہیں۔

یہ وہی ملت اسلامیہ ایران ہے جس نے اس عظیم انقلاب کو کامیابی عطا کی ہے اور اس مستحکم وباعظمت نظام کا ڈھانچہ تیار کیا ہے اورتیس سال سے اس کی حفاظت میں ہمہ تن سرگرم ہے یہ وہی ملت

ہے، اس کا ایمان بھی پہلے ہی جیسا ہے اور اس کے عزم وحوصلہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

حج درحقیقت ہم لوگوں کے لئے ایک درس ہونا چاہئے یہ الٰہی فریضہ فقط ان لوگوں کے لئے ہی درس کی حیثیت نہیں رکھتا جو سفر حج اختیار کرتے ہیں بلکہ یہ ہم لوگوں کے لئے بھی ایک درس کی حیثیت رکھتا ہے کہ ہم لوگ اس روحانی منظر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور تمام حجاج کرام کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ خداوند عالم ان لوگوں کے حج کو قبول فرمائے انشاء اللہ۔ آخر کلام میں بارگاہ عالیہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ ہم لوگوں کو حج بیت اللہ الحرام سے حاصل ہونے والے درس سے بھرپور استفادہ کی توفیق عنایت فرمائے۔

والسّلام

علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته

حوالے:

۱۔سورۂ بقرہ۔ ۱۸۴،۴

۲۔سورۂ حج ۔۲۸،

۳۔سورۂ آل عمران ۔ ۱۰۳

دنیا اسلام محمدیؐ کی پیاسی ہے

پروفیسر سید اختر مہدی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

عصر حاضر میں ہی نہیں بلکہ عرصۂ دراز سے اس موضوع پر بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری ہے کہ آیا تصوف مذہب اسلام سے الگ ہٹ کر کسی مخصوص مکتب فکر کی دین ہے یا اسلامی شریعت سے اس مکتب کا ایسا اٹوٹ رشتہ ہے کہ اسلام سے الگ ہو کر اس کی کوئی مخصوص اور انفرادی شکل وصورت باقی نہیں رہ جاتی۔ درحقیقت اسلام اور انسان دشمن طاغوتی طاقتوں نے پیغمبر اکرم کی وفات کے بعد آنے والی صدیوں کے دوران اسلام کو اتنے ٹکڑوں اور فرقوں میں تقسیم کردیا کہ اصل اسلام کی شناخت باقی نہ رہ جائے اور دنیائے بشریت حقیقی اسلام محمدی کی مکمل شناخت ومعرفت حاصل کرنے کے بجائے نام نہاد مسلمان حکمرانوں کے اعمال وافعال بلکہ یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ اسلامی نام کے حامل حکمرانوں کی کالی کرتوتوں کو اسلام سے وابستہ کرنے لگے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اسلام نے بشر دوستی انسانی اخوت وبرادری اور یکتا پرستی کا جو درس دیا تھا وہ پہلے برطانوی پھر امریکی سامراجی پروپگنڈوں کی نذر ہوگیا اور جب عرفاء وصوفیاء کرام نے اپنے مخصوص انداز میں اسلام محمدی کے دفاع کی کوشش شروع کی تو امریکی اسلام کے مبلغین نے شریعت وطریقت کی بحث چھیڑ کر اس مشن کی ناکامی کی زمین ہموار کرنا شروع کردیا لیکن بیسویں صدی کے نامور عارف امام خمینی نے اپنے اسلامی انقلاب کے ذریعہ حقیقی اسلام کی ایسی تبلیغ کی کہ آج دنیا اسلام اور اس کی بشر دوست وانسان نواز پیغام کی پیاسی دکھائی دیتی ہے درج ذیل مقالے میں اس کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے۔ ادارہ

موجود عالمی انسانی سماج کا سرسری جائزہ اورمختصر مطالعہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسانی برادری انتہائی مہلک اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کررہی ہے ۔ جگہ جگہ لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارتگری کا بازار گرم دکھائی دیتا ہے۔ مختلف بے بنیاد اور خود ساختہ اسباب وعوامل کے بہانے بیگناہوں کا قتل عام جاری ہے ۔ اقتصادیات ومعاشیات جس کو وسیلۂ زندگی قرار دیا گیا تھا وہ اس ترقی وروشن فکری کے دور میں اسے مقصدحیات کا درجہ حاصل ہوگیا ہے اور حیرت انگیز بات تو ہے کہ یہ تمام غیر انسانی اور ظالمانہ امور ترقی ، آزادی ، جمہوریت پسندی اور انسانی حقوق کی حفاظت وبحالی کے نام پر انجام پارہے ہیں اور قومی وعالمی سطح پر موجود قوانین کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی چلی جارہی ہے ۔

ہر طرف موت جیسی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ظلم اور ظالموں کا بول بالا ہے اور کمزور وپسماندہ انسانوں کی کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آتی البتہ اکثر یہ آواز ضرور سنائی دیتی ہے کہ نادارلوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی کو ترقی کا معیارقرار دیا گیا ہے اور آگہی وبیداری کی علمبردار موجودہ صدی میں شکم مادر میں لڑکیوں کی نابودی کا منظر دیکھنے کے بعد یہ کہنا مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ دور جاہلیت کے عرب موجود تعلیم یافتہ روشن فکر اور ترقی کی بلند ترین چوٹی پرجلوہ افروز انسانوں سے بہتر تھے کیونکہ وہ ایک مدت تک لڑکیوں کو اپنی آغوش میں پالنے کے بعد انہیں زندہ درگور کیا کرتے تھے۔ اس بیان کے ذریعہ میرا مقصد ظالم اور بدوی عربوں کا دفاع ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم لوگوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہے کہ پیغمبر عظیم الشان حضرت محمد مصطفیؐ نے پرچم توحید کے سایہ میں ان انسانیت سوز مفاسد اور بدعنوانیوں کے خلاف مثالی جدوجہد کی، سرزمین مکہ کو خیر باد کہا اور شہر مدینہ میں اپنے قیام کے دوران متعدد دفاعی جنگوں کے دوران صبر آزما اور طاقت فرسا مصائب جھیلے لیکن اپنے توحیدی اور الٰہی موقف پر اٹل اور ثابت قدم رہے۔اور آخر کار صلح حدیبیہ کے سایہ میں پُر امن ماحول میں انہیں خداند عالم کے پسندیدہ دین مبین اسلام کی تبلیغ کا موقع ہاتھ آ گیا اور مختصر سی مدت میں فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد دس ہزار افراد سے زیادہ ہوگئی جن کو دیکھنے کے بعد اسلام دشمن طاقتوں پر غیر معمولی خوف طاری ہوگیا جس کی وجہ سے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اسلام کے خلاف جنگ کا اعلان نہ کرسکی اور منافقانہ ہتھکنڈوں کے ذریعہ ہی اسلام اور مسلمانوں کو وحشیانہ مظالم کا شکار بنایا گیا۔ امت اسلامیہ کو ابوبکر وعلی کے نام پر اختلاف وتفرقہ کا شکار بنایا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ۶۰ھ میں نواسۂ رسولؐ حضرت حسین مظلومؑ کو کربلا کے ریگستان میں نہایت بیرحمی کے ساتھ شہید کردیا گیا اور اسلامی خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور اگر حضرت زینبؑ نہ ہوتیں تو لوگوں کو اس حقیقت کا علم بھی نہ ہو پاتا کہ کربلا کی گرم ریتی پر شہید ہونے والا کوئی باغی اور خارجی نہیں بلکہ دوش نبوت کا سوار وجوانان جنت کا سرور وسردار حسین مظلوم ہے جس کا صحیح تعارف اس دور کی اسلام دشمن تبلیغی جماعتوں اور پروپگنڈہ اداروں نے نہیں ہونے دیا۔ بات حسینؑ مظلوم کے صحیح تعارف تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اسلام دشمن طاقتوں کے درمیان یہ معاہدہ ہوگیا کہ منافقانہ ہتھکنڈوں اور تفرقہ انگیز منصوبوں کے ذریعہ اصل اور حقیقی اسلام کی شناخت کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کردی جائیں تاکہ عوام الناس حقیقی اسلام کی نعمتوں اور برکتوں سے ناواقف رہ جائیں اور پیغمبر اکرمؐ، ان کے اہلبیتؑ اور

اصحاب وانصار کی قربانیاں رائگاں چلی جائیں۔

واضح رہے کہ فتح مکہ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند پروپگنڈوں کا جو لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔صدیاں گزرتی رہیں لیکن اسلام دشمن طاقتوں کے منصوبوں میں ذرّہ برابر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور وہ اسلام اور مسلمانوں کو نابودی سے ہمکنار کرنے میں ہمہ تن سرگرم رہے۔مسلمانوں کے درمیان دنیا کی دیگر قوموں کو یہ باور کراسکیں کہ اسلام قتل وغارتگری اور خونریزی وانسان کشی کا مذہب ہے؟!

اسلام کے اتنے رنگ وروپ ہیں کہ اصل اسلام کی شناخت ناممکن ہے ! اسلام نے عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم اور انہیں گھر کی چہاردیواری میں مقید کررکھا ہے ! اسلام نے مرد وعورت کو مساوی حقوق فراہم نہیں کئے ! اسلام نے پردہ وحجاب کی پابندی کے ذریعہ عورتوں کی آزادی اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کررکھی ہے! اسلام عورتوں کو تعلیم وترقی حاصل کرنے سے روکتا ہے بلکہ اپنے مرد سالاری نظام کے ذریعہ اسلام عورتوں کی غلامی کی زمین ہموار کرتا ہے۔ اسلامی احکام وشریعت کی پیروی وپابندی ہی مسلمانوں کی پسماندگی اور مفلوک الحالی کا بنیادی سبب ہے۔مجموعی اعتبار سے اسلامی احکام وشریعت میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے عصری تقاضوں کو پورا کرسکے لہٰذا اسلام کو ایک قدیم، روایتی اور دقیانوسی دین ومذہب کی حیثیت سے مسجد کی چہاردیواری کے اندر محدود رہنا چاہئے اور''دورکعت کے امام'' جمعہ وجماعت کو عبادتی امور کے علاوہ مسلمانوں کے دیگر معاملات میں ہرگز مداخلت نہ کرنی چاہئے! دین اور سیاست کے درمیان کسی تال میل کی کوئی گنجائش نہیں لہٰذا مذہبی رہنما کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ سیاسی ، سماجی اور حکومتی معاملات میں اپنے خیالات کے ذریعہ عوام کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرسکے!

اسلام دشمن برطانوی سازش کے تحت مولوی اسلامی معاشرہ میں بدنام اور رسوا کیا جانے لگا اور اسلام کی مقدس کتاب قرآن جو''الناس'' یعنی پوری دنیائے بشریت کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھی وہ عمدہ کاغذ ، دیدزیب طباعت اور بہترین جلد کے ساتھ بیش قیمت ترین غلاف میں گھر کی بلندترین جگہ پر رکھدی گئی اور ملت اسلامیہ اس آسمانی کتاب میں درج ارشادات عالیہ خداوندی سے محروم ہوتی چلی گئی۔ اسلام ماضی کی داستان میں تبدیل ہوگیا جس کا بدترین اور افسوسناک ترین پہلو یہ ہے کہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے ذریعہ اسلام کو پہچانا جانے لگا۔نام نہاد مسلمان حکمرانوں اور جلادصفت

لوگوں کے برے اعمال اور اخلاقی مفاسد کو اسلام سے وابستہ کیا جانے لگا جبکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اسلام ایک آفاقی نظام حیات اور الٰہی اصول و احکام کے مجموعہ کا نام ہے اور ان احکام وقوانین کی پیروی کرنے والوں کو ہی مسلمان کہا جانا چاہیئے اور جو ان اصول واحکام کی پیروی نہیں کرتا وہ عبدالمجید کے گھر جنم لینے والا عبد الحمید تو ہوسکتا ہے لیکن اسلام محمدی کا پیرو اور حقیقی مسلمان ہر گز نہیں ہوسکتا۔

پس امت اسلامیہ عالم کو کبھی عرب وعجم کے نام سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنایا گیا اور کبھی سنی شیعہ اختلافات کی آگ بھڑکا کر کلمہ گو مسلمانوں کی ایک جماعت کو مسلمانوں کی دوسری جماعت کے لوگوں کے خون کا پیاسا بنا دیا گیا اور اس کا سب سے بڑا نقصان سلطنت عثمانیہ کے زوال کی صورت میں رونما ہوا۔ بات صرف اسی حد تک محدود نہیں رہی بلکہ برطانوی سامراج نے، جس کی حکومت میں ان دنوں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، بیسویں صدی کے نصف اوّل کی آخری دہائی میں سرزمین فلسطین پر اسرائیلی صیہونی حکومت قائم کردی اور اس طرح اسلامی علاقوں کے قلب میں اسلام دشمن سرگرمیوں کا لامتناہی دور شروع ہوگیا اور دھیرے دھیرے عالمی سامراج کی قیادت کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھوں میں آگئی اور صیہونی جلادوں کے ذریعہ بے گناہ فلسطینی ولبنانی اور دیگر عرب مسلمانوں کے قتل عام کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل ہوتے رہے اور انسانی حقوق کی حفاظت کے علمبردار خاموش تماشائی بنے کھڑے رہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل صیہونی جارحیت کے خلاف قرار دادیں منظور کرتی رہی لیکن حملہ آور جماعتوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کی دہائیوں میں ملت اسلامیہ عالم عرب وعجم اور سنی وشیعہ اختلافات کی آگ میں جھلستی رہی۔ عرب واسرائیل جنگ کے دوران صیہونی جنگی جہاز عربوں کے خلاف ایرانی تیل وفوجی ٹھکانوں کا بھرپور استعمال کرتے رہے اور اکثر ایرانی عوام اس حقیقت سے یا ناواقف اور یا اس کی طرف سے غیر متوجہ رہے اور جن مذہبی رہنماؤں نے سابقہ شاہی حکومت کی ان خیانتوں کے خلاف آواز اٹھائی انہیں یا قتل یا جلاء وطن کردیا گیا اور جب ۱۰ رمحرم الحرام کو امام خمینیؒ کی قیادت میں ان بدعنوانیوں کے خلاف ہوانے والے احتجاج نے عوامی انقلاب کا روپ اختیار کرلیا تو ایرانی افواج کے ذریعہ توپوں، ٹینکوں اور جنگی ہیلی کاپٹروں کی مدد سے تہران کی سڑکوں پر ایرانی کشتوں کا انبار لگا دیا گیا اور خمینی کو ملک کی سرحدوں سے باہر نکال دیا گیا۔ ۱۰رخرداد کے اس واقعہ

کے بعد اسلام دشمن امریکی سامراج اور ایرانی حکومت نے یہ باور کرلیا کہ خمینی کی یہ انقلابی اور اسلامی تحریک ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی لیکن شہیدوں کا خون رنگ لایا اور ۱۹۷۸ء کے آخری دنوں میں ایران کی اسلامی انقلابی تحریک نے ملک گیر حیثیت اختیار کرلی۔شاہ ایران اور اس کے ہزاروں امریکی مشاورین نے ایران سے راہ فرار اختیار کرلی اور یکم فروری ۱۹۷۹ء کو امام خمینی وطن واپس آگئے اور انہوں نے دس روز کی مختصر سی مدت میں کسی خون خرابہ یا قتل وغارتگری کے بغیر ڈھائی ہزار سالہ شاہی حکومت کو نابود کرتے ہوئے اپنی نوعیت کی پہلی اسلامی جمہوری حکومت قائم کردی اور ایران میں پہلی بار قرآن وحدیث پیغمبر کی بنیاد پر اسلامی جمہوریۂ ایران کے آئین کی تدوین عمل میں آگئی جس کے بموجب عرب وعجم ،سنی وشیعہ اور کردو ترک اختلافات کی گنجائش باقی نہ رہ گئی ۔ اگرچہ اس انقلاب کو شیعہ انقلاب کا نام دیتے ہوئے اس پر آٹھ سالہ طویل المدت جنگ کا بوجھ مسلط کردیا گیا اور داخلی سطح پر خوفناک بم دھاکوں کے ذریعہ ایرانی پارلیامنٹ کو اڑادیا گیا اور فقط دینی رہنماؤں کو ہی نہیں بلکہ ایران کے صدر، وزیراعظم اور ایرانی عدلیہ کے سربراہوں اور پارلیامنٹ کے اراکین اور کابینہ کے وزیروں کو بھی خاک وخون میں غلطاں کردیا گیا اور ملک کی اقتصادی ناکہ بندی کے ذریعہ ایرانی عوام کو نہایت صبر آزما مراحل سے گزرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا لیکن لاشرقیہ ولاغربیہ پر عمل پیرا اسلامی جمہوری حکومت اور کلمۂ ''اللہ اکبر'' پر مکمل اعتقاد رکھنے والے اسلام محمدی کے پیرو ایرانی مسلمانوں نے عالمی سامراج کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے چنانچہ جب جدید عالمی نظام یعنی New World Order کے تحت ایران سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ یاامریکی نظام کے تحت آجاؤ یا امریکی عتاب کو جھیلنے کے لئے آمادہ ہوجاؤ تو ایران نے بیانگ دہل یہ اعلان کیا کہ ہم تو اپنے ''اللہ'' کے ساتھ ہیں اور ہمارا ''اللہ'' ہمارے ساتھ ہے ہم کسی غیر اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں نہایت حیرت انگیز بات یہ ہے کہ نوتشکیل شدہ اسلامی جمہوریہ ایران پر عراقی حکومت کے ذریعہ طویل المدت جنگ مسلط کئے جانے کا جو بنیادی مقصد تھا وہ پورا نہ ہوسکا اور ملت اسلامیہ ایران نے اپنے مثالی صبر وثبات قدم کے ذریعہ ثابت کردیا کہ دنیا کی دونوں بڑی طاقتوں کی خفیہ واعلانیہ حمایت اور عربوں کی بھرپور مالی سرپرستی کے باوجود ایرانیوں کو ان کے آہنی الٰہی ارادوں سے منحرف نہیں کیا جاسکا بلکہ یہ جنگ سامراجی طاقتوں اور ان کے فرمانبرداروں کے لئے عذاب ثابت ہوئی چنانچہ حملہ آور صدام کے عبرتناک زوال کے ساتھ ہی ساتھ ملت عراق آج بھی ''ان

مہلک اسلحوں کی نابودی'' کے بہانے گوناگوں مظالم سے ہمکنار ہے جو ایران وعراق جنگ کے دوران جمع کئے گئے تھے ۔ دوسری طرف ایرانی مسلمانوں کے لئے یہ جنگ ایک بڑی نعمت ثابت ہوئی اور ان میں ایسا شہادت طلب جذبہ پیدا ہوگیا کہ وہ دنیا کی اکلوتی بڑی طاقت کی دھمکیوں سے ایک لحہ کے لئے بھی مرعوب نہیں ہوئے بلکہ امریکی اقتصادی ناکہ بندی کے باوجود گذشتہ تیس سال کے دوران حاصل کی گئی اپنی حیرت انگیز کامیابیوں کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ اسلام میں موجودہ صدی کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے صلاحیت موجود ہے اور امریکی بڑی طاقت کی بھرپور مخالفت اور عدم حمایت کے باوجود کامیابیوں کی بلندی تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے اور کائنات کے جس خالق ومالک کو مسلمان ''اللہ اکبر'' کے نام سے یاد کرتا ہے درحقیقت وہی قادر مطلق ہے اور اسی کی بارگاہ عالیہ میں سرتسلیم خم کردینے کا نام اسلام ہے اور پنجگانہ نماز کے دوران اس کے مقدس گھر کی طرف منہ کرکے نماز ادا کرنے والے ہر مسلمان کی نظر میں کالے یا سفید محلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی کیوں کہ مرضی معبود حاصل کرنا ہی اس کا نصب العین ہے اور اس کی زندگی خدا کے لئے ہے اور اس کو اپنے خالق کی بارگاہ عالیہ کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہے۔

جی ہاں! موجودہ صدی اسلام دشمن پروپگنڈوں کی صدی ہے اور عالمی انسانی برادری کو ظاہری تڑک بھڑک کا دیوانہ بنایا جارہا ہے ۔عورت جس کو خداوند عالم نے انسانی نسل کی بقا وافزائش کا وسیلہ بنا کر بھیجا تھا وہ مٹھی بھر ہوس پرستوں کے ذریعہ عریانیت اور جنسی فساد وبدعنوانیوں کا شکار بنتی چلی جارہی ہے اور اس اسلام محمدیؐ کو دہشت گردی سے وابستہ کیا جارہا ہے جس کے عظیم الشان پیغمبر نے دورجاہلیت میں دہشت گردی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور جس کے نواسے نے کربلا کے میدان میں تلواروں کو گلے لگاکر اسلام کو زندہ جاوید بنادیا۔ اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑنے والو! اور جہاد جیسے مقدس فریضہ کو ہلاکت آمیز حادثات سے وابستہ کرنے والو! ہوش میں آؤ اور محققانہ نظر سے دیکھو تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی کہ اسلام محمدی میں دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اسلام کی اساس ''انسان شناسی'' ہے مرد مسلمان کو انسان شناسی کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد ''خود شناسی''، یعنی خودی کی منزل سے گزرنا ہوتا ہے اور خود شناسی کے بعد ''خدا شناسی'' کا مرحلہ آتا ہے اور حدیث نبوی ''من عرف نفسه فعرف ربّه '' اسی حقیقت کی غماز ہے ۔ اسلام کی مقدس کتاب قرآن کا مخاطب انسان ہے اور مذہب اسلام کے پیغمبر کو عالمین کے لئے رحمت

بنا کر بھیجا گیا ہے ۔ اسلام انسان کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے اور احترام آدمیت کا مبلغ رہا ہے۔ اسلام ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہر انسان کا احترام کرو کیونکہ آدم کی اولاد آدمی روح خداوندی کا حامل ہے اور مولانا جلال الدین رومی نے شاید اسی حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے آج سے ۷۰۰ سال قبل اپنی مندرجہ ذیل بیت میں ، جو سردست ترکی کے انقلابی رہنما کمال عطاترک کی تعویز قبر پر کندہ ہے، اشارہ کیا ہے۔

اسپ همّت سوی اَختر تاختیم
آدمِ مسجود را نشناختیم

(یعنی ہم نے اپنی ہمت کے گھوڑے ستاروں کی طرف تو دوڑا دیئے لیکن ہم نے آدم اور آدم کی اولاد کو نہ پہچانا جس کا سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا)

پس موجودہ اسلام دشمن ماحول اور دہشت گردی پر منحصر عالمی سامراجی ہتھکنڈوں سے مرعوب اور خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسلام محمد ی کا حقیقی تعارف پیش کرنا لازمی ہے کیونکہ آج دنیا حقیقی اسلام کی پیاسی ہے جس میں اسلامی اتحاد کو انسانی اتحاد تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ حقیقی اسلام محمدی کی تبلیغ وحفاظت کی راہ میں آلام ومصائب کا سامنا یقینی ہے چاہے وہ بہ بہانۂ'' آبراہِ هُرمز'' ہو یا'' جوہری بم کی تخلیق وایجاد۔'' یہ الگ بات ہے کہ عالمی ماہرین نے اپنی تحقیقی رپورٹ میں واضح کردیا ہے کہ ایران جوہری بم کی تولید نہیں چاہتا پھر بھی اسلام محمدی کا عملی نمونہ پیش کرنے والے ملک اسلامی جمہوریہ ایران پر وحشیانہ حملات کے بادل آج بھی چھائے ہوئے ہیں تا کہ اسلامی جمہوریت کا ماڈل بننے والا یہ ملک مختلف مسائل سے برسرپیکار رہے اور اسلام محمدؐ کی پیاسی یہ دنیا اسلامی آب حیات سے سیراب نہ ہوسکے۔واضح رہے کہ جس اسلامی جمہوریۂ ایران کو دہشت گردی کی حمایت سے منسوب کیاجارہا ہے وہ درحقیقت دہشت گردی کا مخصوص نشان رہا ہے۔صرف اتنا ہی نہیں کہ موجودہ رہبر آیت اللہ سید علی خامنہ ای اور ایران کے سابق صدر آیت اللہ ہاشمی رفسنجانی کے سینوں پر دہشت گردی کا داغ آج بھی موجود ہے بلکہ شہید رجائی وزیراعظم جواد باہنر نیز شہید بہشتی اور ان کے ۷۲ وفادار ساتھی بھی دہشت گردی کی قربانی بن چکے ہیں۔ عالمی دہشت گردی کا مقصد یہ تھا کہ ایرانی عوام ونظام اسلام سے دستبردار ہوجائے لیکن ایران اپنی راہ پر گامزن ہے کیونکہ یہ راہ ، راہ حق اور حقیقی راہ اسلام ہے اور موجودہ دنیا اسلام محمدیؐ کی پیاسی ہے

اسلامی عبادات اور الٰہی ارشادات میں مضمر بشر دوستی اور انسان سازی کے پہلوؤں کے نمایاں ہوتے ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی گھٹائیں خود بخود چھنٹ جائیں گی۔

کتابوں کا تعارف

نام کتاب	:	خیر المجالس
جامع	:	مولانا حمید قلندر
ناشر	:	شعبۂ تاریخ ،مسلم یونیورسٹی ،علی گڑھ
مقدمہ وتصحیح	:	پروفیسر خلیق احمد نظامی
مبصر	:	پروفیسر شریف حسین قاسمی

ہندوستان میں لکھا جانے والا سب سے پہلا ملفوظ ،حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء 'فوائد الفواد' ہے۔ اس کے بعد مختلف عرفاء کے ملفوظات مرتب کیے گئے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنے مرید خاص، امیر حسن سنجری دہلوی، کو اپنے ملفوظات جمع کرنے کی اجازت دی تھی۔ آپ ہی کی روایت کی پیروی میں آپ کے خلیفۂ ارشد شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے اپنے مرید، مولانا حمید قلندر، کو اجازت دی کہ وہ بھی ان کے ملفوظات جمع کرسکتے ہیں۔ حمید قلندر نے خیر المجالس کے نام سے یہ ملفوظات جمع کیے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو ہندوستان میں اوائل دور کے عظیم عرفاء میں آخری عظیم المرتبت صوفی شیخ سمجھا جاتا ہے۔ آپ اودھ میں ۶۷۶/ ۷۷-۱۲۷۶ ہجری میں یا اس کے آس پاس پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ یحیٰ پشمینہ کے ایک کامیاب اور ثروتمند تاجر تھے۔ ان کے بہت سے غلام تھے، اور آپ عیش وعشرت سے رہتے تھے۔ یہ خاندان اصلاً خراسان کا تھا، جہاں سے چراغ دہلی کے دادا عبد اللطیف یزدی لاہور آگئے تھے۔ شیخ بھی لاہور میں پیدا ہوئے اور بعد میں اودھ آگئے۔ یہ حضرت امام حسینؑ کی اولاد میں سے تھے۔

چراغ دہلی ابھی صرف نو برس کے تھے کہ ان کے والد شیخ یحیٰ کا انتقال ہوگیا۔ پھر ان کی نیک دل والدہ نے ان کی پرورش کی اور ان کو تعلیم دلائی۔ چراغ دہلی کے اساتذہ میں عبد الکریم شیروانی کا نام بھی لیا گیا ہے۔ قاضی محی الدّین کاشانی نے انہیں بزدوی مکمل کرائی۔ مولانا افتخار الدین محمد گیلانی اور مولانا شمس الدین یحیٰ بھی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ ظاہری تعلیم حاصل کرنے کے بعد شیخ نصیر الدین نے روحانی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ برسوں اودھ کے جنگلوں میں پھرتے رہے

اورعبادت وریاضت میں مصروف رہے۔ اکثر سنبھالو کے پتوں سے روزہ کھولتے تھے۔

آپ تینتالیس برس کے تھے کہ ایک روحانی رہبر کی آرزو نے انہیں بے چین کردیا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کی شہرت نے غالبًا انہیں دہلی کی دعوت دی، تو آپ دہلی پہونچے۔ حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچان لیا اور اپنی سرپرستی میں قبول کرلیا۔ اور بالآخر انہیں اپنی خلافت سے بھی نوازا۔ آپ کوحضرت محبوب الٰہی نے ۲۰رذی الحجہ ۷۲۴ر ۱۳۲۳ کو اپنا خلافت نامہ عطا کیا۔ محبوب الٰہی نے اپنے انتقال سے پہلے وہ تمام تبرکات جوانہیں ان کے مرشد بابا فرید نے عطا کئے تھے، شیخ نصیر الدین کے سپرد کردئے۔

حضرت محبوب الٰہی کی رحلت کے بعد شیخ نصیر الدین نے دہلی میں اپنے سلسلے کے لئے تقریباً تیس برس کام کیا۔ اسی دوران محمد بن تغلق سے ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ محمد بن تغلق نے دہلی کی آبادی کو دولت آباد منتقل ہونے کا حکم دیا، بے شمار لوگ چلے گئے، لیکن شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے اپنے وجود کی روشنی سے اس شہر کو محروم نہیں کیا۔ وہ اسی شہر میں رہے۔ محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ سے بہر حال چراغ دہلی کے تعلقات خوشگوار رہے۔ چراغ دہلی اپنے سلسلے کی تعلیمات اور رشدو ہدایت کی روشنی پھیلانے کے بعد ۱۸ر رمضان ۷۵۷ر ۱۳۵۶ کو واصل بہ حق ہوئے اور اس طرح چشتی دبستان تصوف کا ایک پروقار اور عظیم ستون گر گیا۔ امیر خورد نے سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ آخری عمر میں ''روح مجرّد'' ہوگئے تھے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی شہرت صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔ مکہ کے امام عبد اللہ یافعی اور مولانا عبد اللہ فطری نے جب ان کی وفات کی خبر سنی تو جلال الدین بخاری سے کہا کہ '' آج ہندوستان کا قطب چل بسا۔''

اسی عظیم عارف وعالم کے ملفوظات کا نام خیر المجالس ہے، جس کے جامع مولانا محمد قلندر ہیں۔ ان کے والد مولانا تاج الدین تھے، جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔

حمید قلندر شیخ نصیر الدین کی مجالس میں اکثر حاضر ہوتے۔ انہوں نے چراغ دہلی کے ملفوظات مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔ خود شیخ نصیر الدین ان کے تحریر پر نظر ثانی کرتے تھے۔ ایک جز مکمل ہوجاتا، تو حمید قلندر اُسے شیخ نصیر الدین کو پیش کردیتے، وہ اسے پڑھتے اور اس کی توثیق کرتے۔

حمید قلندر نے خیر المجالس اسی انداز میں مرتب کی ہے، جو فوائد الفواد میں حسن سنجری دہلوی

نے اختیار کیا ہے۔ خیر المجالس میں سومجالس ہیں اور ایک ضمیمہ جس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے احوال زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

خیر المجالس کی چند مجالس میں درج ذیل امور بیان کیے گئے ہیں:

عرس مولانا برہان الدین غریب، ملفوظ ناتمام مولانا برہان الدین، ذکر قیامت، کیفیت شیخ نصیر الدین محمود، در آمدن دانشمندی، حکایت عبد اللہ صاحب، جزائے عمل، خواب کہ عورتی بحضرت عائشہ بیان کرد، تقوی وحق تقوی، تفسیر آیہ: ''فاتقوا اللّٰہ ماستطعتم'' حضور در نماز، حکایت خواجہ مجدود آدم پدر خواجہ سنائی -حب مال وحب جاہ، احتراز از محبت دنیا، حکایت شیخ جلال الدین تبریزی، خفتن بعد نماز اشراق، شیخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوسعید اقطع۔

خیر المجالس میں بہت سے ایسے امور بحث میں آئے ہیں جو فوائد الفواد میں بھی نظر آتے ہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر کی اسرار التوحید بھی چراغ دہلی کے مآخذ میں شامل ہے۔ احیاء العلوم، کشف المحجوب اور عوارف المعارف وہ دیگر بنیادی کتابیں جن کے اثرات ہمیں خیر المجالس میں نظر آتے ہیں۔

خیر المجالس کے مطالب سے جو علمی وعرفانی تصویر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ چراغ دہلی ایک اعلیٰ پایہ کے عالم دین تھے۔ معارف اسلامی پر ان کی گہری نظر تھی اور اسی طرح عرفان وسلوک کے میدان میں بھی وہ ایک صاحب نظر بزرگ تھے۔ ان کی تعلیمات میں شریعت پر بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے۔

حضرت چراغ دہلی بھی اپنے مرشد کی طرح گفتگو کے دوران اپنے خیالات ونظریات کی تائید وتوثیق میں شعراء کے کلام سے استفادہ کرتے تھے۔ خیر المجالس میں متعدد اشعار کی پیوند کاری نظر آتی ہے۔ جو اطلاعات چراغ دہلی نے قدیم علماء ومشائخ کے بارے میں فراہم کی ہیں، ان کی بڑی علمی اور ادبی حیثیت ہے۔ ایک مجلس میں آپ نے فرمایا کہ امیر خسرو اور امیر حسن نے بہت کوشش کی کہ وہ سعدی کے انداز میں شعر کہیں، لیکن یہ انہیں میسر نہیں آیا۔ وجہ یہ تھی کہ سعدی نے جو کچھ کہا ہے ''سرحال'' کہا ہے۔

اسی طرح آپ نے ایک بار خاقانی، نظامی اور سنائی کے بارے میں ایک دلچسپ نکتہ بیان فرمایا کہ خاقانی اور نظامی صالح اشخاص تھے، لیکن خواجہ سنائی (از مقطعان) نے دنیا سے تعلق توڑ لیا تھا۔ انہوں نے دنیا واہل دنیا سے خود کو منقطع کر لیا تھا۔

اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے لیکن نہایت جامع جملے ہمیں بعض صوفیاء، شعراء ،علماء کی زندگی اور ان کے کارناموں کے بارے میں خیر المجالس میں نظر آتے ہیں۔ یہ جملے ایک طرف تو یہ اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے کہنے والے نے ان حضرات کی زندگی اور کارناموں کا نظر غایر سے مطالعہ کیا تھا اور دوسری طرف شیخ نصیر الدین کے صحیح نتیجہ نکالنے کے ملکہ کا ثبوت ہیں۔

اکثر مطالب ومشمولات میں فوائد الفواداور خیر المجالس ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت چراغ دہلی نے اپنے مرشد سے سب سے زیادہ کسب فیض کیا ہے اور اس کا ثبوت وہ مطالب ہیں جو دونوں کے ملفوظات میں مشترک ہیں۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے قرآن حکیم اور احادیث پیغمبر اسلامؐ بھی اپنی گفتگو کے دوران کثرت سے نقل کی ہیں اور ان کی تفسیر اور افہام وتفہیم پر اظہار خیال کیا ہے۔خود یہ حصہ تفسیر قرآن سے وابستگی رکھنے والوں کے لئے دلچسپی اور رہنمائی کا باعث ہوسکتا ہے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ شیخ نصیر الدین کے ان ملفوظات میں شیخ ابوسعید ابو الخیر کا ذکر بہت کثرت سے ملتا ہے ۔ ان کی زندگی اور تعلیمات سے متعلق بے شمار اشارے خیر المجالس میں نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چراغ دہلی نے اس ایرانی عارف کی زندگی اور تعلیمات پرغوروفکر زیادہ کیا تھا۔ ان کی اسرار التوحید ان کے پاس تھی،جس کا وہ اکثر مطالعہ کرتے رہتے تھے اور اسی وجہ سے اس کے مطالب آپ کے زبان زد تھے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے خیر المجالس کا فارسی متن سلیقے سے مرتب کیا ہے اور اس پر انگریزی میں مقدمہ لکھا ہے، جس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی زندگی اور ان کے کارناموں سے سیر حاصل تاریخی نوعیت کی بحث کی ہے۔

خیر المجالس کا ایک بار اردو میں ترجمہ بھی ہوا تھا۔ یہ ترجمہ مولوی احمد علی ٹونکی نے ۱۳۱۶ر ۱۸۹۸ میں ''سراج المجالس'' کے نام سے کیا تھا، اور مولانا غلام احمد برہانی نے اسے دہلی سے شائع کردیا تھا۔ اب وہ ترجمہ آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ اسی طرح خیرالمجالس کے خطی نسخے بھی بس دو ایک ہی ملتے ہیں۔ اس کا ایک مکمل خطی نسخہ آصفیہ لائبریری ،حیدرآباد، میں محفوظ ہے اور اس کے علاوہ اس کے ناقص نسخے امروہہ میں ایک شخصی کتب خانے میں، دوسرا نامکمل مولانا آزاد لائبریری ،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ، میں موجود ہے۔

اسم کتاب : فوائد الفواد
جامع : خواجہ امیر حسن علا سنجری دہلوی
مترجم وناشر : خواجہ حسن ثانی نظامی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

'فوائد الفواد' ہندوستان کے معروف اور محترم چشتی صوفی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس کے جامع ومرتب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید خاص خواجہ امیر حسن سنجری دہلوی ہیں، جنہیں سعدی شیرازی کی پرسوز غزلیات کی پیروی کی وجہ سے سعدیٔ ہند کہا جاتا ہے۔ فوائد الفواد کو چشتی سلسلۂ تصوف میں بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اسی وجہ سے اسے اس سلسلے کا لائحہ عمل کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرف تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی نہایت گہرے مذہبی فہم اور تصوف سے متعلق ان کے تجرباتی اور مشاہداتی عمل کا نچوڑ ہے، تو دوسری طرف یہ کتاب اسکے جامع خواجہ امیر حسن علا سنجری کی مذہبی، علمی وعرفانی میدانوں میں متجسسانہ طبیعت کی غمازی ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نہ صرف چشتی سلسلے میں، بلکہ تمام دوسرے صوفی سلسلوں میں بھی ایک خاص امتیاز کے حامل ہیں۔ آپ ہندوستان میں چشتی سلسلے کے چوتھے بزرگ صوفی ہیں۔ سب سے پہلے خواجہ معین الدین چشتی ، دوسرے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی اور تیسرے حضرت بابا فرید الدین گنج شکر ہیں، جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے پیرو مرشد تھے۔ فوائد الفواد کے مطالعے سے، نیز حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، جنہیں محبوب الٰہی بھی کہا جاتا ہے، سے متعلق دوسری معاصر وبعد کی روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی ذات گرامی ہندوستان کی روحانی اور تہذیبی تاریخ میں ایک ایسی جامع شخصیت ہے کہ ایسی دلاویز ہستیاں بشریت میں خال خال ہی پیدا ہوئی ہیں۔'' آپ ایک صوفی با صفا ہی نہیں تھے، جس نے تصوف اسلامی کی تمام خوبیوں کو اپنی سیرت کے آئینے میں دکھایا، بلکہ ایک نکتہ رس فقیہ، محدث ، مفسر، محقق اور ادبیات عربی وفارسی کے متبحر عالم ، شاعر اور تاریخ وسیر پر گہری نظر رکھنے والے نہایت وسیع المطالعہ اور باخبر انسان تھے۔''

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء عام روایت کے مطابق بروز بدھ ، ۲۴ صفر ۶۳۶ مطابق ۴/اکتوبر ۱۲۳۸ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بدایوں میں اپنی زندگی کے بارے میں خود محبوب الٰہی نے خاصی تفصیل سے اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ سولہ برس کے تھے کہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دہلی آئے ۔ والدہ ، بہن اور ان کے دو بچے ہمراہ تھے ۔ پھر غالباً وہ

بدایوں نہ جاسکے اور دہلی ہی کے ہو رہے۔ اسے دہلی کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے۔ دہلی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کو حضرت بابا فرید کی خدمت میں اجودھن جانے کی نعمت نصیب ہوئی۔ آپ حضرت بابا کے مرید ہوگئے اور پھر ۶۶۹ھ میں حضرت بابا نے آپ کو اپنی خلافت سے نوازا۔

فوائد الفواد کے جامع امیر حسن علا سنجری ایک دنیا دار آدمی تھے ۔ یہ بدایوں میں ۱۲۵۴ میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر دہلی آگئے اور اسی بغداد ہند میں تعلیم حاصل کی ۔ ابتدا ہی سے نہایت حساس ذہن اور لطیف مذاق پایا تھا۔ فارسی اور عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ تیرہ سال کے تھے کہ شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ امیر خسرو کے دوستوں میں تھے۔ یہ دونوں بلبن کے لڑکے اور ولی عہد شہزادہ محمد خان سے وابستہ رہے۔ امیر خسرو، مصحف دار امیر حسن، اس کے دوات دار تھے۔ شہزادہ محمد خان ملتان کا گورنر تھا۔ یہ شہزادہ منگول لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے ۳۰ ذی الحجہ ۶۸۳ھ/ ۸ مارچ ۱۲۸۵ کو شہید ہوگیا۔ اس کی شہادت کے بعد حسن سنجری بے روزگار ہوگئے اور پھر یہ فرصت کے دن ان کے لئے لوٹ کر نہیں آتے لیکن ایک اور دولت سے نوازے گئے اور وہ تھی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے ان کی رفاقت اور مریدی۔ حضرت نظام الدین سے امیر حسن کا بامعنی اور نتیجہ خیز رابطہ اس وقت ہوا جب حسن کی عمر ۵۵ سال تھی امیر حسن نے دنیا داری سے توبہ کرلی اور خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خود بقول حسن :

ای حسن توبہ آن گہی کردی کہ ترا طاقت گناہ نماند

(حسن تم نے تو توبہ اس وقت کی جب تم میں گناہ کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی)

خواجہ نظام الدین اولیاء نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ انہیں اپنی گفتگو قلمبند کرنے کی اجازت دی۔ یہ سعادت معمولی نہ تھی۔ مزید برآں حسن سنجری جو کچھ قلمبند کرتے تھے، حضرت خواجہ صاحب اس پر نظر ڈالتے تھے ۔ اور بعض مقامات پر حسن سنجری کچھ الفاظ اس لیے لکھنے سے چھوڑ دیتے تھے کہ تصدیق کے بعد لکھیں گے۔ ایسے مقامات پر درکار الفاظ خواجہ صاحب تحریر فرمادیتے تھے ۔ خواجہ حسن سنجری نے یہ بھی التزام کیا ہے کہ جس قدر مقدور ہو، خود حضرت محبوب الٰہی کے الفاظ کو ضبط تحریر میں لائیں، یعنی فوائد الفواد کے الفاظ وعبارات حضرت محبوب الٰہی کے ہیں، ہاں قلم حسن سنجری دہلوی کا ہے، جنہوں نے انہیں صفحۂ قرطاس پر پیش کرنے کا اور شرف پایا۔

حسن دہلوی نے خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو ۳ شعبان ۷۰۷ھ/ ۲۸ جنوری

۱۳۰۸ء میں قلمبند کرنا شروع کیا اور اس کام کو ۲۰ شعبان ۷۲۲ھ تک انجام دیتے رہے۔اس طرح انہوں نے تقریباً پندرہ سال کے دوران حضرت محبوب الٰہی کی بعض مجالس کی گزارش روداد جمع اورمرتب کی اور اپنی اس کوشش کونہایت مناسب اورحسب حال نام دیا،فوائد الفواد جو پانچ جلدوں میں منقسم ہے اور ہر جلد مجلسوں میں تقسیم ہے۔ اس طرح فوائد الفواد میں کل ۱۸۸ مجلسیں ہیں۔ ان میں بعض طویل ہیں اور بعض بہت مختصر۔ اکثر دو مجلسوں کے درمیان زمانی فصل بھی بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر جلد اول کی ابتدائی مجلسیں عموماً جمعہ کے دن کی ہیں۔ آگے چل کر یہ فاصلہ بڑھتا گیا ہے۔کہیں دو مجلسوں کے درمیان کئی ماہ کا فاصلہ ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ امیر حسن جب دہلی میں ہوتے تھے،تو پابندی سے حضرت محبوب الٰہی کی مجالس میں حاضر ہوتے تھے اور ان میں ہونے والی گفتگو کوقلمبند کرلیا کرتے تھے۔لیکن جب اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے دہلی سے باہر چلے جاتے تھے تو مجالس میں شرکت کی سعادت سے محروم رہتے تھے۔ اس وجہ سے مجالس میں زمانی فاصلہ نظر آتا ہے۔ بہرحال ۱۵ سال کے دوران منعقد ہونے والی مجالس کا حال فوائد الفواد میں بیان کیا گیا ہے۔

فوائد الفواد کی بعض امتیازی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔صحت زبان،صحت روایت،حسن اسلوب: چوں کہ ایک زبردست شاعر نے یہ ملفوظات جمع کیے ہیں، اس لیے اس کی نثر میں حسب حال استعارہ کی پیوند کاری کی گئی ہے، جس کی وجہ سے اس کی نثر کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔

۲۔فوائد الفواد ہندوستان میں مرتب ہونے والا کسی صوفی کا سب سے پہلا ملفوظ ہے جو بعد کے بے شمار ملفوظات کے لئے نمونہ قرار پایا۔ اور یہ اس سلسلے میں ایسا بابرکت ثابت ہوا کہ تقریباً ہرسلسلے کے بعض مشائخ کے ملفوظات جمع کیے گئے اور اس طرح فارسی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس معنی میں خود لفظ ملفوظ فارسی زبان وادب کو ہندوستان کی دین ہے۔

۳۔امیر حسن نے حتی الوسع یہ اہتمام کیا ہے کہ جو لفظ حضرت خواجہ کی زبان مبارک سے وہ سنیں اسے اسی طرح برقرار رکھیں، جیسا کہ پہلے رکھا جاچکا ہے۔ اگر حسن دہلوی سے کوئی لفظ چھوٹ جاتا تھا تو وہ مسودے میں جگہ خالی چھوڑ دیتے تھے اور جب حضرت خواجہ صاحب ان اوراق پر نظر ڈالتے تھے تو خالی جگہوں کو پر کردیتے تھے۔ یہ امتیاز کسی دوسرے ملفوظ کو حاصل نہیں۔

۴۔فوائد الفواد کے مطالب میں جو علوم اور موضوعات موجزن ہیں وہ یہ ہیں:

تفسیر قرآن ، حدیث پیغمبر اسلامؐ ، فقہ اسلامی، اصول فقہ، تاریخ خاص طور پر اسلامی تاریخ ، سیرت ، سیرت اولیاء ،ملفوظات مشائخ ،تصوّف کے نظری اور عملی امور، اعمال ، عبادات ، آداب المریدین، آداب الصوفیہ ، تزکیۂ نفس، اخلاقیات ، صوفیہ کی اصطلاحات ، فلسفہ ،منطق، آداب معاشرت،تعبیر رویا، حکایات مشائخ ، اصول عقائد، ادب وشعر، سماع، لغت اور فقہ الغۃ ، وعظ وتذکیر، تمثیلات ، لطائف، احوال مشائخ ، مشاہیر شعراء وادباء وغیرہ۔

فوائد الفواد ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ اوراس کونقل کیا گیا۔ اس وجہ سے اس کی بعض روایات میں معمولی لفظی اختلافات راہ پاگئے ،لیکن شمالی ہندوستان میں پچھلے سات سو برسوں میں اتنے سیاسی انقلابات آئے کہ اب ہمیں فوائد الفواد کا کوئی بہت قدیم خطی نسخہ نہیں ملتا ، جو نسخے ملتے ہیں ان میں بیشتر عہد محمد شاہ کے بعد کے ہیں۔

بعض قدیم کتابوں میں فوائد الفواد سے جو مطالعہ نقل ہوئے ہیں، وہ ہمیں مطبوعہ فوائد الفواد میں نظر نہیں آتے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ فوائد الفواد کی قدیم اور موجودہ روایات میں مطالب وموضوعات کا اختلاف بھی پایاجاتا ہے۔

فوائدالفواد پچھلے برسوں میں کئی بار شائع ہوئی ہے، اسی طرح ا سکے متعدد باراردو اور انگریزی میں تراجم بھی کیے گئے ہیں۔فوائد الفواد کا متن کم از کم دوبار ایران سے بھی شائع ہوا ہے۔

جناب خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے چند سال پہلے اس کا متن اپنے اردو ترجمے کے ساتھ نہایت معیاری انداز سے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ فوائد الفواد کے پہلے ترجموں سے کچھ مختلف ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پہلے مترجم حضرات نے فوائد الفواد کے متن پر غور نہیں کیا تھا جو اشتباہات اس کے متن میں در آئی تھیں، انہیں اسی طرح ترجمے میں داخل کردیا۔خواجہ صاحب نے متن پر غور کیا اور صحیح الفاظ وعبارات کا تعین کیا اور پھر انکا ترجمہ کیا ہے۔

درحقیقت کتاب اگر اس اہمیت کی ہوجیسی فوائد الفواد ہے کہ اس میں شریعت وطریقت کے مسائل اور اسرار ودقائق کونہایت دلنشین اور موثر پیرایئے میں بیان کیا گیا ہے اور یہ چشتی نظامی سلسلے سے وابستہ لاکھوں طالبان حق کا دستور العمل ہو،تو کسی دوسری زبان میں اس کے ترجمے کا معاملہ اور بھی نازک ہوجاتا ہے۔ یہاں مترجم کے لئے صرف فارسی زبان سے واقف ہونا اور اردو زبان واظہار پر قادر ہونا ہی کافی نہیں، بلکہ تصوف اسلامی کی نظری اور عملی واقفیت رکھنا بھی ضروری ہے، اور شریعت

اسلامیہ سے باخبر ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ خود ایک باعمل اور صاحب نسبت وصاحب سلسلہ بھی ہو تو اس کتاب کے مطالب نظامی الحمد للہ ان خصوصیات کے حامل ہیں اور اس کا ثبوت فوائد الفواد کا وہ اردو ترجمہ ہے جسکا حوالہ درج بالا سطروں میں دیا گیا ہے۔

ادبی لطائف گذشتہ شمارہ کے حوالے صفحہ ۱۷۰ سے ملاحظہ فرمائیں:

یہ مثالیں ایسی ہیں جو اتفاقاً نظر پڑ گئیں ۔تلاش کی جائے تو اس قسم کی غلطیاں کم وبیش ان تمام ملفوظات، تذکروں اور اصول تصوف کی کتب میں ملیں گی جو مقابلتاً زیادہ معتبر سمجھیں جاتی ہیں۔ اور یہی مرحوم مولانا صباح عبدالرحمٰن کے محولہ بالا مقالہ کا اصل سبق کہا جاسکتا ہے کہ کسی ملفوظاتی ماٰخذ کو مستند نہیں فرض کر لینا چاہئے اور قدیم چشتی مفلوظ کی طرح دیگر ملفوظات کو بھی تنقید کی خوردبین کے نیچے رکھ کر جانچنا ضروری ہے۔

راہ اسلام کا حوالہ گذشتہ شمارہ کا باقی

حوالہ جات

۱۔مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قصص القرآن، ناشر۔ محمد سعید اینڈ سنز کراچی، سال ندارد(طبع چہارم)۔ ج ا،ص۹، ۵۰۔ج ۲،ص۷۸، ۸۱، ۱۵۶۔۱۵۷

ALso see Fazlur Rahman, Islam,London,, 1966,p.133

'' صوفیانہ لطائف'' اور'' اسرائیلیات'' کے نکتہ اتصال کی ایک اچھی مثال حضرت داؤد علیہ السلام اور ادریہ کی داستان کا ذکر ہے جو سید محمد گیسودراز کے ملفوظات '' جوامع الکلم'' میں دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو'' جوامع الکلم'' مرتبہ سید محمد اکبر حسینی ۔مخطوطہ برٹش میوزیم ۔شمارہ ۲۵۲ورق ۱۲۶، الف وب۔

۲۔ ابو القاسم رسالہ قشیریہ ترجمہ فارسی با تصحیحات بدیع الزمان فروز انفر، تہران۔ ۱۳۴۵ شمسی ۱۹۶۷، ص ۴. ۴۔ ۴۰۵۔ اردو ترجمہ اسلام آباد ۱۹۸۴ء (مترجم ڈاکٹر پیر حسن)قدرے مختلف ہے۔ اس مضمون میں قشیریہ کا اردو ترجمہ دیتے وقت فارسی ترجمہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور بیشتر اسی پر انحصار کیا گیا ہے۔

۳۔ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی)ص ۳۵۹۔۳۶۰

۴۔''سیری محمد'' مولفہ محمد علی سایانی مخطوطہ فارسی نیشنل میوزیم کراچی ۔شمارہ ۲۶۷۔۱۹۷۰ء ۔ این ۔ ایم ورق ۲۷ الف
۵۔''جوامع الکلم'' (ملفوظات سید گیسودراز) مرتبہ سید محمد اکبر حسینی ۔مخطو طہ فارسی ، برٹش میوزیم ۔شمارہ or ۲۵۲ورق ۲۰۰ الف و ب ۔
۶۔ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۲۶۳۔ ۳۶۴
۷۔خواجہ عبد اللہ انصاری'' طبقات الصوفیہ'' تصحیح حبیبی کابل ۱۳۴۱ ش ۔ص ۳۷۔
۸۔غزالی ۔ احیاء العلوم (اردو ترجمہ) جلد چہارم مکتبہ رحمانیہ لاہور۔سال ندارد۔ص ۳۵۴۔
۹۔شیخ شہاب الدین سہروردی ۔عوارف المعارف، اردو ترجمہ۔مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۷ء۔ ص ۴۰۰
۱۰۔ Muhammad Saleem Akhtar (Editor). Kalimat al- Sadiqin of Muhammad Sadiq Dihlavi, Lahore. 1988. Editor's Introduction, pp. 83-85.
۱۱۔شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۔''اخبار الاخیار'' مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء۔ص ۲۷
۱۲۔الہ دیا چشتی۔ سیر الاقطاب ۔مطبع نول کشور لکھنؤ۔۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء۔ص ۱۸۹
۱۳۔سید صباح الدین عبد الرحمٰن ۔'' بزم صوفیہ'' طبع سوم ۔اعظم گڑھ ۱۹۷۹ء، ص ۲۸۵۔۲۸۶
۱۴۔ترجمہ رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۶۷۲۔
۱۵۔ شیخ ابو نصر سراج'' کتاب اللمع فی التصوب'' اردو ترجمہ از سید اسرار بخاری۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن۔لاہور ۱۹۸۴۔ص ۵۲۱۔
۱۶۔حمید قلندر۔''خیر المجالس'' باتصحیح خلیق احمد نظامی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۹ء۔ص ۲۵۷۔
۱۷۔ Simon Digby, 'Qalandars and Related Groups (in the ...Delhi Sultanate of the Thirteenth and Fourteeth Centuries) in Islam in Asia. The Harry S. Truman institute for the Advancement of Peace,1984,vol. 1, p.81.
۱۸۔(الف) غزالی۔'' کیمیائی سعادت'' تہران، خرداد ۱۳۶۴ھ۔ص ۶۰۰۔

۱۹۔ ''خیر المجالس'' ص ۲۰۲

۲۰۔ Khaliq Ahmad nizami, The Life and Times of Shaikh Farid-uddin Ganj-I-Shakar, Aligarh, 1955,pp-5152

۲۱۔ ''خیر المجالس'' ص ۲۰۳۔۲۰۲

۲۲۔ ''فوائد الفوائد'' مرتبہ خواجہ حسن دہلوی، باتصحیح محمد لطیف ملک لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۷۸۔۷۹۔

۲۳۔ ترجمہ ''رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۵۶۸۔۵۶۹۔

۲۴۔ ''فوائد الفواد'' ص ۲۴۶

۲۵۔ محمد غوثی شطاری مانڈوی ۔ اذکار ابرار اردو ترجمہ ''گلزار ابرار ۔اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور۔ ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء، ص ۱۵۵۔۱۵۷

۲۶۔ ملاحظہ ہو'' جہانگیر نامہ'' (توزک جہانگیری) بہ کوشش محمد ہاشم ۔بنیاد فرہنگ ایران ۱۳۵۹ شمسی۔ص ۹۸۔ یہ واقعہ ۱۲ محرم ۱۰۱۹ھ مطابق ۲۷ مارچ ۱۶۱۰ء کو رونما ہوا

۲۷۔ ابو عبد الرحمٰن سلمی، ملامتیان وصوفیان وجواں مرداں (ترجمہ فارسی) تصحیح دکتر ابوالعلا عففیی ۔ کابل ۱۳۴۴ھ۔ص ۵۷

۲۸۔ ''سراج الہدایہ'' (ملفوظات حسین جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت) مرتبہ قاضی سجاد حسین، نئی دہلی ۱۹۸۳ء۔ پیش لفظ ص ۱۲۔ ۱۳۔

۲۹۔ ترجمہ ''رسالہ قشیریہ'' (فارسی) ص ۱۸۷۔۱۸۸

۳۰۔ ترجمہ '' رسالہ قشیرہ'' (فارسی) ص ۱۴۷

۳۱۔ سید محمد بن مبارک علوی کرمانی معروف بہ'' میر خورد''۔'' سیر الاولیاء'' مؤسسہ انتشارات اسلامی، لاہور۔ص ۱۴۵۔

۳۲۔ ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی ،تصحیح سید احمد خان۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ ۱۸۶۲ء۔ص ۳۶۶

۳۳۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار وفی اسرار الابرار'' مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۴۷ ص ۵۸

۳۴۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ۔ بزم صوفیہ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۷۹ء مضمون محولہ

کتاب کے ضمیمہ میں صفحات ۶۳۱ پر دیا گیا ہے۔

۳۵۔Muhammad Habib, 'Chishti Mystic Record of the Sultanate Period', in Politics and Society during the Early Medieval Period, being the collected works of Professor Muhammad Habib,vol.1, Edited by prof. k.A. Nizami, New Delhi, 1974. The article referred to occurs on pp. 385-433. it appeared originally in Medieval India Quarterly, Aligarh vol. 1, No. 2, October 1950.

۳۶.Ali b. 'Uthman al-Hujwiri, Kashf-al-Mahjub, tr R.A. Nichoison, Islamic Book Foundation, Lahore, 1976. pp. 258-59

۳۷۔ ''خیر المجالس''، ص ۲۰۰۔۲۰۱

۳۸۔ ''جوامع الکلم'' نسخہ برٹش میوزیم۔ ورق ۳۲۔ الف وب

۳۹۔ پروفیسر محمد اسلم ''الدر المنظوم کی تاریخی' مذہبی اور سماجی اہمیت'' اقبال ریویو، جولائی ۱۹۸۴، صفحہ ۱۳۴، بحوالہ الدر المنظوم، ملتان ۱۳۷۷ھ۔ ص ۱۳۳۔

(بشکریہ فکر ونظر، اسلام آباد)

اخبار وجهان اسلام:

خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران

نئی دهلی کی جانب سے

قرأت اور مسابقۂ قرأت قرآن کریم کا اہتمام

سالہائے گذشتہ کی طرح امسال بھی پیغمبر عظیم الشان حضرت محمد مصطفیٰؐ کی سالگرہ ولادت کے مبارک موقع پر خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران اور دار العلوم دیوبند میں القرآن فاؤنڈیشن کے باہمی اشتراک سے ۱۳ و ۱۴ رمارچ ۲۰۰۹ء کو شہر دیوبند میں دسواں کل ہند مسابقۂ حفظ وقرأت قرآن کریم کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ۱۵۰ قاری حضرات نے شرکت فرمائی۔ محترم قاری حضرات کے علاوہ اسلامی جمہوری اسلامی ایران کے ثقافتی کاؤنسلر جناب ڈاکٹر کریم نجفی ، ثقافتی مشیر قاسم مرادی صاحب اور عالمی شہرت یافتہ ایرانی قاری جناب محمد کاظم نداف اور قاری محمد رضا حق شناس کے علاوہ دار العلوم سے وابستہ دیگر نمایاں شخصیتوں نے بھی اس مسابقے کے افتتاحی اجلاس میں شرکت فرمائی جس میں تقریباً آٹھ ہزار سے زیادہ عاشقان کلام الٰہی نے شرکت فرمائی۔

افتتاحیہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر کریم نجفی نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دار العلوم دیوبند کی عظمت وفضیلت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ گذشتہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے اس مدرسہ سے وابستہ اور اس گہوارۂ علم سے تربیت یافتہ علماء صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں ہمہ تن مصروف وسرگرم عمل ہیں۔ انہوں نے ملک کی آزادی سے متعلق کہا کہ بانیان دار العلوم دیوبند کا جنگ آزادی ہند میں تاریخی کردار رہا ہے۔اس ملک کی آزادی کے لئے علماء دار العلوم دیوبند کی جو خدمات ہیں ان کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔انہوں نے ایران کے انقلاب سے متعلق کہا کہ امام خمینیؒ کے کارناموں سے دنیا بخوبی واقف ہے۔ دوران انقلاب امام خمینیؒ نے برائے وحدت اسلامی جو

خدمات انجام دی ہیں وہ نا قابل فراموش ہیں۔ ایران میں اس وقت جو تعلیمی کام انجام دئے جارہے ہیں وہ سب امام خمینیؒ کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔اس موقع پر صدر القرآن فاؤنڈیشن جناب مولانا ندیم الواجدی صاحب نے ڈاکٹر کریم نجفی کا استقبال کیا اورانہیں سپاس نامہ بھی پیش کیا۔

دو روزہ مسابقہ میں ہندوستانی جج کے علاوہ عالمی شہرت یافتہ قاری جناب محمد کاظم نداف نے بھی بحیثیت جج شرکت کی جبکہ قاری محمد رضا حق شناس نے مظاہرۂ قرأت میں شرکت فرمائی۔ افتتاحیہ جلسہ کی صدارت دار العلوم وقف دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا خورشید عالم قاسمی نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر نجفی نے دار العلوم کا دورہ بھی کیا نیز اساتذہ وطلبا سے تبادلۂ خیال کیا۔

اس کے علاوہ ایرانی قراء کرام نے ۱۶/ مارچ کو ضلع بجنور کے شہر شیرکوٹ کے مظاہرۂ قرأت میں شرکت کرکے اپنی دلنشیں آواز سے سامعین کو محظوظ کیا۔

عید میلاد النبیؐ کی مناسبت سے تشریف لائے ایرانی ممتاز قراء کرام نے دہلی کے مختلف مدارس اور مساجد میں بھی تلاوت کی اور بعض مدارس کے طلبہ واساتذہ کو فن تجوید کے قواعد وضوابط پر بھی لیکچر دیا نیز فن تجوید سے متعلق چند نکات پر اساتذہ سے تبادلۂ خیال کیا۔

مدرسہ اشرف القرآن کے زیر اہتمام ایک خاص نشست میں ایرانی قراء کرام کو اہم اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ جس کی صدارت علاقہ سیلم پور کے ممبر اسمبلی جناب چودھری متین احمد نے کی اور انہیں کے دست مبارک سے ایرانی قراء کو قرآنی خدمات سے متعلق مولانا رحمت اللہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔جبکہ ان قراء کرام نے جامع مسجد فتح پوری،مدرسہ زینت القرآن سیلم پور، عیدگاہ سیلم پور جلسہ سیرت النبیؐ، جامع مسجد خوریجی مشرقی دہلی، مدرسہ دار العلوم اسعدیہ جھارکھنڈی قبرستان، انجمن اتحاد منزل پہاڑی بھوجلہ دہلی، غازی آباد لونی اور جامعہ اہل بیت اوکھلا میں بھی تلاوت قرآن سے طلبہ کو فیضیاب کیا۔

فصلنامہ راہ اسلام شمارہ ماہ جولائی تا ستمبر شمارہ ۲۰۰۸ء کے بعض مقالات میں ایڈیٹنگ و اِملے کی غلطیاں رہ گئی ہیں جس کو محترم قارئین درج ذیل اصلاح کے ساتھ پڑھیں۔

صفحات	غلط	صحیح
۱۴	اسی حالت میں	ایسی حالت میں
۱۴	دنیا کی صفائی	دنیا سے صفائی
۲۶	تمام عابدات	تمام عبادات
۲۶	یہی اسی وقت	یہ کام اسی وقت
۲۶	احسان یہ ہے	احسن یہ ہے
۲۷	تصوف کا نام ہے	تصوف نام ہے
۲۷	حق وباطن	حق وباطل
۲۷	زندگی است	زندگی عصمت
۲۷	حسین مرقوع	حسین مرقع
۲۸	آپ کا شمار	حضرت علی کا شمار
۲۸	شریف رسید	شریف رضی
۲۸	شرف مصاربرت	شرف مصاحبت
۲۹	وراع	ورع
۲۹	پھوٹتے تھے	پھوٹتے اور
۲۹	سن کا امیر معاویہ	سنکر امیر معاویہ
۳۰	دنیا ترک کیا	دنیا ترک کی
۳۰	اس نے عبرت	جس نے عبرت
۳۱	ارکان اصی	ارکان اصلی
۳۱	بقول حضرت علیؑ	بقول حضرت علی ؑ: کیا جب موت کا فرشتہ ملک الموت کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو تم اس کا احساس کرتے ہو؟ یا جب وہ کسی کی روح قبض کرلیتا ہے۔
۳۱	بعض اعضا کے	بعض اعضا پر
۳۱	حکام بھی ہے	حاکم بھی ہے
۳۱	مالدار ہوا وہ ہے	مالدار ہوا وہی
۳۲	جبکہ بعد ضروری ہے	جبکہ ضروری پہلو یہ ہے

۳۳	نہ مری	نہ مرو
۳۴	جذبات تشکر	کلمات تشکر
۳۴	حالانکہ کوئی بیمار	حالانکہ کوئی بیماری
۳۵	چھپا تھا	چھپانہ تھا
۳۵	تبلیغ وہ اشاعت	تبلیغ واشاعت
۳۵	اعمال مواخذہ	اعمال کے مواخذہ
۳۵	حدود وغیرہ محدود	محدود وغیرہ محدود
۳۶	نیت کا پیکر تھے	نیت کا پیکر تھی
۴۰	وسط ایشیائے	وسط ایشیائی
۴۲	شخچو ن	شبخون
۴۶	جنگ سوار	خنگ سوار
۴۸	Direet	Direct
۴۸	اپنے کلام	اپنے غلام
۴۸	بڑے عہدے	بڑے سے بڑے عہدے
۴۸	امرا وزرا	امراء و وزرا
۵۲	حوالہ ۲۲	Through inscriptions
۷۸	جلوہ دیکھا	جلوہ دکھا
۷۸	سرووقد	سروقد
۷۹	فضا وقدر	قضا وقدر
۷۹	اک	ایک
۸۰	یہ خیال کے تصوف	یہ خیال کہ تصوف
۸۰	گڈرا	گدڑا
۸۰	جوڑے	جڑے
۸۱	صوفی کے طرہ	صوفی کے لئے طرہ
۸۱	پشمیہ گڈری	پشمیہ گدڑی
۸۱	الفقرالفخری	الفقرفخری
۸۱	تصوف درخسان	درخشاں تصوف
۸۱	لواحقین نیظلم	لواحقین نے ظلم
۸۱	مردان	مرد

۸۱	اکرام کے لالچ	اکرام کی لالچ
۸۲	مرشد رشا آبا	مرشد
۸۲	ریاض السلام	ریاض الاسلام
۸۷	پیغام دیا کے	پیغام دیا کہ
۸۷	حقیقی اسلام تصوف	حقیقی اسلام
۸۷	انقلاب کے بانی ہوئی	انقلاب کا سبب بن گئی
۸۷	مستقر الخلافہ	مستقر اور دار الخلافہ
۸۷	خاموش سماجی فکر	خاموش اور
۸۸	بدایونی	بدایوں
۸۸	سجادہ نعلین	سجادہ اور نعلین
۸۸	سہردی	سہروردی
۸۹	صبرو رضا کے	صبرو رضا کے ساتھ
۸۹	بینارہ	منارہ
۸۹	چشتیہ سلسلہ کی	چشتیہ سلسلہ کے
۸۹	خواجہ اجمیری کہ قطب	خواجہ اجمیری، قطب
۸۹	Centrel	Central
۸۹	اولیاء کے درگاہوں	اولیاء کی درگاہوں
۹۰	بندرہویں	پندرہویں
۹۰	گوکے	گوکہ
۹۰	اجل	تین اجل
۹۱	کوآخیر باد کیا	کوآخر خیر باد کہا
۹۳	سیر ہوکھا	سیر ہوکر کھا
۹۴	زیاور	زور
۹۵	مقالہ سے	کے بزرگوں
۹۵	جاگیر عطیات	جاگیرداروں نے عطیات
۹۵	بزرگوں	بزرگوں کی حیثیت سے
۹۶	طور پر طریقوں	طورطریقوں
۹۶	وہا	رہا
۱۱۲	جس منزل وہ فضل وکمال	جس منزل فضل وکمال

۱۱۳	اقوال الذکر	اول الذکر
۱۱۴	تفصلی	تفصیلی
۱۱۴	نحرمایہ	سرمایہ
۱۱۵	جذی	جزو
۱۲۷	ارشاد او ہدایت	ارشاد وہدایت
۱۲۸	اماں	اما
۱۳۳	باہم	یاہم
۱۴۱	Jung	Yung
۱۴۲	نشانیوں	نشانیاں
۱۴۷	نہیں قید کیا	انہیں قید کیا
۱۵۶	مان لیاجائیں	مان لیاجائے
۱۷۲	وماخلت....	وماخلقت
۱۷۲	مرتضوی	مرتضویہ
۱۷۵	ہرصاحب قد	ہرصاحب قدر
۱۷۶	کبردربار وحسد کینہ	کبروریاوحسد وکینہ
۱۸۴	خانقای	خانقاہ
۱۸۵	اس علم کہا	اس علم کو کہا
۱۸۷	دنیاوی	دنیوی
۲۲۴	اس کے جس کا	اس کا
۲۴۸	سب زیادہ	سب سے زیادہ
۲۴۸	علماء سے کے	علماء کے
۲۴۹	شیخ کلیم اللہ جہانی	شیخ کلیم اللہ جہان
۲۵۰	علمی وتحقیق	علمی وتحقیقی
۲۵۰	فوری بعد	فوراً بعد
۲۵۱	محبوب الٰہی ان کا	محبوب الٰہی نے ان کا
۲۵۱	کی تعلیم	ان کی تعلیم